آثارِ سرسیدؒ

ضیاء الدین لاہوری

متصل مسجد پائیلٹ ہائی سکول، وحدت روڈ، لاہور۔ فون : ۰۴۲_۵۴۲۷۹۰۱_۲

Asaar-i-Sir Syed
By
Zia-ud-din Lahori
ISBN: 978-969-8793-65-4

ضابطہ

نام کتاب	آثارِ سرسید
تالیف	ضیاءالدین لاہوری
ناشر	محمد ریاض درانی
اشاعت اوّل	۲۰۰۷ء
کمپوزنگ	جمعیت کمپوزنگ سنٹر، وحدت روڈ لاہور
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس' لاہور
قیمت	150/- روپے

باہتمام	محمد بلال درانی
قانونی مشیر	سید طارق ہمدانی (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

ترتیب

بابِ دوم: تضادات و تحریفات

بابِ سوم: سرسید کے ساتھ چند انٹرویوز

باب چہارم: عنواں میرے، باقی اُن کا (بلا تبصرہ)

حوالہ جاتی عبارتوں سے چیدہ چیدہ عبارتوں کے عکس

باب دوم: تضادات وتحریفات

باب سوم: سرسید کے ساتھ چند انٹرویوز

باب چہارم: عنواں میرے، باقی اُن کا (بلا تبصرہ)

حوالہ جاتی عبارتوں سے چیدہ چیدہ عبارتوں کے عکس

ایک مصوّر کا تصوّر

سرسید اپنے افکار و کردار کے آئینے میں

اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیا منسیا کردیں، ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے ، یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم دن رات ہمارے دست مال ہوں ، ہمارے دماغ یوروپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں .... ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اس کو اپنا محسن و مربی سمجھیں۔

(مقالات سرسید، حصہ ۱۵، صفحہ ٦٦)

اگر میری قسمت میں ہو کہ میں وائسرائے ہو جاؤں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ نہایت مضبوط وائسرائے کے طور پر ملکہ معظمہ کی حکومت ہندوستان میں قائم رکھوں۔ (مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، ص ۳۲۸)

ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ ازلی (دائمی) ہونی چاہئے۔ (ایڈریس اور اسپیچیں متعلقہ ایم اے او کالج، ص ۷۵)

سرسید احمد خاں ایک کارٹونسٹ کی نظر میں

(بہ شکریہ نقوش طنز و مزاح نمبر)

عرضِ ناشر

سرسید کے بارے میں ایک مدت سے چند خاص قسم کی باتوں کا وِرد ہو رہا تھا۔ یہ باتیں سن سن کر ادب و تاریخ کے قاری کے کان پک گئے تھے۔ سرسید کی اپنی تحریروں کو لائبریریوں کے تنگ گوشوں میں چھپا دیا گیا۔ ''حیات جاوید'' بھی لائبریریوں کی زینت تھی۔ عام قاری سرسید کے ہزاروں صفحات کو کیسے کھنگالتا، حیات جاوید کی ضخامت میں کیسے حقائق تلاش کرتا؟ سرسید کے بارے میں لکھنے والوں نے چند افسانے تراش لیے اور پھر یہ افسانے ایسے بکے بنے کہ ان میں معنویت نہ ہونے کے باوجود یہ سکہ رائج الوقت ہو گئے۔

ضیاء الدین لاہوری عجیب صبر صمیم کے حامل شخص ہیں کہ ایک عمر سرسید کے مطالعے میں بسر کر دی۔ صفحہ صفحہ اور لفظ لفظ چھان مارا۔ وہ حقائق سامنے آئے کہ نصابی یا نیم نصابی کتابوں کے دعوے افسانے محسوس ہوئے۔ آپ نے سرسید کو انہی کے لفظوں میں پیش کرنے کی ٹھان لی۔ نتیجتاً ''سرسید کی کہانی اُن کی اپنی زبانی''، ''خودنوشت حیات سرسید''، ''خودنوشت افکار سرسید'' اور ''نقش سرسید'' مرتب ہو کر سامنے آ گئیں۔ اس دوران میں آپ کی بہت سے لوگوں سے فکری و علمی محاذ پر قلمی معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ آپ نے سرسید کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور مختلف حوالوں سے سمجھا۔ ہر تفہیم کے نتیجے میں ایک نیا باب کھلا۔ ہر نیا باب اُردو کی داستانوں کا ساتواں باب تھا۔ یہ کتاب ''آثارِ سرسید'' انہی ابواب کی شیرازہ بندی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں ایک بار پھر یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ ہم اس کتاب کو بھی شائع کر کے علم کی خدمت کا ایک اور فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب حق بینی و حق شناسی کے سلسلے کی ایک روشن کڑی ثابت ہو گی۔ اللہ رب العزت ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور قارئین کے لیے نافع بنائے۔

والسلام

محمد ریاض درانی

سرسید احمد خاں ایک کارٹونسٹ کی نظر میں

(بہ شکریہ نقوش طنز و مزاح نمبر)

عرضِ ناشر

سرسیّد کے بارے میں ایک مدت سے چند خاص قسم کی باتوں کا وردہو رہا تھا۔ یہ باتیں سن سن کر ادب و تاریخ کے قاری کے کان پک گئے تھے۔ سرسیّد کی اپنی تحریروں کو لائبریریوں کے تنگ گوشوں میں چھپا دیا گیا۔ ''حیات جاوید'' بھی لائبریریوں کی زینت تھی۔ عام قاری سرسیّد کے ہزاروں صفحات کو کیسے کھنگالتا، حیات جاوید کی ضخامت میں کیسے حقائق تلاش کرتا؟ سرسید کے بارے میں لکھنے والوں نے چند افسانے تراش لیے اور پھر یہ افسانے ایسے بکے ہے کہ ان میں معنویت نہ ہونے کے باوجود یہ سکہ رائج الوقت ہو گئے۔

ضیاءالدین لاہوری عجیب صبرِ صمیم کے حامل شخص ہیں کہ ایک عمر سرسیّد کے مطالعے میں بسر کر دی۔ صفحہ صفحہ اور لفظ لفظ چھان مارا۔ وہ حقائق سامنے آئے کہ نصابی یا نیم نصابی کتابوں کے دعوے افسانے محسوس ہوئے۔ آپ نے سرسیّد کو انہی کے لفظوں میں پیش کرنے کی ٹھان لی۔ نتیجتاً ''سرسید کی کہانی اُن کی اپنی زبانی''، ''خودنوشت حیات سرسیّد''، ''خودنوشت افکار سرسیّد'' اور ''نقشِ سرسیّد'' مرتب ہو کر سامنے آ گئیں۔ اس دوران میں آپ کی بہت سے لوگوں سے فکری و علمی محاذ پر قلمی معرکہ آرائی بھی ہوئی۔ آپ نے سرسیّد کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور مختلف حوالوں سے سمجھا۔ ہر تفہیم کے نتیجے میں ایک نیا باب کھلا۔ ہر نیا باب اُردو کی داستانوں کا ساتواں باب تھا۔ یہ کتاب ''آثارِ سرسیّد'' انہی ابواب کی شیرازہ بندی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں ایک بار پھر یہ فخر حاصل ہو رہا ہے کہ ہم اس کتاب کو بھی شائع کر کے علم کی خدمت کا ایک اور فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب حق بینی و حق شناسی کے سلسلے کی ایک روشن کڑی ثابت ہو گی۔ اللہ رب العزت ہماری اس کاوش کو قبول فرمائے اور قارئین کے لیے نافع بنائے۔

والسلام

محمد ریاض درانی

عرضِ احوال

''نقشِ سرسید'' کے ''عرضِ احوال'' میں تحریر کر چکا ہوں کہ ''سرسید'' کا موضوع میری تحقیق کا محور کیسے بنا۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم و تحقیق میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے ایک استادِ محترم کے لیکچر کے دوران اس کی بنیاد پڑی۔ اسے تحریر میں لانے کا آغاز اسی سال ایک اخباری مراسلے کی صورت میں یوں کیا:

''سرسید احمد خاں کو اردو کا بہت بڑا محسن خیال کیا جاتا ہے اور تعلیم کے معاملے میں ان کی خدمات کو بے حد سراہا جاتا ہے۔ واقعی وہ اپنی تحریر میں منفرد حیثیت کے مالک تھے لیکن اردو ذریعہ تعلیم کے بارے میں ان کا نظریہ عام آدمی کی فہم سے بالا ہے۔ ذیل میں ان کے ۱۸۵۹ء کے لکھے ہوئے پمفلٹ کے چند حصے ملاحظہ ہوں:''

''سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے، وہ تربیت کے لئے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہلِ ہند کا ہے۔ اردو زبان جس کے وسیلے سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو، کیونکہ جس زبان میں ہم کسی قوم کی تعلیم کا ارادہ رکھتے ہیں اس زبان کی نسبت ہم کو اوّل یہ دیکھنا چاہیے کہ اس میں علمی کتابیں کافی موجود ہیں یا نہیں، کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو تعلیم ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ زبان فی نفسہٖ اس قابل ہے یا نہیں کہ اس

میں علمی کتابیں تصنیف ہو سکیں، کیونکہ پہلی بات کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر دوسری بات لاعلاج ہے۔ تیسرے یہ کہ آیا وہ ایسی زبان ہے یا نہیں کہ اس میں علوم پڑھنے سے جودتِ طبع، حدتِ ذہن، سلامتِ فکر، ملکۂ عالی، قوتِ ناطقہ، پختگی تقریر اور ترتیبِ دلائل کا سلیقہ پیدا ہو سکے؟ ان تینوں باتوں میں سے اردو زبان میں کوئی بات نہیں۔ پس گورنمنٹ پر واجب ہے کہ اس طریقۂ تعلیم کو، جو درحقیقت تربیت انسان کو خراب کرنے والا اور خود بخود لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے والا ہے، بالکل بدل دے اور اس زبان میں تربیت جاری کرے، جس سے تربیت کا جو اصلی نتیجہ ہے، وہ حاصل ہو۔''

''میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور سکول جاری رکھے تو بلا شبہ یہ بدگمانی، جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے۔ صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے، اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ ہر قسم کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔''

''یہ حوالہ سرسید کے کسی مخالف کا نہیں بلکہ ان کے سب سے بڑے معتقد مولانا حالی کی کتاب ''حیاتِ جاوید'' (حصہ اول) کے صفحہ ۸۵۔۸۶ پر درج ہے۔ مندرجہ بالا پمفلٹ کے اندازِ تحریر سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ اردو زبان اس وقت ذریعۂ تعلیم بننے کے قابل تھی یا نہیں...... سرسید کی تحریر کا عالمانہ اندازِ مقصد تحریر کے برعکس اردو زبان کی بلند حیثیت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے......''

(نوائے وقت لاہور۔ ۲۳ مئی را ۲ مئی ۱۹۶۵ء)

پھر جب ''خود نوشت سرسید'' کی تدوین کا کام زوروں پر تھا تو ۱۹۷۸ء میں بذریعہ اخبارات قارئین سے اس موضوع پر مواد مہیا کرنے کی یوں اپیل کی:

''میں سرسید احمد خاں کی زندگی اور ان کے افکار و نظریات پر تحقیق کر رہا ہوں اور ابتدائی طور پر ان کی تحریروں، تقریروں، خطوط اور معروف شخصیتوں سے گفتگو

ں مستند روایات کے اقتباسات کی مدد سے ان کی خودنوشت مرتب کر رہا ہوں۔
یہ کام تکمیل کے تقریباً آخری مراحل میں ہے لیکن چند حوالوں کی تصدیق کے لئے
ان کے اصل ماٰخذ مطلوب ہیں۔ اس تحقیق کے نتائج سے بعض ایسے تاریک
گوشے بے نقاب ہونے کی توقع ہے جو ہماری قومی زندگی پر براہِ راست
اثرانداز ہوتے ہیں، اس لئے میں صرف حقیقی ماٰخذ اور انتہائی مستند حوالوں سے
استفادہ کر رہا ہوں۔ میں علم دوست اصحاب سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ان
کے پاس اس موضوع پر کوئی خاص حوالہ جات ہوں یعنی سرسید کی تصانیف،
تقاریر، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور دیگر سوسائٹیوں کی رپورٹوں وغیرہ کی صورت
میں ان کے خیالات یا بعض قدیم کتابچے اور رسائل ہوں جو اس سلسلہ میں
کارآمد ہو سکیں تو از راہِ کرم اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے نکال کر مجھے ضرور
مطلع فرمائیں۔ مذکورہ اشیا، قیمتاً یا عاریتاً مل سکیں یا ان کے مطالعہ کی اجازت مل
سکے، میں ہر صورت میں ان کا شکرگزار ہوں گا۔ کسی ایک اہم فقرہ کی تصدیق کے
لئے میں طویل سفر کو بھی تیار ہوں۔'' (مشرق لاہور۔۲۰ مارچ ۱۹۷۸ء)

کام تکمیل کے قریب پہنچنے کے باوجود خوب سے خوب تر کی تلاش میں مزید ۱۵ سال گزر گئے اور
بالآخر اس منصوبے کا پہلا حصہ ''خودنوشت حیاتِ سرسید'' کی صورت میں پہلی مرتبہ ۱۹۹۳ء میں
شائع ہوا۔

ہمارے نصابِ تعلیم اور ذرائع نشر و اشاعت نے سرسید کی شخصیت اور ان کی قومی اور
ملی خدمات کا کچھ ایسا مسحورکن تاثر قائم کر رکھا ہے کہ ہر شخص ان کا والہ و شیدا دکھائی دیتا ہے اور
انہیں ہر لحاظ سے کامل اور انسانی کمزوریوں سے مبرا جانتا ہے۔ یہ کیفیت ان افراد کے لئے
مسائل پیدا کرتی ہے جو تحقیق کے شعبہ سے وابستہ ہیں کیونکہ ان کی رسائی کچھ ایسے دستاویزی
حقائق تک ہو جاتی ہے جنہیں عقیدت مند حلقہ تسلیم کرنا تو ایک طرف رہا، سننا تک بھی گوارا نہیں
کرتا بلکہ اس کے جذباتی لٹھ باز پوشیدہ حقائق کی نقاب کشائی کرنے والوں کے پیچھے پڑ جاتے
ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بہت سے تحقیق کنندگان خاموش رہنے میں ہی اپنی عافیت

جانتے ہیں یا پھر اشاروں کنایوں میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروفیسر کریم الدین احمد اس قسم کی کیفیت کی تشریح یوں کرتے ہیں:

''میں نے سرسید کی اپنی تحریر ہی سے اس کے خلاف شہادتیں جمع کی ہیں۔ ہماری سوسائٹی بڑی حد تک تنگ نظر سوسائٹی ہے، وہ تنقید برداشت نہیں کرتی۔ ہم اہل قلم پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ سچی باتیں کہنے سے گریز کرتے ہیں لیکن سچی باتیں کہنے پر جو سزا اُن کو ملتی ہے، اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اصل میں ہمارے ہر فرد کا رویہ اب تک بڑی حد تک ''شاہی'' ہے۔ جمہوری اصولوں کے مطابق وہ دوسروں کے حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے فنکار اشاروں کنایوں میں بات کہنے پر مجبور ہوئے۔ شاعری میں یہ اشارے کنایے چل جاتے ہیں لیکن نثر میں صاف صاف باتیں کرنی ہوتی ہیں، اسی لئے ہماری نثر نے اب تک کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ ہمارا رویہ بڑی حد تک شاہی اور وجدانی ہے۔ عقل اور دلائل نے ہمارے یہاں جگہ نہیں پائی ہے، اور مسلم معاشرے کی سست رفتار ترقی کی بھی یہی وجہ ہے۔ اپنی تحریر میں بھی میں یہ کمزوری محسوس کرتا ہوں کہ میں باتیں کھل کر کہنا چاہتا ہوں مگر کہہ نہیں پاتا۔ اصل میں سوسائٹی کا دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا کسی بڑے ذہن ہی کا کام ہے۔''

(تنقیدی تحریریں، ص ۱۱-۱۲)

سرسید کے مدح خوانوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ تضاد خیالی کا شکار ہیں کیونکہ عام حالات میں وہ جن افکار کا پرچار کرتے ہیں، جب ان خیالات کے برعکس سرسید کے اقوال و افعال پیش کئے جائیں تو وہ ان کی حمایت میں جواز ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنی تحریروں میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بڑے وثوق کے ساتھ ''جنگِ آزادی'' قرار دیتے ہیں لیکن اس دوران کے سرسید کے عوام دشمن کردار کا ذکر کیا جائے تو خودساختہ استدلالات کے دفاتر کھول کر اسے ''تقاضائے وقت'' کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور پھر اسے سرسید کے خلوص اور نیک نیتی کا مظہر تا کر وقت کا بہترین فیصلہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس

موضوع پر پروفیسر سلیم اختر تحریر کرتے ہیں:

''ہماری تنقید میں ایک بڑی غلط اور گمراہ کن اصطلاح ''خلوص'' کی ہے۔ادیب کا خلوص ایک ایسی سونٹھ کی گانٹھ بن چکا ہے جس سے ہر طرح کی کوتاہیوں اور فکری دیوالیہ پن پر پردہ ڈالا جاتا ہے، جس: نتیجہ اور کچھ نکلے یا نہ نکلے، اتنا یقیناً ہوتا ہے کہ بعض اوقات خود نقاد کا اپنی تنقید سے عدم خلوص آشکارا ہو جاتا ہے۔...
اب اگر خلوص کا تجزیہ کریں تو اس کے بھی دو پہلو نکلیں گے: خلوص اپنے خیالات اور نظریات کے پرچار میں اور خلوص دوسروں کی مخالفت میں (ویسے اس مخالفت کی اساس بھی ایک لحاظ سے اپنے ہی خیالات پر استوار ہوتی ہے)... خلوص تنقید کی وہ دودھاری تلوار بن جاتا ہے جس سے بیک وقت گردن زدنی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور دفاع کا بھی، لیکن خالی خولی خلوص بے معنی، بے کار اور بعض اوقات تو گمراہ کن بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ کسی تحریک یا نظریہ کے اجرا کرنے والے اور پھر اس کی مخالفت کرنے والے کے اثرات کو محض خلوص کے پیمانہ سے نہیں ناپا جاسکتا بلکہ اس مقصد کے لئے تاریخی، ملی، معاشرتی شعور کیساتھ ساتھ حال کے بے لاگ تجزیہ اور مستقبل کے تقاضوں کا اعلیٰ ادراک بھی ضروری ہے۔

(نگار کراچی، اکبرالٰہ آبادی نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۳)

''خلوص و نیک نیتی'' کو جواز بنا کر کس کس کو نہیں بچایا جاسکتا؟ اس سے تو میر جعفر اور میر صادق جیسے غداران وطن کی کارگزاریوں کو بھی اس بنا پر جائز قرار دیا جاسکتا ہے کہ اُس دور میں مسلمان متعدد وجوہ کی بنا پر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اس لئے انہوں نے مفاہمت کے جذبے کے ساتھ اقتدار میں شرکت کی تاکہ اپنی قوم کو حکمرانوں کے غیظ و غضب کا شکار بننے سے بچایا جائے۔ یہ ایک طریق کار ہے جس سے قوم فروشوں کے قوم دشمن اقدامات کو بھی ''خلوص و نیک نیتی'' کی اصطلاح کی آڑ میں قومی وملی خدمات کا درجہ دے دیا جاتا ہے حالانکہ ان صفات کا تعلق انسان کے دل سے ہے، اور دلوں کا

جانتے ہیں یا پھر اشاروں کنایوں میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پروفیسر کریم الدین احمد اس قسم کی کیفیت کی تشریح یوں کرتے ہیں:

''میں نے سرسید کی اپنی تحریر ہی سے اس کے خلاف شہادتیں جمع کی ہیں۔ ہماری سوسائٹی بڑی حد تک تنگ نظر سوسائٹی ہے، وہ تنقید برداشت نہیں کرتی۔ ہم اہل قلم پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ سچی باتیں کہنے سے گریز کرتے ہیں لیکن سچی باتیں کہنے پر جو سزا اُن کو ملتی ہے، اس کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اصل میں ہمارے ہر فرد کا رویہ اب تک بڑی حد تک ''شاہی'' ہے۔ جمہوری اصولوں کے مطابق وہ دوسروں کے حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے فنکار اشاروں کنایوں میں بات کہنے پر مجبور ہوئے۔ شاعری میں یہ اشارے کنایے چل جاتے ہیں لیکن نثر میں صاف صاف باتیں کرنی ہوتی ہیں، اسی لئے ہماری نثر نے اب تک کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ ہمارا رویہ بڑی حد تک شاہی اور وجدانی ہے۔ عقل اور ولائل نے ہمارے یہاں جگہ نہیں پائی ہے، اور مسلم معاشرے کی سست رفتار ترقی کی بھی یہی وجہ ہے۔ اپنی تحریر میں بھی میں یہ کمزوری محسوس کرتا ہوں کہ میں باتیں کھل کر کہنا چاہتا ہوں مگر کہہ نہیں پاتا۔ اصل میں سوسائٹی کا دباؤ اتنا زیادہ ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا کسی بڑے ذہن ہی کا کام ہے۔''

(تنقیدی تحریریں، ص ۱۱-۱۲)

سرسید کے مدح خوانوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ تضاد خیالی کا شکار ہیں کیونکہ عام حالات میں وہ جن افکار کا پرچار کرتے ہیں، جب ان خیالات کے برعکس سرسید کے اقوال و افعال پیش کئے جائیں تو وہ ان کی حمایت میں جواز ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنی تحریروں میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بڑے وثوق کے ساتھ ''جنگِ آزادی'' قرار دیتے ہیں لیکن اس دوران کے سرسید کے عوام دشمن کردار کا ذکر کیا جائے تو خود ساختہ استدلالات کے دفاتر کھول کر اسے ''تقاضائے وقت'' کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور پھر اسے سرسید کے خلوص اور نیک نیتی کا مظہر بتا کر وقت کا بہترین فیصلہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس

موضوع پروفیسر سلیم اختر تحریر کرتے ہیں:

''ہماری تنقید میں ایک بڑی غلط اور گمراہ کن اصطلاح ''خلوص'' کی ہے۔ ادیب کا خلوص ایک ایسی سونٹھ کی گانٹھ بن چکا ہے جس سے ہر طرح کی کوتاہیوں اور فکری دیوالیہ پن پر پردہ ڈالا جاتا ہے، جس: نتیجہ اور کچھ نکلے یا نہ نکلے، اتنا یقیناً ہوتا ہے کہ بعض اوقات خود نقاد کا اپنی تنقید سے عدم خلوص آشکارا ہو جاتا ہے .....
اب اگر خلوص کا تجزیہ کریں تو اس کے بھی دو پہلو نکلیں گے: خلوص اپنے خیالات اور نظریات کے پرچار میں اور خلوص دوسروں کی مخالفت میں (ویسے اس مخالفت کی اساس بھی ایک لحاظ سے اپنے ہی خیالات پر استوار ہوتی ہے)..... خلوص تنقید کی وہ دودھاری تلوار بن جاتا ہے جس سے بیک وقت گردن زدنی کا کام بھی لیا جاسکتا ہے اور دفاع کا بھی، لیکن خالی خولی خلوص بے معنی، بے کار اور بعض اوقات تو گمراہ کن بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ کسی تحریک یا نظریہ کے اجرا کرنے والے اور پھر اس کی مخالفت کرنے والے کے اثرات کو محض خلوص کے پیمانہ سے نہیں ناپا جاسکتا بلکہ اس مقصد کے لئے تاریخی، ملی، معاشرتی شعور کیساتھ ساتھ حال کے بے لاگ تجزیہ اور مستقبل کے تقاضوں کا اعلیٰ ادراک بھی ضروری ہے۔
(نگار کراچی، اکبرالہ آبادی نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۴)

''خلوص و نیک نیتی'' کو جواز بنا کر کس کس کو نہیں بچایا جاسکتا؟ اس سے تو میر جعفر اور میر صادق جیسے غداران وطن کی کارگزاریوں کو بھی اس بنا پر جائز قرار دیا جاسکتا ہے کہ اُس دور میں مسلمان متعدد وجوہ کی بنا پر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اس لئے انہوں نے مفاہمت کے جذبے کے ساتھ اقتدار میں شرکت کی تاکہ اپنی قوم کو حکمرانوں کے غیظ و غضب کا شکار بننے سے بچایا جائے۔ یہ ایک طریق کار ہے جس سے قوم فروشوں کے قوم دشمن اقدامات کو بھی ''خلوص و نیک نیتی'' کی اصطلاح کی آڑ میں قومی وطنی خدمات کا درجہ دے دیا جاتا ہے حالانکہ ان صفات کا تعلق انسان کے دل سے ہے، اور دلوں کا

حال اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔''خلوص و نیک نیتی'' کی اسناد کے تقسیم کار دوسروں کو محض کم
کرتے ہیں۔

راقم سرسید کی ''خودنوشت'' کی تدوین و ترتیب کے دوران اور بعد میں بھی ا
موضوع کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر میں مصروف رہا اور ان کے نتائج کو موقر علمی جرائد
ذریعے قارئین کی خدمت میں پیش کرتا رہا۔ اس سلسلے کے چند مضامین ''نقشِ سرسید''
صورت میں طبع ہو چکے ہیں۔ راقم اپنے کام میں مگن رہا اور معترضین اپنے اعتراض قائم کر
رہے جن کے جوابات بروقت اخبارات و جرائد میں دیتا رہا۔ زیرِ نظر کتاب میں ان تما
مباحث کو ان کی اشاعت کی زمانی ترتیب کے مطابق جمع کیا گیا ہے۔ دوسرے باب م
بڑے نامی و معزز قلمکاروں کی سرسید سے متعلق تحریروں میں تضادات اور تحریفات کی نشاندہی
گئی ہے۔ باب سوم میں ''سرسید کے ساتھ چند انٹرویوز'' ترتیب دئے گئے ہیں جو سرسید
اقوال و کردار کا ایک مختصر اور جامع خاکہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ سرسید کی شخصیت کو بہ
طور پر سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گے۔ باب چہارم میں متعدد عنوانات کے تحت ایسے چھو
چھوٹے نکات بلا تبصرہ ترتیب دئے گئے ہیں جو راقم اپنے مطالعۂ سرسید کے دوران نہایت ا
سمجھ کر الگ نوٹ کرتا رہا تھا۔ یہ نکات سوچ کے کئی رخ متعین کرتے ہیں۔ قارئین کو واضح ہو
کتاب میں شامل مضامین، جو وقتاً فوقتاً اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے، بعد از اں جب ا
سے متعلق مزید شواہد اور حقائق دستیاب ہوئے، کوشش کی گئی ہے کہ وہ بھی ان میں موزو
مقامات پر کھپا دئے جائیں۔ جہاں بعض مختلف مباحث میں یکساں قسم کے نکات پر بحث کر
ہوئے ان کے دلائل میں تکرار کی کیفیت پائی گئی، اس بنیاد پر حذف کر دئے گئے کہ وہ کسی نہ کسی
مضمون میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود بعض مباحث میں ایسی کیفیت کا محسوس کیا جانا مجبور
ہے کہ خاص مقامات پر ان دلائل کو قائم رکھے بغیر بات مکمل نہیں ہو پاتی۔

ایک سوال مجھ سے عام طور پر کیا جاتا ہے اور جو ایک عام شخص کے دل میں سرسید
کے بارے میں اصل حقائق سے آگاہ نہ ہونے کے باعث پیدا ہوتا ہے، یہ ہے کہ میں اک

تصویر کے منفی پہلوؤں ہی کو کیوں اجاگر کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں بلکہ اوروں کے ساتھ بھی ہے، ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ پروفیسر کریم الدین احمد کی مبینہ ''کمزوری کا اعتراف'' آپ سطور بالا میں جان چکے، کچھ ایسی ہی کیفیت کے ضمن میں بزرگ شاعر اساتذہ کے بارے میں ڈاکٹر شادانی کی کتاب پر ڈاکٹر محمد معزالدین کے تبصرہ سے درج ذیل چند سطور پیش خدمت ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ سرسید سے متعلق تصویر کا خاص پہلو دکھانے کے الزام کے بارے میں میری کیفیت کو بھی ترجمانی کرتی ہیں:

''... ڈاکٹر شادانی...... کسی کی تنقیص یا تضحیک نہیں چاہتے بلکہ اساتذہ یا بزرگوں کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ان کی کمزوریوں سے خود بھی بچنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی ان کی اندھی تقلید سے روکنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کی یہ عبارت:

''اساتذہ کی بزرگی مسلّم، ان کی زبان ہمارے لئے سرمشق اور ان کا قول برہان قاطع کا حکم رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ وہ بھی ہماری آپ کی طرح انسان ہیں اور نسیان وخطا سے مبرّا نہیں..... ان پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ تصویر کا محض ایک ہی رخ دکھاتے ہیں جو داغدار ہے۔ دراصل ایسا نہیں۔ جن لوگوں نے ان اساتذہ کی یا شعراء کی تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھا دکھا کر ان کے صحیح خدوخال کا اندازہ نہ لگنے دیا تھا، ڈاکٹر شادانی نے دوسرے رخ کی بھی نقاب کشائی کی ہے تاکہ دونوں رخ ہمارے سامنے آجائیں۔ ایک رخ تو بار بار دکھائے جاچکے تھے، ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی دوسرا رخ بھی دکھاتا۔'' (بحوالہ تہذیب کراچی، جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۳۶)

یہاں اس امر کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے موضوع پر بحث ومباحثہ کے دوران مجھے بعض اخبارات کے رویے پر بڑی حیرت اور مایوسی ہوئی۔ وہ اپنے چہیتے کالم نگاروں اور مضمون نگاروں کے دروغ گوئی پرمبنی مضامین تو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں لیکن جب ان کی تردید میں باقاعدہ مستند حوالوں کے ساتھ جوابات دئے جائیں تو کسی خود ساختہ نام نہاد اشاعتی پالیسی کی بنیاد پر سنجیدہ لہجے میں دئے گئے جوابات بھی روک لئے جاتے

ہیں۔ اس کے برعکس ان کے من پسند لکھاریوں کی دشنام طرازی جاری رہتی ہے اور وہی پالیسی ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بعض تحریروں کے جواب میں حقائق کی وضاحت کے لئے دوسرے اخبارات کا سہارا لینا پڑا۔

اس معاملے میں نظریاتی اصولوں پر کاربند ہونے کا تاثر دینے والا ایک قدیم اردو اخبار پیش پیش ہے۔ اس اخبار کے ایک مضمون نگار، جو ایک علمی سرکاری ادارے کے سربراہ بھی ہیں، اپنی تحریروں میں انگریزی زبان میں حوالے پیش کرنے کے بہت شائق ہیں جبکہ اصل حوالے اردو میں ہوتے ہیں جنہیں وہ انگریزی میں منتقل کرتے ہیں۔ شاید اس طرح وہ قارئین پر اپنی علمیت کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے ایک کالم میں سرسید کی اردو تحریر کا ایک اقتباس انگریزی میں دیا گیا۔ راقم نے انہیں خط کے ذریعے اصل عبارت بھیج کر اس امر کی نشان دہی کی کہ انگریزی عبارت اصل مفہوم کی حامل نہیں۔ جواب میں انہوں نے میری بات کو تسلیم کیا مگر اس کا جواز یوں تحریر کیا:

> ''سرسید نے چند بنیادی نوعیت کے تاریخی کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ سرسید سے نفرت کرنے لگیں۔ بس یہی تمنا ہے کہ ہم ان کی کمزوری سے آگاہ ہو جائیں مگر ساتھ ہی ساتھ ان کی خوبیوں کے بھی معترف ہوں۔ ان کی اصل اردو کا ترجمہ کم زہریلا ہے۔''

یہ ہے نظریاتی اصولوں کی علم برداری کے دعویداروں کا کچا چٹھا کہ اپنے ہیروز کے زہر کو کم دکھا کر قارئین کو گمراہ کیا جائے۔

ضیاء الدین لاہوری

الحقائق۔ آصف بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور
۲۰۰۷ء

باب اوّل

مباحث

ہیں۔ اس کے برعکس ان کے من پسند لکھاریوں کی دشنام طرازی جاری رہتی ہے اور وہی پالیسی ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے بعض تحریروں کے جواب میں حقائق کی وضاحت کے لئے دوسرے اخبارات کا سہارا لینا پڑا۔

اس معاملے میں نظریاتی اصولوں پر کاربند ہونے کا تاثر دینے والا ایک قدیم اردو اخبار پیش پیش ہے۔ اس اخبار کے ایک مضمون نگار، جو ایک علمی سرکاری ادارے کے سربراہ بھی ہیں، اپنی تحریروں میں انگریزی زبان میں حوالے پیش کرنے کے بہت شائق ہیں جبکہ اصل حوالے اردو میں ہوتے ہیں جنہیں وہ انگریزی میں منتقل کرتے ہیں۔ شاید اس طرح وہ قارئین پر اپنی علمیت کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے ایک کالم میں سرسید کی اردو تحریر کا ایک اقتباس انگریزی میں دیا گیا۔ راقم نے انہیں خط کے ذریعے اصل عبارت بھیج کر اس امر کی نشان دہی کی کہ انگریزی عبارت اصل مفہوم کی حامل نہیں۔ جواب میں انہوں نے میری بات کو تسلیم کیا مگر اس کا جواز یوں تحریر کیا:

> ''سرسید نے چند بنیادی نوعیت کے تاریخی کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ سرسید سے نفرت کرنے لگیں۔ بس یہی تمنا ہے کہ ہم ان کی کمزوری سے آگاہ ہو جائیں مگر ساتھ ہی ساتھ ان کی خوبیوں کے بھی معترف ہوں۔ ان کی اصل اردو کا ترجمہ کم زہریلا ہے۔''

یہ ہے نظریاتی اصولوں کی علم برداری کے دعویداروں کا کچا چٹھا کہ اپنے ہیروز کے زہر کو کم دکھا کر قارئین کو گمراہ کیا جائے۔

ضیاءالدین لاہوری

المقائق۔ آصف بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور
۲۰۰۷ء

باب اوّل

مباحث

کانگرس کے حق میں علمائے کرام کے فتووں کا پس منظر

ہمارے ہاں فقہی اور سیاسی وابستگیوں کی بنا پر ایک دوسرے پر بہتان تراشیوں کا ایک سلسلہ سا چل نکلا ہے اور ہر فریق گزشتہ شخصیات کے اقوال واقدامات کو صحیح پس منظر کے بغیر اپنی منشا کے مطابق بیان کر کے تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ افسوس اس بات پر ہے کہ یہ لہر معروف محققین کو بھی اپنی رو میں بہائے لئے جارہی ہے۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ اپنی تحریر یا تقریر کو اس انداز میں دوسروں کے سامنے پیش کیا جائے جس سے مخالف مکتب فکر کے بزرگوں کی تحقیر کی قیمت پر اپنے بزرگوں کی نیک نامی اور شہرت ہو۔

پچھلے دنوں روزنامہ ''جنگ'' میں جناب محمد فاروق قریشی کا مضمون بعنوان ''جواب آں غزل'' مطالعہ میں آیا جو دراصل اسی عنوان کے تحت ان کے سابقہ سلسلہ مضامین پر علامہ سید محمود احمد رضوی کے ایک اعتراض کا جواب ہے۔ وطن سے غیر حاضری کی بنا پر علامہ صاحب کی تحریر کے صحیح الفاظ تو نیرے علم میں نہ آسکے البتہ صاحب مضمون کے جواب میں پائی جانے والی بظاہر ہلکی سی مگر نہایت اہم تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے چند حقائق پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

میری نظر میں زیر بحث موضوع میں مرکزی کردار نہ تو علمائے کرام ہیں اور نہ کانگرس بلکہ سرسید احمد خاں کے افکار و کردار کا ردعمل ہے اور ہمارے ہاں سرسید کو ایک عرصہ سے جس انداز میں قوم کے سامنے پیش کیا جارہا ہے اس کے پیش نظر ان فتاویٰ کے ضمن میں ان کی شخصیت کا اصل عکس دکھائے بغیر درست نتیجے پر پہنچنا کسی صورت ممکن نہیں کیونکہ سرسید کے حق میں جدید

دانشوروں کے یک طرفہ پراپیگنڈا سے متاثر افراد، جن میں ہمارے تعلیم یافتہ افراد اور اساتذہ کرام کی ایک کثیر تعداد شامل ہے، یہی سمجھیں گے کہ یہ سب کچھ متعصب مولویوں کی تنگ نظری کے سبب ہوا۔

صاحب مضمون نے ''نصرت الابرار'' میں مختلف مکاتب فکر کے علمائے کرام کے ان فتاوی کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ۱۸۸۸ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت میں جاری کئے۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ استفتا کے اصل الفاظ بھی بیان کر دیتے کیونکہ اس کے بغیر اس حمایت کا پس منظر معلوم ہونا بہت مشکل ہے بلکہ اس سے عام ذہن میں یہ مفروضہ جنم لیتا ہے کہ تمام دستخط کنندگان علماء کرام نے مسلمانوں کے مفاد کو پس پشت ڈالتے ہوئے انہیں کسی ''ہندو کانگرس'' کا ساتھ دینے کی تلقین کی۔ استفتاء کے مفہوم اور جزوی الفاظ کے ساتھ اس کے پس منظر میں جو عوامل کارفرما تھے انہیں اپنی یادداشتوں اور چند متعلقہ حوالوں کے ساتھ بیان کر رہا ہوں جو میں نے یہاں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم لائبریری سے حاصل کئے۔ دوسری جانب اشاعتی مجبوریوں میں طوالت کا خوف بھی دامن گیر ہے، لہٰذا مجبوری ہے کہ اختصار سے کام لیتے ہوئے کم از کم حوالوں میں موضوع کو سمیٹنے کی کوشش کروں۔

۱۸۸۵ء میں کانگرس کی بنیاد رکھی گئی اور ۱۸۸۸ء میں مذکورہ فتوے حاصل کئے گئے۔ اس وقت کانگرس کی عمر صرف تین برس کی تھی اور اس قلیل عرصے میں ایسا کوئی واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ یہ جماعت ''ہندو کانگرس'' تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سرسید اور ان کے رفقائے کار مسلمانوں کی بہبود کے نام پر ایک ایسے کالج کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن معروف تھے جس کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے سرسید نے ۱۸۸۲ء میں لکھا تھا:

> ''اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔'' [1]

اس کالج کا نشان چاند میں صلیب کا نشان تھا جسے مسلمان طلبہ اپنے سینے پر سجاتے تھے اور اس کا علم اپنے ہاتھوں میں اٹھاتے تھے۔ دوسری طرف سرسید اپنی تحریروں اور تقریروں میں برابر اس نظریہ کا پرچار کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر از روئے مذہب انگریزوں کی اطاعت واجب ہے بلکہ تفسیر القرآن جلد اول کے آخر میں تو انہوں نے یہ فیصلہ بھی صادر فرمادیا تھا کہ مسلمان اپنا ملک چھوڑ کر جا سکتے ہیں مگر اپنے حاکموں کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی وقتی مصلحت نہ تھی بلکہ اس کے مستقل جواز میں وہ قرآن و حدیث سے حوالے پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سے قبل وہ اپنے ابتدائی دور کی تصنیف ''سرکشی ضلع بجنور'' میں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مسلمانوں کے لئے چار جگہ ''حرام زادہ'' کا لفظ استعمال کر چکے تھے۔ اسی کتاب میں انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں سے تعاون میں جتنے عملی اقدامات کئے، یہاں تک کہ انگریزوں کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بھی پروا نہ کی، اس کا تفصیلاً ذکر بڑے فخریہ انداز میں کیا تھا۔ اس نظریہ کے حامل فرد کو کسی ایسی جماعت کی سرگرمیاں کس طرح گوارا ہو سکتی تھیں جو ملکی باشندوں کے لئے انگریزوں سے اپنے حقوق طلب کرے۔ انہوں نے کانگرس کے خلاف اپنے تاریخی خطبوں میں ہندو مسلمانوں کی عددی نسبت کے حوالے سے جس طرح مطالبہ جمہوریت کی مخالفت کی وہ ایک لحاظ سے پر اثر بھی تھی مگر انہیں اصل اعتراض اس بات پر تھا کہ:

> ''جس طرح کہ نیشنل کانگرس کی کارروائی ہوتی ہے اور پولیٹیکل مباحثوں کے لئے جابجا مجلسیں کی جاتی ہیں اور عام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ رعایا کے واجبی حقوق ادا نہیں کرتی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نالائق اور جاہل آدمیوں کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت ظالم یا کم از کم نامنصف ہے۔ ایسی مجلسوں میں مسلمانوں کا شریک ہونا ہماری قوم کے لئے نامناسب ہے۔'' [۲]

آج ہمارے بعض دانشور کانگرس کے خلاف سرسید کی تقریروں کی روشنی میں انہیں دو قومی نظریے کا بانی قرار دینے کے بلند و بانگ دعوے کر رہے ہیں۔ ان کے ان دعاوی کی تان

''انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' کے قیام پر نوتی ہے جس کی بنیاد سرسید نے کانگرس کی مخالفت میں ہندوؤں سے مل کر رکھی۔ سرسید نے ایسوسی ایشن کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے اس کا پہلا اصول ''ہندوستان میں تحفظ امن اور برطانوی راج کی تقویت کے لئے جدوجہد کرنا'' بیان کیا۔ Pioneer الہ آباد کے نام ان کے ۸راگست ۱۸۸۸ء کے خط کے ایک اقتباس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:

> ''اگر ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ کوئی انگریز بھی اس ایسوسی ایشن میں شامل ہونا چاہے تو ہم اس کے تعاون پر اس کے انتہائی ممنون ہوں گے۔ وہ حضرات جو اس ایسوسی ایشن میں شامل ہونا چاہیں وہ اپنے نام یا تو منشی امتیاز علی یا منشی نول کشور لکھنو یا راجہ شیو اپرشاد بنارس یا سید ظہور حسین وکیل ہائی کورٹ الہ آباد یا مسٹر تھیوڈور بیک یا راقم کے نام علی گڑھ بھیج دیں۔'' [۲]

واضح رہے کہ مذکورہ ناموں میں علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل بھی شامل تھے۔ پھر انہوں نے بحیثیت سیکرٹری اس کا نام اس بنیاد پر ''یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' رکھنے کا فیصلہ کیا کہ اس میں سکھ، ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی تمام قومیں شامل ہیں جو کانگرس کی مخالف ہیں۔ مذکورہ بالا حوالہ جات سرسید کے سیاسی عزائم اور کانگرس کی مخالفت میں ان کی ذہنی کیفیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اب آیئے ان کے مذہبی افکار کا ہلکا سا جائزہ لیں جو ان کے سیاسی پس منظر کے تحت ان کے خلاف ان فتووں کی بنیاد بنے۔

سرسید عمر بھر انگریزوں اور مسلمانوں میں بطور حاکم و محکوم اور اہل کتاب ہونے کے ناطے آپس میں میل ملاپ بڑھانے کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سب سے پہلے جو عملی قدم اٹھایا وہ انجیل کی تفسیر لکھنے کا تھا۔ انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ اس کتاب میں کوئی لفظی تحریف نہیں ہوئی۔ ان کا یہ بھی بیان تھا کہ اس میں حضرت عیسیٰ کے لئے ابن اللہ کے الفاظ کا استعمال لغوی معنوں میں نہیں ہوا بلکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی بزرگ کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دے۔ اس پر علمائے اسلام میں ان کے خلاف زبردست ردعمل ہوا۔ پھر ایک عرصہ کے

بعد انہوں نے اصلاح معاشرہ کے نام پر رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس میں ایسے مذہبی عقائد کی تشہیر کی جو ان پر تکفیر کے فتوؤں کا باعث ہوئے۔ وہ فرشتوں، جنات اور شیطان کے وجود پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے، حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے اور ان کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے منکر تھے، تمام انبیاء کے معجزات کے قائل نہ تھے بلکہ اپنی تفسیر القرآن میں انہوں نے جہاں جہاں ان معجزات کا بیان آیا، ان کی تفسیر میں ظاہری الفاظ کو فلسفیانہ معانی پہناتے ہوئے اصل واقعات سے ایسے انکار کیا جو اُن کے عظیم معتقد مولانا حالی کے بقول ''غالبًا پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا''۔ ان کے انہی افکار کے باعث ان کے کالج کی مخالفت ہوئی۔ مخالفین کو خدشہ تھا کہ وہ طلبہ میں اپنے عقائد کی تشہیر کریں گے۔ اس ماحول اور فضا میں کانگرس کی تحریک شروع ہوئی۔ سرسید نے اس کے خلاف زبردست لیکچر دیئے جس کے بعد انہیں سر کا خطاب بھی ملا۔ سیاسی لوگ اپنے منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لئے سوجھ بوجھ کے ساتھ ایسے سیاسی طریق کار استعمال کرتے ہیں جو اُن کے مقاصد میں معاون ثابت ہوں۔ انہوں نے سرسید کی مخالفانہ تحریک کے توڑ میں ایک استفتا اس انداز میں تیار کیا کہ اس میں کانگرس سے مخالفت کے ضمن میں سرسید کے افکار و کردار کا تذکرہ اور اس کے مقابلے میں حکومت سے حقوق و مراعات طلب کرنے کے لئے کانگرس سے تعاون کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس میں کانگرس کے متعلق یوں درج تھا:

> ''ایک جماعت قومی مسمی نیشنل کانگرس ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کی رفع تکالیف اور جلب منافع دنیاوی کے لئے چند سال سے قائم ہوئی ہے اور اس کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث ان ہی امور میں ہو جو کل جماعت ہائے ہند پر موثر ہوں اور ایسے امور سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کو معتر ہو تو ایسی جماعت میں شرکت کرنا درست ہے یا نہیں؟'' [۳]

علماء کرام پر استفتاء کا جواب دینا بھی لازم ہوتا ہے، خواہ مستفتی نے کسی بھی مصلحت کے تحت ایسا کیا ہو۔ انہوں نے نقلی شواہد کے مطابق شریعت کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

فاضل مضمون نگار اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے فتویٰ کی جزوی عکسی نقل فراہم کر چکے ہیں۔ اسی طرح دیوبند کے ایک بلند پایہ عالم نے بھی ایسے ہی لکھا:

> ''سید احمد سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے اگر چہ وہ خیر خواہی قوم کا نام لیتا ہے درواقعہ میں خیر خواہ ہو مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام اور مسلمانوں کے لئے سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا۔ پس اس کے شریک مت ہونا۔'' [۵]

اس وقت اس نوزائیدہ جماعت کے متعلق کسی کے ذہن میں ''ہندو کانگرس'' ہونے کا کوئی تصور نہ تھا۔ کوئی مسلم لیگ نہ تھی، نہ ہی مسلمانوں کی کوئی جماعت جو اس کے مقابلے میں ہو، لہٰذا اس وقت تمام علماء کرام نے سرسید کے افکار و اعمال سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بلاتفریق مذہب و ملت ملکی باشندوں کے لئے حقوق و مراعات طلب کرنے والی جماعت سے تعاون کو درست قرار دیا۔ یہ تھا سارا پس منظر ان فتاویٰ کا۔ امید ہے کہ اس وضاحت سے بہت سے دلوں میں لاعلمی کے باعث پیدا ہونے والے شکوک ختم ہو جائیں گے۔

(روز نامہ جنگ لاہور ۱۴ دسمبر ۱۹۸۲ء)

حوالہ جات

۱۔ ایڈریس اور اسپیچوں متعلق ایم اے او کالج۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، (۱۸۹۸ء) دیباچہ ص ۲

۲۔ بحوالہ تذکرہ سرسید (محمد امین زبیری) پبلشرز یونائیٹڈ لاہور (۱۹۶۱ء) ص ۱۷۷

۳۔ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف سرسید احمد خاں (مرتبہ شان محمد) نچیکیتا پبلی کیشنز بمبئی (۱۹۷۲ء) ص ۲۳۵

۴۔ نصرت الابرار (مرتبہ مولوی محمد لدھیانوی) مطبع صحافی لاہور (۱۸۸۸ء) ص ۱۳

۵۔ ایضاً ص ۲۹

دفاعِ سرسید میں حقائق سے رُوگردانی

سرسید احمد خاں کی شخصیت ان کے بعض تعلیمی و سیاسی افکار اور مذہبی عقائد کے باعث ایک عرصہ سے متنازعہ فیہ چلی آ رہی ہے۔ ایک مخصوص طبقۂ فکر کی جانب سے ہمارے نصابِ تعلیم میں انہیں جس حیثیت میں پیش کیا جاتا رہا ہے اس سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ نامور اساتذہ، معروف مفکر اور مشہور دانشور سرسید کی اصل کتابوں کے مطالعہ کے بغیر اپنے لیکچروں اور مقالوں میں ان کے متنازعہ کردار کے بارے میں مصنوعی لفاظی سے اس قدر کام لیتے ہیں کہ اصل مسئلہ دب کر رہ جاتا ہے۔ جو کچھ انہوں نے کتابوں میں پڑھا ہوتا ہے اسے مزید بڑھا چڑھا کر اپنی علمیت کا لوہا منوانے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ دلائل کو تسلیم نہیں کرتے، اپنے خودساختہ جواز رنگین عبارت میں ڈھال کر انشاء پردازی کے جوہر دکھاتے ہیں اور ''وقتی مصلحت'' کی رٹ لگا کر کسی کی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔

امروز کی تین ہفت روزہ اشاعتوں ۱۱، ۱۸ اور ۲۵ فروری ۱۹۸۳ء میں جناب عشرت رحمانی بھی اسی رو میں بہہ گئے ہیں۔ انہوں نے ''سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی'' کے مقدمہ نگار جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کے مقالہ کی (جو بعد میں الحق اکوڑہ خٹک میں نقل ہوا) بڑی تضحیک کی ہے۔ وہ مقالہ نگار پر برسے ہیں اور خوب برسے ہیں اور اپنی قلم کے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ نے جوابی مضمون ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' میں وہ جناب ابوسلمان پر کوئی سند نہ پیش کرنے کا الزام لگاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر انہوں نے کوئی سند پیش کی ہے تو وہ

بزبان حال بقول میر:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مگر نہیں سوچتے کہ انہوں نے خود جو حوالے پیش کئے ہیں، ان کا اپنا پیش کیا ہوا مصرعہ ان کی اپنی ذات پر صادق آتا ہے۔ ضروری ہے کہ ان کے پیش کئے ہوئے نکات کا محققانہ تجزیہ کیا جائے ورنہ نئی نسل کے گمراہ ہو جانے کا خدشہ ہے۔

جناب عشرت رحمانی فرماتے ہیں کہ "سرسید کی تعلیم حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے زیر اثر ہوئی جہاں انہوں نے علوم متداولہ کی تکمیل کر کے سند فضیلت حاصل کی"۔ اگر ان کے سب سے بڑے معتقد اور سوانح نگار جناب الطاف حسین حالی کی حیات جاوید سے اس کی تردید میں تفصیل پیش کی جائے تو بات طوالت اختیار کر جائے گی۔ میں فاضل مضمون نگار سے درخواست کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے دعوے کی حمایت میں کوئی مستند حوالہ پیش کریں۔ انہوں نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے وہ ایک مضمون نگار کی ایک ہلکی سی مشق ہے، اور کچھ نہیں۔ اس کے جواب میں حیات جاوید سے صرف ایک فقرہ پیش خدمت ہے: "انہوں (سرسید) نے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی"۔[1]

جناب ابوسلمان نے اپنے مقالے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "وہ سرسید ہی تھے جنہوں نے اردو میں سائنسی تراجم کی تحریک کو خود ختم کر دیا تھا"۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں کہ "یہ بے پر کی حضرت شاہ جہاں پوری کو کس ذریعہ سے ہاتھ آئی ورنہ آج تک کسی مستند تحریری بیان سے تو اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا"۔ لیجیے، اس سے متعلق سرسید کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

> "میں کہتا ہوں کہ پنجاب کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ ان جدید علوم کو اپنی زبان کے ترجموں سے حاصل کر لیں گے اور یہی بنا مشرقی زبان کی یونیورسٹی قائم کرنے کی ہوئی، مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں پہلا شخص ہوں جس کے خیال میں بیس بائیس برس قبل یہی بات آئی تھی۔ میں

نے صرف اس کو خیال ہی نہیں کیا تھا بلکہ کر کے دکھایا اور آزمایا، تجربہ کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو اب تک زندہ ہے۔ اس میں یہی کام شروع کیا تھا تاکہ علوم وفنون کی کتابیں اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر قوم کی تعلیم کے لئے شائع کی جائیں مگر بعد تجربہ کے معلوم ہوا کہ ان جدید علوم کا ترجمہ کر کے اپنی قوم کو سکھلانا ناممکن ہے۔'' [۲۲]

سائنسی تراجم کی تحریک کو سرسید اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں۔ اپنی تحریک کے بیان اور پھر اس غلطی کے اعتراف میں ان کے الفاظ درج ذیل ہیں:

''میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ میکالے کے منٹ ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم پر توجہ دلائی اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبان کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہلِ ہند کو کوئی فائدہ پہنچاسکتی ہے یا نہیں؟ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی، بہت سے مباحثے مختلف جلسوں میں کئے۔ اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضمون لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔'' [۲۳]

ایک موقعہ پر فاضل مضمون نگار دارالعلوم علی گڑھ کے متعلق سرسید کے اپنے الفاظ کو بڑی

چابک دستی کے ساتھ مقالہ نگار کا تبصرہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''مختصراً ابوسلمان صاحب سرسید اور علی گڑھ کی تعلیم و تحریک کا نتیجہ نکالتے ہیں کہ دراصل سرسید کے دارالعلوم علی گڑھ کے قیام کا یہ مقصد کہ مسلمان نوجوانوں کو ذہنی، علمی و اخلاقی اور جدید سائنسی تعلیم دی جائے گی، محض لفظی تھا ورنہ کالج کے قیام سے سرسید کا اصل مقصد لارڈ میکالے کے مقاصد تعلیم کی تکمیل تھا۔ میکالے نے کہا تھا کہ تعلیم کا مقصد ذہن و فکر کے لحاظ سے انگریز تیار کرنا ہونا چاہیے، خواہ مذہب کی رُو سے وہ ہندو یا مسلمان کہلائیں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں''۔

اس کے جواب میں سرسید نے ایم اے او کالج کے قائم کرنے کے اسباب اور مقاصد جو اپنی تحریر نوشتہ ۱۸۸۲ء میں بیان کئے تھے، ان کا متعلقہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''اصل مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔'' ؎

سرسید لارڈ میکالے سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے جابجا ان کے نظام تعلیم کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور بعض جگہ انہیں ''لارڈ میکالے مرحوم'' اور ''خدا اسے بہشت نصیب کرے'' کے الفاظ سے بھی مخاطب کیا ہے۔

جہاں تک سرسید کے مذہبی اعتقادات کا سوال ہے اس پر ایک طویل بحث درکار ہے۔ مختصراً ان کے چند عقائد شیخ محمد اکرام کے حوالے سے درج ہیں:

''شیطان، اجنہ اور ملائک کے وجود سے انکار، حضرت عیسیٰ کے بن

باپ کے پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار، حضرت عیسیٰ و
حضرت موسیٰ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت
کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے۔'' ۵

سرسید کے معجزات سے انکار کے بارے میں حالی رقم طراز ہیں:

''حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیاء سابقین کے قصوں میں
جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانونِ فطرت معلوم ہوتے ہیں جیسے ید
بیضا، عصا کا اژدہا بن جانا، فرعون اور اس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا
موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی ہونا، گئو سالہ سامری کا بولنا، ابر کا سایہ
کرنا، من وسلویٰ کا اترنا یا عیسیٰ کا گہوارہ میں بولنا، خلق طیر، اندھوں اور
کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ،
ان کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں
لکھا۔'' ۶

فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ''ابوسلمان صاحب نے مولانا حالی کے حوالہ سے سرسید کے دینی عقائد اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تحریک کی مخالفت میں جو کچھ لکھا ہے وہ موصوف کا ذاتی نظریہ ہے جس کے لئے انہوں نے حالی پر غلط الزام لگایا ہے''۔ اس کے جواب میں سرسید کی مذہبی خدمات کے معترف ہونے کے باوجود ان کی تفسیر کے متعلق حالی کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر
ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔'' ۷

ایک اور جگہ حالی لکھتے ہیں:

''اس بات سے انکار نہیں ہوسکتا کہ آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو
وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض

آیاتِ قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے؟ ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔'' ۸

ایم اے او کالج علی گڑھ کے نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''ان نتائج سے محمڈن کالج کی کوئی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی جس کی رو سے اس کو ہندوستان کے اور کالجوں پر ترجیح دی جاسکے یا اس کو مسلمانوں کے حق میں زیادہ مفید سمجھا جائے۔ سوا اس کے کہ اس کالج میں ہندوستان کے اور کالجوں کی نسبت مسلمان طلبہ کی تعداد کسی قدر زیادہ پائی جاتی ہے کوئی تفاوت تعلیم اور نتائج تعلیم کے لحاظ سے محسوس نہیں ہوتا۔ نہ یہاں کے طالب علموں نے آج تک فضیلت اور علمی لیاقت میں اور کالجوں کے طلبہ پر کوئی صریح فوقیت دکھائی ہے اور نہ یہ ثابت کیا ہے کہ یونیورسٹی کے نتائج امتحان میں اس کالج کے تعلیم یافتہ بہ نسبت دیگر کالجوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔'' ۹

جناب مضمون نگار نے فاضلین علی گڑھ کے جو چند معروف نام گنوائے ہیں اس کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ اس قسم کے استثنا ہر جگہ ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے تمام رہنمایانِ قوم علی گڑھ کے تربیت یافتہ نہیں، ان میں ڈھیروں تعداد عیسائی اور دیگر غیر مسلم درس گاہوں کے علاوہ گم نام ترچھی اداروں سے سند فضیلت حاصل کرنے والوں کی بھی ہے۔ حقیقت میں کسی بھی ادارے سے فضیلت حاصل کرنے والے سارے کے سارے ایک ہی سیاسی یا قومی مسلک کے حامل نہیں ہوتے۔ فاضلین علی گڑھ میں ایسے نام بھی پیش کئے جاسکتے ہیں، ہم میں سے بعض لوگ جن کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھیں، مثلاً رفیع احمد قدوائی، راجہ مہندر پرتاپ، ڈاکٹر ذاکر حسین، خان عبدالغفار خاں، غلام محمد صادق وغیرہ۔ شیر کشمیر کہلوانے والے

شیخ عبداللہ بھی تو اسی ادارے کے فاضل تھے!

سرسید کے سیاسی عزائم کے متعلق بات کرتے ہوئے جناب عشرت رحمانی خود کو بہت بڑ مورخ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راقم کے مطالعہ میں ۱۸۵۷ء کے بارے میں ان کی دو کتابیں ہیں۔ ان میں جہاں کہیں سرسید کی انگریز پرستی کے ذکر کا موقع آتا ہے وہ اسے جلدی سے سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں یا مضحکہ خیز تاویلوں کا سہارا لیتے ہیں یا پھر اس کا ذکر مکمل طور پر گول کر جاتے ہیں۔ ستم کی انتہا یہ ہے کہ اپنے خیالات کی حمایت میں دو ایک قادیانی مصنف کے حوالے پیش کرتے ہیں جس کی قوم کی انگریز نوازی ضرب المثل ہے۔

راقم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کتابیں ہر شخص لکھ سکتا ہے مگر تحقیق میں مغز کھپانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ بغیر تحقیق کئے کتابیں لکھنے یا ایک مفروضہ کو فیصلہ کن انداز میں سامنے رکھ کر تحقیق کرنے سے وہ تضاد بیانی جنم لے گی جو جناب عشرت رحمانی کی کتابوں اور تحریروں میں موجود ہے جس کے ذکر کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اگر تاریخی واقعات لکھنے سے پہلے وہ اس موضوع پر اپنے امام سرسید کی آرا بھی ملاحظہ فرما لیتے تو انہیں اپنے تعصبات کا خود اندازہ ہو جاتا۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے چند مقامات کا ذکر کروں گا جس سے ان کی تحریروں کی مبینہ ''صداقت'' پر ایک ہلکی سی روشنی پڑے گی۔

اپنے مضمون میں جناب عشرت رحمانی لکھتے ہیں:۔

> ''ڈاکٹر ہنٹر نے ایک کتاب 'ہمارے ہندوستانی مسلمان' لکھ کر حکومت کو اسلامیان ہند سے برگشتہ کرنے کی نہایت منظم و مذموم مہم جاری کی۔ اس میں اس نے ایک سوال کیا کہ ''اے علماء محققین شرع اسلام! تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضہ میں ہے تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اس غنیم کی مدد کرنی جائز ہے یا نہیں؟'' اس سوال کے جواب میں ملک

کے تمام علماء خاموش رہے لیکن سرسید نے فوراً ایک مضمون کے ذریعہ جواب دیا۔ انہوں نے پہلے اسلام اور مسلمانوں کے دینی عقائد پر ایک اصولی بحث کی اور اپنے مضمون کے آخر میں صاف صاف کہہ دیا کہ "فی الوقت کوئی مسلمان یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو اُن کی سیاسی دلی حالت اس وقت ان سے کرائے گی۔"

"کڑ واکڑ واتھو، میٹھا میٹھا ہپ" کے مصداق اس حوالہ میں سے اصل حصہ کس نے اڑایا، جناب مضمون نگار اس پر بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اس حصہ کو اڑا دینے سے اصل حوالہ کا مطلب گمراہ کن حد تک بدل جاتا ہے۔ اگر جناب مضمون نگار نے ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں سرسید کا مضمون نہیں پڑھا تو میں ان کی اطلاع کے لئے سرسید کے متذکرہ مضمون مطبوعہ ۱۸۷۲ء، ص ۸۷ سے متعلقہ اقتباس پیش کرتا ہوں:

"میں ڈاکٹر ہنٹر صاحب کے سوال کا یہ جواب دیتا ہوں کہ انگریزوں کی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی حالت میں کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے اور اگر وہ ایسا کریں تو گنہ گار خیال کئے جائیں گے کیونکہ ان کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کو توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ البتہ میں یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے، کیونکہ وہ شخص حقیقت میں نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوا عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے بلکہ میری دانست میں تو شاید رشتہ داروں اور

دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل ہے۔ چنانچہ جو ملکی لڑائیاں انگلستان میں ہوئی ہیں ان میں باپ بیٹوں سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں جو کچھ مسلمانوں کو اپنی ملکی حالت کے لحاظ سے مصلحت معلوم ہوگی اس پر وہ عمل کریں گے، خواہ وہ حالت ان کے موافق ہو یا نہ ہو۔''

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب عشرت رحمانی کی کتابوں سے چند اقتباسات پیش کئے جائیں جن میں وہ اپنے امام سرسید سے ایک بہت بڑے قومی مسئلہ میں متصادم اور متحارب نظر آتے ہیں، مگر انشا پردازی کا کمال ہے کہ اس کے باوجود وہ ان کے دفاع میں ہمہ تن مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ یہ صرف ان پر ہی منحصر نہیں، افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے نصابِ تعلیم سے متاثر اکثر مؤرخ جب سرسید کے سیاسی خیالات کا ذکر کرتے ہیں تو ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچ کر ان کے ہر فعل کو جائز قرار دیتے ہیں۔

''اسباب بغاوت ہند'' میں کیا لکھا ہے اور اس کے متعلق سرسید سے باز پرس نہ ہونے میں کیا مصلحت کارفرما تھی؟ اس میں کیا حوصلہ مندی دکھائی گئی ہے؟ اس کا ذکر ایک مکمل مضمون کا متقاضی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے دوران سرسید احمد خاں نے کیا کردار ادا کیا؟ ''سرکشی ضلع بجنور'' میں خود سرسید نے اس کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے کہ وہ کس طرح مسلمانوں کے خلاف انگریزوں سے باقاعدہ خفیہ خط و کتابت میں مصروف رہے اور جنگ آزادی کو ختم کرانے میں انگریزوں سے مل کر کیا کیا سازشیں کیں؟ بجنور میں ہندوؤں سے مسلمانوں کو کس طرح مروایا؟ اور جب مسلمانوں کو اس حال تک پہنچا دیا تو ان کے خیر خواہ بن کر رونے دھونے کا فریضہ انجام دینے لگے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات سیاسی مصلحت کے طور پر انگریزوں سے مفاہمت کے خواہاں ضرور تھے لیکن اس سے بنیادی اصول تو ختم نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد سرسید ساری عمر

قرآنی تفسیر کے ذکر میں ہندی مسلمانوں کو مذہباً انگریزوں کی اطاعت کی تلقین کرتے رہے اور ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہے۔ انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے مسلمان مجاہدوں کو "حرام زادہ" کہیں اور ۱۸۵۷ء کے واقعات کے لئے نمک حرامی، بے ایمانی، حرام زدگی جیسے مکروہ اور فحش الفاظ استعمال کریں۔

واضح رہے کہ یہ الفاظ صرف لوٹ مار کرنے والوں کے لئے استعمال نہیں کئے گئے بلکہ اجتماعی طور پر کہے گئے۔ ہمارے مؤرخ اس معاملہ میں "وقت کا تقاضا" اور "وقتی مصلحت" جیسے الفاظ استعمال کر کے نئی نسلوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جناب عشرت رحمانی کی کتاب "۱۸۵۷ء کے مسلمان مجاہد" کے مقابلے میں اس سے ایک صدی قبل سرسید "لائل محمڈنز آف انڈیا" شائع کر چکے ہیں جسے "۱۸۵۷ء کے مسلمان غدار" کے عنوان سے موسوم کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اس میں سرسید نے ان مسلمان غداروں کا تذکرہ بڑے فخر سے بیان کیا ہے جنھوں نے انگریزوں کی حمایت میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کیا اور انعام واکرام سے نوازے گئے۔ جناب عشرت رحمانی اپنی کتاب میں جنہیں "مجاہد" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں سرسید انہیں انتہائی غیر اخلاقی الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ لیجیے چند مجاہدین جن کا ذکر عشرت رحمانی کی کتاب میں موجود ہے ان کے متعلق سرسید کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں۔

سرسید نے:

☆ جنرل بخت خاں کو "باغیوں کا سرغنہ" لکھا۔ [10]

☆ نواب خان بہادر خاں کو "بے ایمان اور نمک حرام" [11] اور "بدذات" [12] لکھا۔

☆ جنرل محمود خاں نجیب آبادی کو "کم بخت" [13] اور "ظالم" [14] لکھا۔ اس کے علاوہ کتاب میں جا بجا اسے محمود خاں کی بجائے نامحمود خاں لکھا ہے۔

☆ احمد اللہ خاں کو "بدذات" [15] اور "بدنیتی اور فساد کا پتلا" [16] لکھا۔

☆ ماڑے خاں کو "حرام زادہ" [17]، "قدیمی بدمعاش" [18]، "پکا بدمعاش" [19]، "بے رحم" [20] اور "مفسد" [21] لکھا۔

اب ۱۸۵۷ء کے متعلق محاکمہ نویس کے مزید ارشادات ملاحظہ فرمائیں اور ان کا موازنہ ان کے مقابل ان کے ممدوح سرسید کے فرمودات سے کریں:

عشرت رحمانی	سر سید
☆ "۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی سے دیسی فوج نے ان بے اعتدالیوں کے خلاف نعرہ جہاد بلند کیا۔" [۲۲]	"میرٹھ میں جو فساد اور نمک حرامی دسویں مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی" [۲۳]
☆ "اس جنگ آزادی یا جہاد حریت کا آغاز مسلمانوں کی قیادت میں ہوا۔" [۲۴]	"غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمان دل جلے تھے، وہ بیچ میں کود پڑے۔" [۲۵]
☆ "قوم و ملک کے مجاہدین علماء، فضلا اور شیر دل بہادروں نے عزم و عمل، شجاعت و استقامت کے بے مثال کارنامے انجام دیے لیکن قوم و وطن کے غداروں نے ان کی تمام قربانیوں اور مساعی کو ملیامیٹ کر کے برطانوی اقتدار کو ملک پر مسلط کر دیا۔" [۲۶]	"جس قدر اچھے اور خدا پرست اور سچ مچ کے مولوی اور درویش تھے ان میں سے کوئی شخص اس فساد میں شریک نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ مفسدوں کو برا اور اس فساد کو بے جا جانتے تھے۔" [۲۷] میں نہیں دیکھتا کہ اس تمام ہنگامہ میں کوئی خدا پرست آدمی یا کوئی سچ مچ کا مولوی شریک ہوا ہو۔" [۲۸]

اب انگریزی حکومت کے متعلق تاثرات کا موازنہ کیا جائے:

عشرت رحمانی

☆ ''جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس برصغیر میں اپنے عیارانہ قدم جمائے اور تجارت کو مکر وفریب سے ضرب دے کر اس کا حاصل ضرب حکومت نکالا تو اسی عہد سے اس مصلحت کے تحت ملک میں فرقہ پرستی اور قوم میں باہمی نفرت پھیلانے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھی۔''[۲۹]

''کمپنی کی صد سالہ حکومت .... جس نے برصغیر پر مسلط ہو کر اس کی آزادی، قومی شعار، تہذیب و تمدن اور دولت و اطمینان و فراغت سب کچھ لوٹ لیا۔''[۳۰]

سرسید

''ابتدائے حکومت انگریزی سے لغایت ۱۸۵۸ء تم سب لوگوں نے آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں اپنی زندگی بسر کی۔ حق یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت شائستگی اور نرمی اور بحفاظت مذاہب مختلفہ حکومت کی۔''[۳۱]

جناب عشرت رحمانی قیام پاکستان سے قبل نصاب تعلیم پر ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' تاریخ کی درسی کتابوں میں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا کہ ہم انگریزوں کو اپنا محسن حکمران سمجھیں اور ان کی خوبیوں اور نیکیوں کو غنیمت جان کر ان کی صفت کے راگ گائیں اور اپنے سلاطین کے مسخ کردار سے نفرت کریں جو انگریز حکمرانوں کے دماغوں ہی کے اختراع کیے ہوئے تھے''۔[۳۲]

میں یہاں عرض کروں گا کہ قیام پاکستان سے قبل معاملہ کچھ اور تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اسی قسم کا معاملہ ہمارے ساتھ پیش آ رہا ہے کہ انگریزی راگ کے گن گانے والوں کو اپنا محسن جتا کر نصاب تعلیم میں شامل کر دیا گیا ہے۔ دیکھئے کہ جناب رحمانی کے اعتراض کے متعلق سرسید کیا فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔

اس کی اطاعت اور فرمانبرداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی، جس کے سایۂ عاطفت میں ہم امن وامان کی زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔ میری یہ رائے آج کی نہیں ہے بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں۔'' ۳۳؎

''ہم کو درحقیقت نہایت سچے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ انگریزی گورنمنٹ سے جس قدر کہ ملک میں امن وامان اور رعایا میں آزادی ہے اس کی نظیر دنیا کی کسی گورنمنٹ میں نہیں ہے۔ میں نہایت دلی یقین سے یہ بات کہتا ہوں کہ جن عمدہ اصولوں پر انگریزی گورنمنٹ ہے اس سے زیادہ عمدہ اصول گورنمنٹ کے لئے ہو نہیں سکتے۔ جیسے رعایا کے حقوق اور ان کی دولت اور ان کی جان اور ان کی آزادی اس گورنمنٹ میں محفوظ ہے دنیا میں کہیں نہیں ہے۔'' ۳۴؎

''مسلمان رعایا نہ تو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے قیام کی مخالف تھی اور نہ برٹش گورنمنٹ کے قیام نے ان لوگوں میں کوئی سیاسی بےچینی پیدا کی۔ طوائف الملوکی اور ظلم وتشدد کے اس دور میں، جب کہ ملک کو ایک کامل اقتدار والی حکومت کی ضرورت تھی، مقامی آبادی نے برٹش اقتدارِ اعلیٰ کا پرجوش خیر مقدم کیا اور مسلمانوں نے بھی اس سیاسی تبدیلی پر اطمینان کے جذبات کا اظہار کیا۔'' ۳۵؎

''تسلیم کیا جائے کہ بعض مسلمان بادشاہوں نے غیر مذہب والوں پر ظلم کیا اور ان کی مذہبی آزادی کو برباد کر دیا مگر ایسا کرنا ان کا ذاتی فعل تھا جس کے وہ خود ملزم ہیں نہ کہ مذہب اسلام۔ بلاشبہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے بعد قوم عرب کے بتوں کو توڑ دیا مگر اس بت شکنی کی نظیر محمود غزنوی یا عالمگیر یا کسی اور بادشاہ کی بت شکنی کی نہیں ہو سکتی۔'' ۳۶؎

جناب عشرت رحمانی چاہیں تو ان کے لئے اس قسم کے بیسوں نہیں سینکڑوں حوالے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

آخر میں محاکمہ نویس موصوف کی تحریروں کے ایک خاص وصف کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ان کی تاریخ نویسی بھی انشا پردازی کی مشق کا نمونہ ہوتی ہے۔سرسید کی تعریف اور تحریک علی گڑھ کی توصیف میں ان کے مضامین جذباتی منظر نگاری پیش کرتے ہیں۔وہ من پسند نتائج حاصل کرنے کے لئے فرضی حوالے بھی پیش کرتے ہیں۔حوالوں کے اقتباس منتخب کرتے ہوئے سیاق وسباق حذف کر ڈالتے ہیں۔یوں دوسروں کے حوالے اپنے کھاتے میں ڈال لیتے ہیں یا ان میں اضافی الفاظ اور فقرے ملا کر انہیں اپنا لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ ماٰخذ کی تفصیل بتانا اکثر گوارا نہیں کرتے۔اگر کہیں حوالہ دیتے بھی ہیں تو وہ نامکمل ہوتا ہے اور بعض اوقات مضحکہ خیز طور پر غلط ہوتا ہے۔ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔وہ اپنی تالیف ''ہماری آزادی کی کہانی (سرسید سے قائداعظم تک)'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا حالی بجا فرماتے ہیں کہ ....'' ۳۷

اس کے بعد کی عبارت اس انداز میں درج کرتے ہیں جیسے کہ مولانا حالی کے خیالات کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کر رہے ہوں۔دو صفحات کے بعد ایک فقرے کے اختتام پر حوالے کا اشارہ دے کر حاشیے میں لکھتے ہیں: ''حیات جاوید۔مولانا حالی''۔ ۳۸ یہ بھی اس انداز میں جیسے کہ حوالے کے فقرے کے خیالات کا مفہوم مولانا حالی کے ارشادات سے مستعار لیا گیا ہو۔مزے کی بات یہ ہے کہ ''مولانا حالی بجا فرماتے ہیں کہ'' کے الفاظ کے بعد متذکرہ حوالے تک پورے دو صفحات مولانا صلاح الدین احمد کے کتابچے ''سرسید پر ایک نظر'' سے لفظ بلفظ نقل کئے گئے ہیں ۳۹ اور مولانا حالی کے خیالات نہیں۔

(الحق اکوڑہ خٹک۔جولائی ۱۹۸۴ء)

حوالہ جات

۱۔ حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ دوم، ص ۴

۲۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۳۰۱

۳۔ حیات جاوید (حصہ اول) ص ۲۳۶

۴۔ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، (۱۸۹۸) دیباچہ ص ۲

۵۔ موج کوثر (شیخ محمد اکرام) مرکنٹائل پریس لاہور (۱۹۴۰ء) ص ۵۳

۶۔ حیات جاوید (حصہ دوم) ص ۲۶۵

۷۔ ایضاً (حصہ اول) ص ۲۳۲

۸۔ ایضاً (حصہ دوم) ص ۵۲۲

۹۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۰۔ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر (سرسید احمد خاں) ہنری ایس کنگ لندن (۱۸۷۲ء) ص ۲۳

۱۱۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۴۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۵ و ۱۳۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۲۱۔ ایضاً، ص ۹۰

۲۲۔ ۱۸۵۷ء کے مسلمان مجاہد (عشرت رحمانی) مکتبہ معین الادب لاہور (۱۹۵۸ء) ص ۱۳

۲۳۔ سرکشی ضلع بجنور، ص ۵

۲۴ ۱۸۵۷ء کے مسلمان مجاہد، ص ۱۳

۲۵ حیات جاوید (حصہ اول) ص ۲۸۱

۲۶ ۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ (عشرت رحمانی) مکتبہ معین الادب لاہور (۱۹۵۸ء) ص ۱۲

۲۷ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) جلد دوم، ص ۱۱

۲۸ ایضاً، ص ۱۳

۲۹ ۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ، ص ۸

۳۰ ایضاً، ص ۱۳

۳۱ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۴۴

۳۲ ۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ، ص ۱۲

۳۳ روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۵ء) ص ۱۶۹

۳۴ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۱۱۷

۳۵ دی لائف اینڈ ورک آف سرسید احمد خاں (گراہم) مطبوعہ لندن (۱۹۰۹ء) ص ۲۲۰

۳۶ تفسیر القرآن جلد چہارم (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۸ء) ص ۱۰۹

۳۷ ہماری آزادی کی کہانی (عشرت رحمانی) مکتبہ معین الادب لاہور (۱۹۵۸ء) ص ۳۰

۳۸ ایضاً

۳۹ سرسید پر ایک نظر (صلاح الدین احمد) اکادمی پنجاب لاہور (۱۹۶۰ء) ص ۲۵ تا ۲۷

سنہ ستاون میں سرسید کا کردار

ہمیں آزاد ہوئے نصف صدی کے لگ بھگ ہونے کو ہے۔ اس سے قبل ہم تعلیمی اداروں کے ذریعے اپنے بعض قومی معاملات کو انگریزی نقطہ نظر کے مطابق پڑھنے پر مجبور تھے۔ آزادی کے بعد ہم نے تاریخ کے بعض گوشوں کے بیان میں قومی نظریات کو ترجیح دی مگر مخصوص نوعیت کے چند معاملات میں الجھن کا شکار ہو گئے۔ شخصیت پرستی کے زیر اثر بعض قلم کار حقائق پر اپنی مرضی کا رنگ چڑھانے لگے تو ان کے تذکروں میں تضاد بیانی نے جنم لیا۔ واقعات کو مخصوص انداز میں بیان کرنا (اگر چہ ان کی تہہ میں حقیقت اس سے مختلف ہو) ایک الگ بات ہے کیونکہ اس میں بہر حال کسی نقطہ نظر سے اختلاف کی گنجائش موجود ہوتی ہے لیکن کسی شخصیت کی حمایت میں اس کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کو برعکس طور پر بیان کرنا جبکہ ممدوح کی اپنی تحریریں اس بیان کی ڈنکے کی چوٹ نفی کرتی ہوں، اپنی پسندیدہ شخصیت کی صحیح صورت مسخ کرنا ہے۔ اگر کوئی اہل قلم اپنے ممدوح کی بعض باتوں پر مصلحتاً پردہ ڈال کر حقائق کو قارئین کی نظروں سے اوجھل رکھتا ہے تو یہ اس کا اپنا معاملہ ہے مگر یہ امر کسی صورت جائز قرار نہیں دیا جاسکتا کہ واقعات کو حقائق کے برعکس بیان کر کے تاریخ کو مسخ کیا جائے۔

روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت ۲۳ نومبر ۱۹۹۵ء میں جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد افضال صاحب کا ایک مضمون بعنوان "قائد تعلیم سرسید احمد خاں" مطالعہ سے گزرا۔ اس میں بعض باتیں واقعاتی طور پر درست نہیں۔ سرسید احمد خاں کی تعلیمی مساعی سے کسی صورت انکار

نہیں کیا جاسکتا خواہ ان کے پس منظر میں کیسے ہی مقاصد ہوں۔ وہ ایک پُر عزم شخصیت کے مالک تھے اور دن رات اسی دھن میں مگن رہتے تھے کہ قوم کے اہل ثروت افراد کو اپنے بچوں کے معاملے میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوانے پر مائل کیا جائے۔ سرسید نے اس مقصد کے لئے انہیں ایک ادارہ علی گڑھ کالج مہیا کیا جو ان کی وفات کے ایک عرصہ بعد ان کی خواہش کے مطابق یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا۔ دراصل اس تمام تگ و دو سے پیشتر وہ ایک ایسے دور کی ناخوشگوار کیفیت سے دوچار ہو چکے تھے جس سے متاثر ہو کر انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں ایک خاص مقصد کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ یہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا دور تھا جس میں سرسید نے ایک واضح کردار ادا کیا تھا اور وہ اس کا ذکر نہایت دیانت داری کے ساتھ واشگاف الفاظ میں اور بالتفصیل اپنی تصنیف "سرکشی ضلع بجنور" میں کر چکے تھے۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ دستاویزی ثبوت موجود ہونے کے باوجود ہم حقائق کو برعکس بیان کرنا ایک افتخار سمجھتے ہیں۔

محترم مضمون نگار نے فرمایا ہے کہ "۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت سرسید احمد بجنور میں صدر امین کے عہدے پر فائز تھے۔ انگریزی ملازم ہونے کے باوجود انہوں نے اہل بغاوت کے ساتھ تعاون کیا ..." یہاں میرا مقصد بحث نہیں محض ریکارڈ کی درستی ہے کیونکہ اگر یہ کام اس وقت انجام نہ دیا گیا تو بگڑی ہوئی تاریخ جنم لے گی اور جب مستقبل میں کوئی مورخ یا محقق اس غلطی کو دور کرے گا تو آج کے تذکرہ نگاروں کو اس بنا پر بددیانتی کا مرتکب ٹھہرائے گا کہ بعض نے حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کی اور دوسروں نے اصل دستاویزات کا علم ہونے کے باوجود اس پر خاموشی اختیار کی لہٰذا اس بارے میں سرسید کی اپنی تحریروں سے متعلقہ اقتباسات بلاتبصرہ پیش خدمت ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے علیگ برادری کو بالخصوص یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ سرسید کے عظیم خواب کی تعبیر کے نقش کو سدا منقش رکھیں۔ سب سے اول میں اس معزز طبقے کی خدمت میں سرسید کے ایک مکتوب سے درج ذیل فقرہ پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں:

> "بڑا شکر خدا کا یہ ہے کہ اس ناگہانی آفت میں جو ہندوستان میں ہوئی، فدوی بہت نیک نام اور سرکار دولت مدار انگریزی کا طرف دار اور قیم خواہ رہا" [۱]

بات بہت طویل ہے اور سینکڑوں صفحات سیاہ کرنے پر بھی مکمل نہیں ہوتی مگر یہاں نہایت انتصار سے کام لیتے ہوئے محض چند مواقع کے حوالے سے سرسید کے اہل بغاوت کے ساتھ مبینہ ''تعاون'' کا ذکرانہی کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ ''سرکشی ضلع بجنور'' میں سرسید تحریر کرتے ہیں کہ ''میرٹھ میں جو فساد اور نمک حرامی دسویں مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی تھی اس کی خبر گیارھویں تاریخ تک بجنور میں نہیں آئی تھی''۔ [۲] لائل محمڈنز آف انڈیا، نمبر اول' میں وہ بغاوت کی خبر پر اپنے ردعمل کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''دفعتاً سرکشی میرٹھ کی خبر بجنور میں پہنچی۔ اول تو ہم نے جھوٹ جانا مگر جب یقین ہوا تو اسی وقت سے میں نے اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور سرکار کی وفاداری پر چست کمر باندھی۔ ہر حال اور ہر امر میں مسٹر الگزینڈر شیکسپیئر صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور کے شریک رہا، یہاں تک کہ ہم نے اپنے مکان پر رہنا موقوف کر دیا۔ دن رات صاحب کی کوٹھی پر حاضر رہتا تھا اور رات کو کوٹھی کا پہرہ دیتا تھا اور حکام کی اور میم صاحب کی اور بچوں کی حفاظت جان کا خاص اپنے ذمہ اہتمام لیا۔ ہم کو یاد نہیں ہے کہ دن رات میں کسی وقت ہمارے بدن پر سے ہتھیار اترا ہو۔'' [۳]

پھر ایک موقع آیا کہ انگریز افسروں کو نواب محمود خاں سے جان کا خطرہ ہوا۔ سرسید نے دانائی سے کام لے کر بات چیت کے ذریعے ان کی جان بچائی اور انگریز ضلع بجنور نواب محمود خاں کے حوالے کر کے وہاں سے چلے گئے۔ محمود خاں نے ان کے جاتے ہی وہاں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا مگر سرسید نے اس صورت حال کو قبول نہ کیا۔ نواب سے اپنے عدم تعاون کا ذکر کرتے ہوئے ''سرکشی ضلع بجنور'' میں سرسید لکھتے ہیں:

''میں نے اور سید تراب علی تحصیل دار اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے باہم مشورہ کیا اور آپس کی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے جب تک کہ باہم کمیٹی کے اس کی صلاح نہ ہو لے۔ چنانچہ اسی وقت کام کرنے کے باب میں یہ رائے ٹھہری کہ

میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور جو ضروری حکم نواب کا پہنچے اس کو لاچار تعمیل کریں اور باقی احکام سب ملتوی پڑے رہنے دیں اور باقی مال گزاری بجز اس قدر روپیہ کے جس سے تنخواہ عملہ تحصیل و تھانہ تقسیم ہو جائے اور کچھ وصول نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بخشی رام تحویل دار کی معرفت کہ وہ بھی خیر خواہ سرکار اور ہمارا ہم راز تھا، جو مال گزار آیا اس کو فہمائش کی گئی کہ روپیہ مت دے۔ اس تساہل تحصیل سے نواب ناراض ہوا اور احکام سخت بھیجنے لگا اور کلمات نا ملائم پروانہ جات میں تحریر ہونے لگے اور نسبت اجرائے کارروائی یہ رائے ٹھہری کہ جب تک ہو سکے میں صدر امین بموجب آئین سرکار دولت مدار انگریزی کام کرتا رہوں اور کسی طرح کا تعلق نواب سے اس کام کا نہ رکھوں۔ چنانچہ مجھ صدر امین نے ایسا ہی کیا اور جو روبکاریاں اور رپورٹیں قابل ارسال بحضور جناب صاحب جج بہادر تھیں ان میں علی الاعلان کچہری میں بھی حکم تحریر ہوتا رہا کہ بحضور جناب صاحب جج بہادر بھیجی جائیں۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ عوام یہ سمجھتے تھے کہ حکام انگریزی کا تسلط بدستور ہے۔ البتہ نواب کو یہ امر بہت ناگوار تھا اور ایسی باتوں سے اس کی دشمنی ہمارے ساتھ زیادہ ہوتی جاتی تھی مگر ہم کو توقع تھی کہ ہمارے حکام بہت جلد پھر ضلع میں تشریف لاتے ہیں۔'' ؎

اس دوران بجنور میں باغیوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ ایک موقع پر ان کے ساتھ بحث و تکرار کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں:

''دفعتاً منیر خاں نامی ساکن گنج پورہ نگینہ سے جہادی بن کر مع جمعیت چار سو آدمی کے بجنور میں داخل ہوا..... منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر اور سید تراب علی تحصیل دار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی

انگریزوں سے سازش اور خط وکتابت رکھتے ہیں اس لئے ان کا قتل واجب ہے۔ اور درحقیقت ہماری خفیہ خط وکتابت جناب مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی۔'' ۵

بعد میں بجنور میں بڑی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی۔ ہندو چودھریوں نے حملہ کرکے بجنور پر قبضہ کرلیا۔ ضلع کے مختلف مقامات پر ہندو مسلم فسادات ہوئے جن میں مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے گئے۔ بالآخر انگریزوں نے سرسید اوران کے ایک ساتھی کوضلع کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کردیا۔ ادھر مسلمانوں نے اپنی قوت کو دوبارہ مجتمع کیا۔ ہندو چودھری شہر پر حملے سے قبل ہی بھاگ گئے۔ سرسید کو بھی نواب سے جان بچانے کے لئے راہ فرار اختیار کرنا پڑی اور نہایت مصیبتیں جھیل کر بڑی مشکل سے میرٹھ پہنچے اور بیمار پڑ گئے۔ انگریز حاکم ان کی بیمار پرسی کے لئے گیا اور ان کی بڑی تعریف کی۔ اس موقع کی روئداد سرسید کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

''میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں اور پھر مجھ کو اس کے لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خود نہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں، اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کرکے اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج وسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ ''تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کرکے اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور

نہایت طرف داری سرکار کے جب تمام ہندوؤں نے جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے، سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بننا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے۔" میں اپنے آقا کا کمال شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدر دانی کی۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ آمین۔" [۶]

کیا یہ درست نہیں کہ متذکرہ تصویر نہایت عز و افتخار کے ساتھ ہماری آنکھوں میں واقعی سرایت کی جا چکی ہے؟

(روزنامہ جنگ لاہور۔ ۲۳ نومبر ۱۹۹۵ء)

حوالہ جات

۱۔ مکتوبات سرسید، جلد اول (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۸۵ء) ص ۳۰۹

۲۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۵

۳۔ لائل محمڈنز آف انڈیا، جلد اول (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) ص ۱۳

۴۔ سرکشی ضلع بجنور، ص ۳۶

۵۔ ایضاً، ص ۳۷

۶۔ ایضاً، ص ۶۷-۶۸

سرسید کے عقیدت مندوں کے عجیب رویّے

سرسید احمد خاں کے دست راست، عزیز ترین رفیق اور تحریک علی گڑھ کے عظیم ستون نواب محسن الملک نے ایک موقع پر ان خیالات کا اظہار کیا:

''مرحوم سرسید کے خیالات کا سب سے زیادہ جاننے والا اور ماننے والا میں ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی دوسرا شخص ان کا عقیدت مند اور ان کی عزت کرنے والا نہ ہوگا لیکن ان کی رائے مثل قرآن وحدیث کے نہ تھی، وہ نبی نہ تھے، وہ معصوم نہ تھے، ان کی گفتگو وحی آسمانی نہ تھی۔ جب ان کا کوئی قول پیش کیا جائے جو خلاف حدیث ہو تو ہم باوجود ان کی عزت، عظمت واقتدار کے سر تسلیم خم نہ کریں گے۔'' [۱]

ایک اور موقع پر انہوں نے یوں خطاب کیا:

''سید صاحب نے کبھی دعویٰ پیمبری نہیں کیا اور نہ اس بات پر اقرار کہ خواہ مخواہ لوگ ان کے ہم عقیدہ ہوں، لہٰذا اصلی اور سچی بات کو ہم تسلیم کرتے رہے اور بری بات کو ان کی نہ مانتے تھے اور صاف ان کے روبرو انکار کردیتے تھے۔'' [۲]

نواب محسن الملک کے یہ خیالات اپنے عظیم قائد سرسید ہی کی تقلید میں ان کے ایک مثبت رویے

کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ آج کے دور میں ہم میں ان شخصیات جیسے رویوں کے حامل انسانوں کی کمی ہی نہیں، فقدان ہے۔ اتنا بھی ہوتا تو غنیمت تھا، مگر افسوس اس بات پر ہے کہ اس معاملے میں سرسید کے بعض عقیدت مند معکوس رویوں کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں کسی نے سرسید کی کسی بات پر اصولی اختلاف کا اظہار کیا، یہ لوگ نفرتوں کے لٹھ لے کر باجماعت باہر نکل آتے ہیں اور خالص علمی ماحول کو میدان کارزار بنا ڈالتے ہیں۔ جس نے ان کے خلاف منشا ذرا سی بات کی، یہ سب اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اختلاف رائے برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ علمی بحث میں جب ان سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا تو خفت مٹانے کی خاطر سرسید کے اعمال و افکار کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جن سے سرسید کی روح بھی کانپ اٹھتی ہوگی۔ یہی نہیں، وہ عقیدت مندی کے جذبے کے تحت اپنے محسن اعظم کے جعلی ارشادات تخلیق کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ سرسید کے کارناموں کے ایک مخلص معترف اور متعدد کتابوں کے مصنف اصغر عباس پروفیسر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے ایک مضمون میں اس بات پر گلہ کیا ہے کہ سرسید کے ''فرزندانِ معنوی'' (بقول مضمون نگار):

> ''ہندوستان اور بیرون ملک یوم سرسید یا سرسید کی برسی بڑے زور وشور سے مناتے ہیں، جلسے جلوس ہوتے ہیں اور ان جلسوں میں سرسید سے وہ باتیں بھی منسوب کر دیتے ہیں جو اُن کی تقریر وتحریر میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ اکثر اس موقع پر بے معنی سیمینار ہوتے ہیں اور ان میں بھی سرسید کے افکار واعمال کی خوب کتر بیونت کی جاتی ہے۔'' ۳۳

میں سمجھتا ہوں کہ اس طرزِ عمل سے سرسید کے یہ نادان شیدائی اپنے قائدِ محترم کا قد کاٹھ بلند نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس ان کی شخصیت کو مزید داغدار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار تحریک علی گڑھ کے ایک نامور ترجمان پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی ایک تحریر میں کیا ہے۔ وہ سرسید کے بعض عقیدت مندوں کے رویوں کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

> ''ان کے زمانے میں کم از کم ان کے عقیدت مند ان کے افکار و خیالات کی غلط تعبیر تو نہیں کرتے تھے۔ آج ایک مخصوص مکتب خیال

سے تعلق رکھنے والے عقیدت مندوں کا طبقہ ان سے وہ تصورات
منسوب کرتا ہے جن کی پرچھائیاں بھی ان کے حاشیائی خیال پر نہیں
پڑی تھیں۔ جو غلط فہمی عقیدت مندی کے سہارے پھیلائی جاتی ہے،
اس کا دور کرنا مخالفوں کی بدظنی کا مقابلہ کرنے سے زیادہ دشوار ہوتا
ہے۔'' ۴

ان رویوں کی تازہ مثال جناب محمد اسمٰعیل آزاد کا وہ مضمون ہے جس کی پہلی قسط ''سرسید کا تاریخی مقام'' کے عنوان سے ''ساحل'' کراچی کی اشاعت جون ۹۸ میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں سرسید احمد خاں مرحوم کے افکار و اعمال پر ترتیب دی گئی میری تین کتابوں کے اندراجات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پہلی کتاب ''سرسید کی کہانی، ان کی اپنی زبانی'' سولہ سال قبل شائع ہوئی جس کا مقدمہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے تحریر کیا تھا۔ فاضل تنقید نگار جناب آزاد کی موجودہ روش کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اتنا عرصہ کیسے خاموش رہے! شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جب متذکرہ مقدمے کے بعض نتائج کی باقاعدہ تصدیق سرسید کی اپنی زبانی ان کی خود نوشت کے حوالوں سے منظر عام پر آ گئی، جس سے سرسید کے فکر و عمل سے متعلق جناب آزاد کے بعض ذاتی خیالات کا ابطال ہوتا تھا، تو ان کے جوش عقیدت مندی نے اس مقدمے کی عبارتوں کی بنیاد پر ایک بھرپور یورش کا اہتمام کیا۔ سولہ سال قبل شائع ہونے والے مقدمے کو تازہ کتابوں کے ساتھ نتھی کرنے کے لئے انہوں نے یہ جواز قائم کیا کہ ''سرسید کی کہانی'' میں راقم نے اپنے پیش لفظ میں اس مقدمے کو سراہا تھا، اس لحاظ سے زیر نظر دونوں کتابیں اس پہلی کتاب کی تفصیل اور تکمیل ہیں''۔ ۵

میں ان کی معلومات کے لئے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ تازہ کتابیں پہلی کتاب کی نہ تو تفصیل ہیں اور نہ تکمیل۔ یہ اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت میں مکمل کتابیں ہیں، لہٰذا جناب آزاد کو اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ میں نے ان کے خیال کے مطابق ''اس پہلی کتاب کو سرے سے فراموش کیوں کر دیا!'' اس کی بیشتر تحریریں ''خود نوشت'' میں مناسب جگہوں پر شامل ہیں۔ کتابوں کی حیثیت اپنے متن سے متعین ہوتی ہے، نہ

کہ موضوع کے اعتبار سے۔''سرسید کی کہانی'' صرف اور صرف ''حیات جاوید'' کی تحریروں سے ماخوذ ہے،اس لئے اس کی الگ حیثیت برقرار ہے۔

جناب آزاد کی تنقید پڑھ کر شدت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے زیر تنقید کتابوں کی نوعیت اور اس کے متن کا سکون کے ساتھ مطالعہ کئے بغیر نہایت عجلت میں بے صبری کے ساتھ اپنا نشتر صفت قلم سنبھالنے کی زحمت گوارا فرمائی۔اس کا ثبوت ان کی تحریر میں متعدد جگہ موجود ہے۔مثال کے طور پر وہ ''سرسید کی کہانی'' کے بعض اقتباسات نقل کرنے سے پیشتر اس کا حوالہ یوں دیتے ہیں:

> ''ضیاءالدین لاہوری صاحب نے اپنی کتاب ''سرسید کی کہانی،ان کی اپنی زبانی'' میں صفحہ۵۹ تا ۶۳ میں سرسید کی کتاب اسباب بغاوت ہند پر یوں تبصرہ کیا ہے:......'' [۲]

معلوم ہوتا ہے کہ جناب آزاد اس کتاب کے اصل متن کے مصنف سے آگاہ نہیں حالانکہ کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں الطاف حسین حالی کا نام ''راوی'' کے طور پر درج کیا گیا ہے۔انہوں نے جس تبصرے کو میرے نام سے درج کیا وہ حالی کا تحریر کردہ ہے۔میں نے اپنے پیش لفظ میں اس امر کو مفصل طور پر بیان کیا ہے۔''خودنوشت'' پر کئے گئے اعتراضات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے کتابوں کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں کیا۔مندرجہ ذیل اعتراض اس کا بین ثبوت ہے:

> ''ضیاءالدین لاہوری صاحب نے اپنی تازہ دونوں کتابوں میں سے ایک میں سرسید کی کتاب ''تاریخ سرکشی بجنور'' تقریباً سب شائع کر دی لیکن ان کی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' کا تذکرہ سرے ہی سے نہیں کیا۔'' [۷]

جناب آزاد کا اعتراض کرنے کا حق سرآنکھوں پر، ذرا زحمت فرما کر ''خودنوشت حیات سرسید'' [۸] کے باب ''تصنیف وتالیف'' کے تحت صفحہ ۲۷۷ اور اس سے اگلے صفحے پر اس کتاب کی تفصیل دیکھیں،صفحہ ۲۷۶ پر اس کے ایک مخطوطے کی عکسی نقل ملاحظہ فرمائیں،صفحہ

۔ ۳۶ پر اس کے سرورق کی عکسی تصویر پر نظر ڈالیں، ایک ذیلی عنوان "غدر کے اسباب" (صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۵) کے تحت تحریروں کا مطالعہ کریں، تمام حوالے اسی کتاب سے منقول ہیں۔ اسی طرح ذیلی عنوان "دلی کے بادشاہ کی قدر و قیمت" (صفحات ۱۳۰۔ ۱۳۱) پورے کا پورا اسی کتاب کے حوالوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ہاں، اس معاملے میں انہیں جو غلط فہمی ہوئی اس کا اصل سبب سرسید کی تصانیف کے معاملے میں ان کے مطالعہ کی کمی ہے۔ پر سیدکی متذکرہ کتاب کا اصل نام "اسباب بغاوت ہند" نہیں بلکہ "اسباب سرکشی ہندوستان کا جواب مضمون" ہے جسے میں نے ذرا اختصار کے ساتھ "اسباب سرکشی ہندوستان" تحریر کیا ہے جب کہ "کتابیات" کے ذیل میں اس نام کے ساتھ بریکٹ میں اس کا معروف نام "اسباب بغاوت ہند" بھی درج کیا ہے۔ یہ میری مجبوری تھی کہ جس کتاب کے صفحات کے حوالے درج کروں، اس کا اصل نام تحریر کروں۔ میں خود کو پاک و ہند کے ان چند خوش قسمت افراد میں تصور کرتا ہوں جنہوں نے اصل کتاب کی زیارت کی، بلکہ میرے پاس اس کی پوری عکسی نقل موجود ہے۔ سرسید کے ایک شیدائی کو اپنے محسن اعظم کی کتابوں کے کم از کم صحیح نام تو معلوم ہونے چاہئیں۔

ہمارے فاضل تنقید نگار بعض اوقات جوش عقیدت میں نیم مہذب گالیوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذہن میں دیانتداری کا ایک معیار مقرر کر رکھا ہے۔ جو چیز ان کے من کو نہیں بھاتی اور وہ سمجھتے ہیں کہ ایسے ہونا چاہیے تھا (خواہ عملی طور پر ایسا ہونا ممکن نہ ہو)، اور چونکہ وہ ویسے نہیں ہوا اس لئے ایسا کرنے والا دیانت دار نہیں۔ "اسباب بغاوت ہند" کا سرے ہی سے تذکرہ نہ کئے جانے کے متذکرہ الزام کے ساتھ ہی آپ یہ فرماتے ہیں:

> "تحقیق کی غیر جانب داری اور دیانت داری کا تقاضا یہ تھا کہ "اسباب بغاوت ہند" مکمل اس کتاب میں شائع کرتے " ۹

گویا یہ مکمل کتاب شامل نہ کر کے میں نے جانب داری برتی اور بددیانت ٹھہرا۔ میرے دیانت دار بھائی! میرے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ آپ تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر ہنٹر کے جواب میں سرسید کی کتاب کو بھی مکمل شائع کیا جاتا، ۱۰ کل کلاں آپ یا آپ کا کوئی ہم ذہن بھائی بند آپ ہی کے مہذب لہجے میں یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ سرسید کی مکمل تفسیر کو کتاب میں کیوں

شامل نہیں کیا گیا؟ پھر کوئی اور صاحب علمائے کرام کی شان میں سرسید کی تحریروں کو اجاگر نہ کرنے کا الزام دیتے ہوئے یہ کہتے کہ آثار الصنادید کا باب چہارم بھی اس کتاب میں آنا چاہیے تھا۔ ذرا اندازہ فرمائیے کہ ایسا کرنے میں میری کتاب کس قدر ضخیم ہو جاتی اور کون اسے خریدنے کی استطاعت رکھتا، بلکہ کون اسے چھاپنے کا خطرہ مول لیتا؟ میں نے سرسید کی حیات اور افکار کے اہم نکات مختصر انداز میں ترتیب دئے کہ مصروفیت کے اس دور میں جبکہ عام قارئین کو سرسید کی ہزار ہا صفحات پر پھیلی ہوئی تحریروں کا مطالعہ کرنے کا وقت میسر نہیں، انہیں تحریروں کا انتخاب جامع صورت میں عام حجم کی دو کتابوں میں دستیاب ہو جائے۔ یہاں پر آپ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ پھر سرکشی ضلع بجنور کا ایک کثیر حصہ اس میں کیوں شامل کیا گیا؟ تو عرض ہے کہ یہ حصہ ان کی حیات کا ایک نہایت اہم تذکرہ ہے۔ ''خود نوشت حیات سرسید'' ان کی زندگی کی کہانی ہے، اس میں یہ حصہ شامل کرنا ضروری تھا۔ ویسے بھی ''خود نوشت'' کے لئے تحریریں مرتب کرتے وقت میرے ذہن میں جو لائحہ عمل تھا اس کا تذکرہ اپنی کتاب کے صفحہ ۳۶ میں یوں کیا ہے:

> ''طویل واقعات کے بیان میں صرف ان حصوں کو شامل کیا گیا جن میں سرسید متحرک دکھائی دیتے ہیں، یا ان کے تاثرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعض اقتباسات، جن میں وہ متحرک دکھائی نہیں دیتے، اس لئے شامل کئے گئے ہیں تاکہ طویل واقعات میں تسلسل کو برقرار رکھنے، گزشتہ واقعات کے نتائج واضح کرنے یا آئندہ واقعات کا پس منظر سمجھنے میں مدد ملے، یا پھر ان میں سرسید کا کوئی خاص طرز تحریر ظاہر کرنا مقصود تھا۔''

جناب آزاد نے ایک اور جگہ اپنے متذکرہ لہجے میں مزید تلخی شامل کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''۱۹۸۲ء میں ضیاء الدین لاہوری کی پہلی کتاب ''سرسید کی کہانی، اُن کی اپنی زبانی'' شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ نگار ابو سلمان شاہ جہان پوری نے صفحہ ۳۹ پر سرسید کو نظریۂ پاکستان کے بانی شمار کرنے والوں

سے بارے میں ''شکایت'' کی کہ وہ ان کے ایسے اقدامات اور بیانات
کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن سے جغرافیائی بنیاد پر ''قوم'' کی تشکیل کے
نظریہ کی پرزور وکالت کی گئی ہے۔ اس ''نشان دہی'' پر لاہوری
صاحب نے ''افکارِ سرسید'' [۱۱] صفحات ۲۶۲ تا ۲۶۴ پر سرسید کے ایسے
بیانات درج کئے جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اہلِ وطن کے اعتبار
سے ایک قوم کہا گیا ہے۔ ''اگر'' یہ دونوں خود ساختہ محققین کا اس سے
مطلب یہ ہے کہ ۱۸۹۷ء یعنی ان کی وفات سے ایک سال قبل سرسید
کانگرس کی مخالفت یا دو قومی نظریہ سے دست بردار ہو چکے تھے تو یہ صریح
بددیانتی ہے۔'' [۱۲]

اس میں لفظ ''اگر'' پر غور کیجیے، یعنی وہ وثوق کے ساتھ نہیں کہتے کہ ہمارا واقعی وہی مطلب ہے جو انہوں نے اخذ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مزاج کو اعتدال میں نہیں رہنے دیتے اور ایک مفروضے پر ہمیں ''صریح بددیانتی'' کا مرتکب گردان کر اور اگلی سطروں میں اپنی حب الوطنی کے جذبے کی نمائش کرتے ہوئے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور خوب جلی کٹی سناتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ حالت تشکیک کی بنیاد ہی پر کرتے ہیں یعنی ''اگر...... اس سے مطلب یہ ہے'' کے پردے میں۔ پھر ''نشان دہی'' سے ان کا مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی تحریک پر میں نے ''افکارِ سرسید'' میں سرسید کے ایسے بیانات درج کرنے کا جرم کیا جو ڈاکٹر صاحب کی ''شکایت'' کی تصدیق کرتے ہیں۔ محض اتنی سی بات پر اس قدر غیظ و غضب کا مظاہرہ، یا اللہ خیر! میرے محترم بھائی، بیانات تو ایک صدی سے بھی زیادہ قبل کے موجود تھے، میں درج نہ کرتا تو کوئی اور کر دیتا۔ کسی حقیقت کی نشان دہی کرنا یا اس کی تائید میں متعلقہ مواد درج کرنا کس اصول کے تحت مردود ٹھہرا؟ بیانات سرسید کے اپنے ہیں، جن پر میرا کوئی تبصرہ بھی شامل نہیں۔ حقائق حقائق ہی رہتے ہیں، ہمارے یا آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے بدل نہیں جاتے۔ باقی رہا خود ساختہ ہونے کا طعنہ، تو میں نے کبھی محقق ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں، نا قدین سے نبرد آزما ہونا میرا اصل کام نہیں۔

میں صرف حقائق تلاش کرتا ہوں اور اگر خدا تعالیٰ نے زندگی دی اور اس کو منظور ہوا تو آئندہ بھی حقائق پیش کرتا رہوں گا۔ ان سے اپنی پسند کے نتائج اخذ کرنا ہر ایک کا ذاتی فعل ہے۔

اور ہاں، ''اگر'' کی آڑ میں ایک الزام عائد کیا گیا۔ اس کے جواب میں میرا مطالعہ کہتا ہے کہ سرسید نے کانگرس کی مخالفت مرتے دم تک نہ چھوڑی۔ جہاں تک سرسید کے نظریہ قوم کا تعلق ہے تو میں کہوں گا کہ وہ آخری سانس تک اپنے نظریے پر قائم اور مستقل رہے۔ ان کا یہ نظریہ کیا تھا، اس کے لئے تاویل سازوں کی تحریروں کی بجائے ان کے اصل الفاظ کی جانب رجوع کیا جانا چاہیے۔ اگر کوئی سرسید کے الفاظ سے متفق نہیں تو اس میں میرا یا ابوسلمان کا کوئی قصور نہیں۔ ایسی صورت میں تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ دوسروں پر بہتان باندھنے کی بجائے حقائق کا سامنا کرتے ہیں۔

(ساحل، کراچی، جولائی ۱۹۹۸ء)

حوالہ جات

۱۔ مجموعہ لیکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک۔ نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء) ص ۴۴۲
۲۔ ایضاً ص ۳۱۲
۳۔ تہذیب کراچی (مارچ ۱۹۹۸ء) ص ۸۰
۴۔ سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے (خلیق احمد نظامی) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۳ء) ص ۴۴
۵۔ ساحل کراچی (جون ۱۹۹۸ء) ص ۴۰
۶۔ ایضاً ص ۴۳
۷۔ ایضاً ص ۴۳
۸۔ خود نوشت حیات سرسید (ضیاء الدین لاہوری) فضلی سنز کراچی (۱۹۹۸ء)
۹۔ ساحل کراچی (محولہ بالا) ص ۴۳
۱۰۔ ایضاً ص ۳۹
۱۱۔ خود نوشت افکار سرسید (ضیاء الدین لاہوری) فضلی سنز کراچی (۱۹۹۸ء)
۱۲۔ ساحل کراچی (محولہ بالا) ص ۴۸

علماء دیوبند اور سرسید احمد خاں

جریدہ ''الشریعہ'' کے شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء میں جناب مولانا محمد عیسیٰ منصوری کا ایک مضمون بعنوان ''علماء دیوبند اور سرسید احمد خاں'' مطالعہ میں آیا جو روزنامہ جنگ لندن میں مطبوعہ غلام ربانی صاحب کے ایک مضمون کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے جس میں یہ الزام لگایا گیا تھا کہ ''دیوبند فرقہ والوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے عین مقابل ایک مدرسہ کھول کر سرسید احمد خاں کی مخالفت کرنا شروع کر دی اور اس کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر کے اس کو نیچری کہنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم حاصل کرنا ناجائز قرار دے دیا۔'' اگرچہ مولانا موصوف نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ ''غلام ربانی صاحب کے یہ تینوں دعوے بالکل بے بنیاد، گمراہ کن اور سراسر غلط ہیں'' مگر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے پہلی دو باتوں کی وضاحت میں علیگ پارٹی کے پروپیگنڈا سے مرعوب ہو کر ایسا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا ہے جو حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا البتہ وہ انگریزی تعلیم کے حصول کو ناجائز قرار دینے کے الزام کا مناسب رد کرتے ہیں۔

مولانا موصوف نے الزام کنندہ کے الفاظ ''عین مقابل'' کے الفاظ کا غلط مفہوم لیا اور فرمایا کہ ''مدرسہ دیوبند علی گڑھ یونیورسٹی کے عین مقابل نہیں بلکہ تین سو میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں قائم کیا گیا'' حالانکہ اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ یہ مدرسہ علی گڑھ یونیورسٹی کے مقابلے میں ردعمل کے طور پر قائم کیا گیا۔ الزام کنندہ شعوری یا غیر شعوری طور پر غلام احمد پرویز سے متاثر دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان حضرت نے بھی اپنی ایک تحریر میں یہی غلط بات کہی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مدرسہ دیوبند علی گڑھ کالج کے قیام (۱۸۷۵ء) سے نو سال قبل ۱۸۶۶ء میں وجود میں آیا تھا۔ [1] اس وقت اس کالج کا منصوبہ سرسید کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ اس کا چرچا ان کے دورہ انگلستان ۷۰۔۱۸۶۹ء کے بعد ہوا۔ سرسید نے ۱۸۶۷ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں مدرسہ دیوبند کی پہلی سالانہ رپورٹ پر اپنا تبصرہ تحریر کیا۔ [2] پھر جولائی ۱۸۷۳ء کے ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسید نے اس مدرسہ کی ساتویں سالانہ رپورٹ پر ایک طویل تبصرہ شائع کیا جس میں انہوں نے علما کو جی بھر کر لتاڑا اور اسلامی مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم پر کڑے الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ [3] اس وقت سرسید کا تعلیمی منصوبہ زیرِ تکمیل تھا اور وہ اپنے نیچری عقائد کی بنا پر زور وشور سے تشہیر کر رہے تھے۔ ردِّ عمل کے طور پر علما کی طرف سے ایک استفتا شائع ہوا جس کی متعلقہ عبارت درج ذیل ہے:

''کیا فرماتے ہیں علماء دین اس امر میں کہ ان دنوں ایک شخص ان مدرسوں کو جن میں علوم دینی اور ان علوم کی جو دین کی تائید میں ہیں، تعلیم ہوتے ہیں، جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کان پور، ان کو برا کہتا ہے اور ان کی ضد میں ایک مدرسہ اپنے طور پر تجویز کرنا چاہتا ہے .... مسلمانوں کو ایسے مدرسے میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں؟'' [4]

اس استفتے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مدرسہ دیوبند علی گڑھ یونیورسٹی کے مقابلے میں قائم نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس علی گڑھ کالج مدرسہ دیوبند کے ''عین مقابل'' جاری کیا گیا۔ کالج کی تاریخ اجرا کے بارے میں سرسید فرماتے ہیں:

''۲۴ مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ ... مدرسہ کھولا گیا۔'' [5]

روز سالگرہ ملکہ معظمہ کا خاص موقع یونہی منتخب نہیں کیا گیا تھا بلکہ سرسید کی تمام تر تعلیمی کاوشیں اسی نکتے کے گرد گھومتی ہیں۔ علی گڑھ کالج کی بنیاد میں جو جذبہ کارفرما تھا، اسے سرسید کے ان الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

''ہمارے ملک کو، ہماری قوم کو اگر درحقیقت ترقی کرنی اور نی الواقع ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کا سچا خیر خواہ اور وفادار رعیت بننا ہے تو اس کے لئے

بجز اس کے اور کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ علوم مغربی و زبان مغربی میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرے۔'' [۶]

''اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجے کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔'' [۷]

کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے کے موقع پر وائسرائے کو پیش کردہ سپاس نامے میں اس کا مقصد یوں بیان کیا گیا:

''ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق و کارآمد رعایا بنانا اور ان کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیر خواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدر شناسی سے پیدا ہوتی ہے۔'' [۸]

کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک موقع پر یہ اعلان کیا:

''من جملہ کالج کے مقاصد اہم کے یہ مقصد نہایت اہم ہے کہ یہاں کے طلبہ کے دلوں میں حکومت برطانیہ کی برکات کا سچا اعتراف اور انگلش کیریکٹر کا نقش پیدا ہو اور اس سے خفیف سا انحراف بھی حق امانت سے انحراف کے مترادف ہے۔'' [۹]

سرسید کے دست راست نواب محسن الملک کا بیان ہے:

''یہاں کی مذہبی تعلیم تعصب سے پاک ہے، تفرقہ کو دور کرنے والی ہے، غیر مذہب والوں سے اتحاد اور دوستی رکھنے کی تعلیم دیتی ہے، گورنمنٹ کی اطاعت اور سچی خیر خواہی کو جز و اسلام بتاتی ہے۔'' [۱۰]

ایک اور موقع پر انہوں نے فرمایا:

''اس کا بیج تو بویا سرسید نے، اب جب کہ یہ پھلے پھولے گا اور اس میں

ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تہذیب، شائستگی، علمی قابلیت اور گورنمنٹ
کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی مثال ہوں گے تو اس
وقت گورنمنٹ انگریزی کی برکتوں اور آزادی کی بشارت دیتے پھریں
گے۔"[11]

سرسید کے بہت بڑے مداح الطاف حسین حالی بیان کرتے ہیں:

"سب سے زیادہ وفاداری اور لائلٹی کی مستحکم بنیاد جو سرسید کی مذہبی
تحریروں نے مسلمانوں میں قائم کی ہے وہ انگریزی تعلیم کی مزاحمتوں کو
دور کر کے ان کو عام طور پر اس کی طرف متوجہ کرنا اور خاص کر ان کی تعلیم
کے لئے محمڈن کالج کا قائم کرنا ہے جس کی رو سے نہایت وثوق کے
ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر اعلیٰ تعلیم مسلمانوں میں زیادہ پھیلتی
جائے گی، اسی قدر وہ تاج برطانیہ کے زیادہ وفادار اور گورنمنٹ کے
زیادہ معتمد علیہ بنتے جائیں گے۔"[12]

یہ ہے بانیان کالج کے اپنے الفاظ میں علی گڑھ کالج میں دی جانے والی تعلیم کے اغراض و مقاصد کا ایک خاکہ جسے سرسید کی تعلیمی جدوجہد کے حوالے سے مسلمانوں کے لئے ایک نعمت قرار دیا جاتا ہے، وہ تعلیم جو صرف اور صرف انگریزوں کی خیرخواہی، وفاداری، لائلٹی اور انگریزی برکات کے سچے اعتراف وغیرہ وغیرہ جذبات سے معمور ہو۔ غلامانہ ذہنیت کو تقویت پہنچانے والی اس کیفیت کو مسلمانوں کی ترقی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جہاں تک فتووں کی بات ہے، مولانا موصوف کا یہ بیان محل نظر ہے کہ "علماء دیوبند نے کبھی سرسید پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔" میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا درست نہیں۔ جو بات واقعی ہوئی، اس سے انکار کیوں؟ دراصل سرسید کے پیروکاروں نے ذرائع ابلاغ اور تعلیمی نصاب میں پروپیگنڈا کے اصولوں سے کام لے کر مسلمانوں کی ترقی اور بھلائی کے نام پر سرسید کی شخصیت کو اس قدر "صاف وشفاف" بنا دیا ہے کہ اس کے زیر اثر اچھے بھلے دانش ور بھی مرعوب ہو کر بات کرتے ہیں۔ صرف صاف وشفاف ہی نہیں، انہوں نے سرسید کو علمائے مقابلے میں مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ ان کے

حق میں ہم دردی کے جذبات ابھارے جائیں۔ اگر سرسید کے موجودہ پیروکار اُن کے مذہبی عقائد کو دانستہ چھپاتے ہیں یا ان سے اغماض برتتے ہیں یا ان پر عمل نہیں کرتے تو اس سے نہ تو اُس دور کی صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے جس میں یہ فتوے جاری ہوئے اور نہ سرسید اپنے عقائد سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

علمائے دیوبند کے سرسید کے خلاف کفر کے فتووں کے ذکر میں صرف ایک رسالہ ''نصرۃ الابرار'' کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں متعدد شہروں کے علمائے فتاویٰ درج ہیں۔ اگرچہ اس رسالے کا بنیادی مقصد سرسید کی انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں کے خلاف ردِ عمل ظاہر کرنا تھا مگر استفتا اور ان کے جوابات میں ان کے نیچری عقائد بھی زیر بحث آ گئے۔ اگر مولانا موصوف برطانوی ہند کے مختلف علاقوں کے علما کو، گو وہ مسلک دیوبند سے منسلک ہوں، علماء دیوبند قرار نہیں دیتے تو مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے مدرسین کو تو بہر حال ایسا تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس رسالے میں ضلع سہارن پور کے ذیل میں مولانا محمود حسن مدرس مدرسہ اسلامیہ دیوبند کے حوالے سے یہ تحریر ملتی ہے:

> ''فرقہ نیچریہ کے بارے میں جو کہ منکر نصوص قرآنی واحادیث نبوی و اجماع امت ہے، جو کچھ علماء معتبرین نے ارشاد فرمایا ہے، وہ امر حق موافق کتاب وسنت ہے''۔ (ص ۴۳)

اس مدرسے کے جن مدرسین نے اس تحریر کی تائید کی ہے ان کے نام: احمد حسن، محمد حسن اور عبداللہ خان ہیں۔ دیوبند کے علماء معتبرین نے فرقہ نیچریہ کے بارے میں جو ارشاد فرمایا وہ احمد حسن ولد مولوی محمد قاسم کے حوالے سے اس تحریر میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''فرقہ نیچری جو کہ اپنے آپ کو تابع سید احمد خاں بتلاتے ہیں، ہرگز ہرگز کوئی معاملہ ان سے جائز نہیں۔ بوجہ دعوائے اسلام ان کے دھوکا میں کوئی مسلمان نہ آوے۔ سید احمد خاں کے کفر کی بابت علماء گزشتہ نے پہلے بھی تحریر فرمایا ہے اور اب بھی جو کچھ علماء مذکورہ نے تحریر فرمایا، موافق قواعد شرع درست ہے۔ لاریب یہ شخص کافر ہے، اس کے کفر میں کوئی شک و شبہ نہیں'' (ص ۴۴)

اس کی تائید میں ''الجوابات المذکورۃ کلہا صحیحۃ'' کے الفاظ کے ساتھ محمد فضل عظیم خطیب دیوبند کا نام تحریر ہے۔

سرسید کے انتقال کو ایک صدی گزر چکی ہے۔ اس دوران مخصوص حلقے ان کی شخصیت کو جاذبِ نظر بنانے کے لئے ان کے چہرے پر نیا خول چڑھانے میں مصروف رہے۔ اس مقصد کے لئے خوب خوب جھوٹ بولے گئے اور ان کے عقائد پر دبیز پردوں کی تہیں ڈال دی گئیں۔ آج یہ عالم ہے کہ علما کے فتووں پر تو بڑی لعن طعن کی جاتی ہے، مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ فتوے ان کے کن کن عقائد کی ترویج کے ردِّعمل میں جاری ہوئے۔ حقائق کو بدنیتی سے دوسروں کی نظروں سے اوجھل رکھنا بھی جھوٹ کے زمرے میں آتا ہے۔ بہت کچھ سرسید کے نئے تراشیدہ بت کے پیچھے چھپ چکا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کے اصلی چہرے کو اجاگر کیا جائے۔ جو لاعلم ہیں، انہیں آگاہ کیا جائے کہ ان کے عقائد کیا تھے۔ پھر فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی کہ فتوے جائز تھے یا ناجائز۔ سرسید کے چند عقائد کا ذکر کیا جاتا ہے۔ انصاف سے بیان کیجیے کہ اگر آج کوئی شخص ان عقائد کی تبلیغ کرنے لگے تو مسلمانوں کا کیا ردِّعمل ہوگا؟

☆ فرشتے، جنات اور شیطان کوئی علیحدہ مخلوق نہیں۔ جنات کوئی غیر مرئی مخلوق نہیں بلکہ اس سے جنگلی اور وحشی انسان مراد ہیں۔ ابلیس کا کوئی خارجی وجود نہیں، یہ انسان میں وہ قوت ہے جو اسے سیدھے راستے سے پھیرتی ہے۔

☆ پیغمبروں پر وحی کسی فرشتے کے ذریعے سے نہیں آتی تھی بلکہ القا کی صورت میں نازل ہوتی تھی۔ ان کے دل میں جو بات پیدا ہوتی، وہ اس کو وحی والہام قرار دیتے تھے۔

☆ انبیاء کے علاوہ مقدس لوگوں پر بھی وحی آتی ہے۔ سرسید کے الفاظ میں: ''اگر وحی و الہام نہ تھا تو اور کیا تھا جس نے کالون اور لوتھر کے دل کو اس پرانے راستے سے پھیرا اور ہمارے ہی زمانے کے اس قابل تعظیم و ادب شخص بابو کشیب چندر سین کے دل کو خدائے واحد کی طرف موڑا اور سوامی دیانند سرسوتی کے دل کو مورتی پوجن سے پھیرا؟'' [۳۱]

(واضح ہو کہ موخرالذکر اس اسلام دشمن جماعت آریہ سماج کے بانی تھے جس نے برصغیر میں

شدھی تحریک چلائی اور جس نے بعد میں ''ہندو مہا سبھا'' اور ''راشٹریہ سیوک سنگھ'' کی صورت میں جنم لیا۔)

☆ معجزہ سے مراد اگر کوئی واقعہ مافوق الفطرت یا کسی خلاف عقل امر کا وقوع ہے تو کسی نبی سے کوئی معجزہ نہیں ہوا۔

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آتش نمرود سے صحیح سلامت نکل آنے کا واقعہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تقلید ہے۔ سرسید کے الفاظ میں:

''بے شک ان کے لئے آگ دہکائی گئی تھی اور ڈرایا گیا تھا کہ ان کو آگ میں ڈال کر جلادیں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ آگ میں ڈالے گئے، قرآن مجید سے ثابت نہیں ہے۔'' [۱۴]

''خدا نے ہم کو قانون فطرت یہ بتایا ہے کہ آگ جلانے والی ہے۔ پس جب تک یہ قانون فطرت قائم ہے، اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے۔'' [۱۵]

☆ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیان میں جادوگروں کی رسیوں کا سانپ بن جانا اور آپ کے عصا کا اژدہا بن کر ان کو نگل جانا محض نفس انسانی کی قوت کا ظہور تھا۔ وہ رسیاں اور لاٹھیاں لوگوں کو سانپ اور اژدہے ''معلوم'' ہوتی تھیں، حقیقت میں ایسا کچھ نہ ہوا۔

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ پیدا نہیں ہوے کیونکہ ایسا ہونا نیچر کے اصولوں کے خلاف ہے۔ سرسید کے الفاظ میں: ''حضرت مریم حسب قانون فطرت انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں۔'' [۱۶]

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر نہیں اٹھائے گئے بلکہ ''اپنی موت سے مرے۔'' [۱۷]

☆ سرسید کے الفاظ میں: ''شق قمر کا ہونا محض غلط ہے اور بانی اسلام نے کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا۔'' [۱۸]

(الشریعہ گوجرانوالہ، جون ۲۰۰۴)

حوالہ جات

۱۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند (سید محبوب رضوی) جید پریس دہلی (۱۹۷۷ء) ص ۱۵۵
۲۔ تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان (ڈاکٹر ایچ بی خان) الحمرا اکادمی کراچی (۱۹۹۸ء) ص ۲۸
۳۔ مقالات سرسید (جلد ہفتم) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۲ء) ص ۲۷۸
۴۔ سرسید احمد خاں، ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۷۷ء) ص ۱۳۲
۵۔ مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید، مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۳۰۵
۶۔ مقالات سرسید (جلد ہشتم) ص ۳۸
۷۔ ایڈریس اور اسپیچیں (مرتبہ نواب محسن الملک) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۹۸ء) دیباچہ ص ۲
۸۔ ایضاً ص ۳۲
۹۔ تذکرہ وقار (محمد امین زبیری) عزیزی پریس آگرہ (۱۹۳۸ء) ص ۲۱۲
۱۰۔ مجموعہ لیکچرز نواب محسن الملک، نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء) ص ۲۷۰
۱۱۔ ایضاً ص ۳۸۶
۱۲۔ مقالات حالی (حصہ اول) انجمن ترقی اردو کراچی (۱۹۵۵ء) ص ۲۱۶
۱۳۔ مقالات سرسید (جلد ۱۳) ص ۳۹۲
۱۴۔ تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) فیروز پرنٹنگ پریس لاہور (جلد ہشتم، ۱۹۲۱ء) ص ۲۰۸
۱۵۔ تحریر فی اصول التفسیر (سرسید احمد خاں) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۲ء) ص ۳۰
۱۶۔ تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (جلد دوم، ۱۸۸۲ء) ص ۳۶
۱۷۔ ایضاً ص ۳۹
۱۸۔ تصانیف احمدیہ (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (حصہ اول، جلد اول، ۱۸۸۳ء) ص ۲۱

سرسید مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی نظر میں

دارالعلوم دیوبند کے مجلّہ ''دارالعلوم'' کا ایک پرانا شمارہ فروری ۱۹۷۹ء مطالعہ میں آیا۔ اس میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب کا ایک مضمون ''سرسید میری نظر میں'' پڑھا تو صاحب مضمون کے ایک عجیب انکشاف پر چونک پڑا۔ جہاں تک نفس مضمون کا تعلق ہے اس میں مفتی صاحب سرسید کی حضرات سے بھی کئی قدم آگے دکھائی دے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے وقت کے حالات کو جواز بنا کر سرسید کے دینی خیالات کا نہایت دلفریب انداز میں بھرپور دفاع کیا ہے۔ ان کی بیان کردہ بہت سی باتیں غیر مصدقہ ہی نہیں بلکہ دلائل سے غلط ثابت ہوتی ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کی سرسید کے متعلق مندرجہ ذیل چند سطور پر غور فرمائیں کہ ان میں محض سرسید کی شان بلند کرنے کے لئے کس قدر گھپلے ہوئے ہیں:

> ''ان کے اعلیٰ کردار کے ثبوت کے لئے ایک ہی مثال کافی ہے کہ کالج کے قیام کے زمانے میں انہوں نے اپنے سفر وغیرہ کے لئے جو رقوم کالج فنڈ سے لی تھیں، اپنے لڑکے سید محمود کی ملازمت کے بعد ان کا پیسہ پیسہ کالج کو واپس کر دیا۔ میں تو ان کے کردار کی اس بلندی پر سر دھنتا ہوں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی انقلابی تعلیمی تحریک کو ذاتی منفعت کے لئے کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کا انتقال ایک دوست کے

مکان میں ہوا اور ان کی تجہیز وتکفین دوستوں کے روپے سے ہوئی۔
واللّٰھمّ اغفرہ۔ سرسید کی اسلامی حمیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت
ہوگا کہ جب ایک انگریز نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر ایک کتاب
لکھی اور حضورؐ کی ذات پر ناروا حملے کئے تو اس کو دیکھ کر تڑپ اٹھے اور
اس کے جواب میں ایک کتاب لکھی اور اپنا مکان فروخت کر کے اس
کتاب کو طبع کرایا۔" [1]

راقم کو سرسید کے اعلیٰ کردار کی نفی کرنا مقصود نہیں بلکہ اس امر سے اختلاف ہے کہ کردار کی بلندی ظاہر کرنے کے لئے گھڑے گئے واقعات کا سہارا لیا جائے۔ سید محمود کی ملازمت کے بعد کالج کے لئے کئے گئے سفر کے اخراجات کی رقوم واپس کرنے کے معاملے کا سرے ہی سے وجود نہیں۔ اس کی تردید خود سرسید کے درج ذیل الفاظ سے ہوتی ہے جنہیں ان کے مستند ترین تسلیم کئے جانے والے سوانح نگار الطاف حسین حالی نے ان کی سوانح "حیات جاوید" میں درج کیا ہے:

"مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لئے سفر کر سکتا
ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔" [2]

سرسید کی وفات کے ضمن میں مفتی صاحب نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنی "انقلابی تعلیمی تحریک" کو ذاتی منفعت کے لئے استعمال نہ کرنے کے سبب انتقال کے وقت سرسید کے ترکے میں اتنی بھی رقم نہ تھی کہ ان کی تجہیز وتکفین کا انتظام ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس قدر قلاش تو نہیں ہو چکے تھے۔ وہ گورنمنٹ برطانیہ کے دہرے پنشنر تھے، ایک ملازمت کی پنشن جس کے حق دار وہ انتقال سے بائیس برس پیشتر ۱۸۷۶ء میں قرار پائے [3] اور دوسری پنشن جنگ آزادی کے دوران انگریز آقاؤں کی خدمات انجام دینے کے عوض، جس کا ذکر خود سرسید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"اس کے عوض میں سرکار نے میری بڑی قدردانی کی، عہدہ

صدر الصدوری پر ترقی کی اور علاوہ اس کے دو سو روپیہ ماہواری پنشن
مجھ کو اور میرے بڑے بیٹے کو عنایت فرمائے اور خلعت پانچ پارچہ اور
تین رقم جواہر، ایک شمشیر عمدہ قیمتی ہزار روپیہ کا اور ہزار روپیہ نقد واسطے
مد خرچ کے مرحمت فرمایا۔'' ؎

ان کا مسلسل ذریعہ آمدن دونوں پنشنیں تھیں۔ صرف موخر الذکر پنشن کی رقم کی مقدار کا اس زمانے کے حساب سے تعین کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دو سو روپیہ ماہوار کس قدر امیرانہ پنشن تھی۔ مفتی صاحب کو چاہیے تھا کہ سرسید کے انتقال کے واقعے کو غیر حقیقی رنگ نہ دیتے بلکہ اس کا اصل پس منظر بیان کرتے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اپنے لائق و فائق فرزند ارجمند سید محمود کی موجودگی کے باوجود سرسید کا انتقال ایک دوست کے مکان میں ہوا اور ان کی تجہیز و تکفین دوستوں کے روپے سے ہوئی؟ وہ سید محمود جنھیں اپنی جگہ علی گڑھ کالج کا وارث بنانے کے لئے سرسید نے اپنے مخلص ترین رفیقوں سے اس قدر لڑائی مول لی کہ ان لوگوں کو کالج کی ترقی کی جدوجہد سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ سرسید کے بہت بڑے معتقد مولوی عبدالحق ان کے آخری ایام کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

'' کثرت شراب نوشی نے سید محمود کا دماغ مختل کر دیا تھا اور وہ عالم
دیوانگی میں ایسی حرکات کر بیٹھتے تھے جو کسی عنوان قابل برداشت نہیں
ہو سکتی تھیں۔ سرسید کو ناچار وہ گھر چھوڑنا پڑا جہاں وہ تیس سال سے
مسلسل رات دن کام کرتے رہے تھے، اور ایک غیر گھر میں ہنا کر پناہ
لینی پڑی۔'' ۵

میر ولایت حسین سرسید کے اپنے دوست کے گھر پہنچنے پر ان کے خدمت گاروں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

'' جس وقت سید صاحب کوٹھی پر پہنچے تو سید صاحب نے ایک آہ کھینچی
اور کہا کہ ہائے افسوس، ہم کو کیا معلوم تھا کہ سید محمود آخر عمر میں ہم کو گھر

سے نکال دیں گے ورنہ کیا ہم اس قابل نہ تھے کہ اپنے لئے ایک جھونپڑا بنا لیتے! " ۵

ان حالات میں کہ سرسید کی وفات ایک غیر گھر میں ہوئی جبکہ ان کے واحد وارث ان سے لاتعلق ہو چکے تھے، ان کی تجہیز و تکفین دوستوں کے روپے ہی سے ہو سکتی تھی۔ مفتی صاحب نے اس واقعے کو اور ہی رنگ دے کر اسے سرسید کی ذاتی منفعت سے بریت کے کھاتے میں ڈال دیا۔

اسی طرح سر ولیم میور کی کتاب کے رد میں اپنی کتاب طبع کروانے میں مفتی صاحب سرسید کی قربانی یہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے "اپنا مکان فروخت کر کے اس کتاب کو طبع کرایا"۔ صحیح صورت حال کے لئے ہم الطاف حسین حالی سے رجوع کرتے ہیں:

> "سرسید ولایت میں خطبات احمدیہ لکھ رہے تھے اور سید مہدی علی ہندوستان میں اس کے لئے میٹیریل (material) بھیجتے تھے۔ وہ ولایت میں اس کو چھپوا رہے تھے اور یہ ہندوستان میں اس کی چھپائی کے لئے چندہ وصول کر کر کے روانہ کرتے تھے۔" ۶

خدا جانے مفتی صاحب نے یہ نئی دریافت کہاں سے کی کہ سرسید نے کتاب چھپوانے کے لئے اپنا مکان بیچ دیا۔ ان کے بیان کردہ دیگر نکات پر بھی بحث کی بہت گنجائش ہے مگر اس سے گریز کرتے ہوئے ان کے مضمون میں درج دو واقعات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو بیان کنندگان کی تفصیلات کی روشنی میں من گھڑت ثابت ہوتے ہیں۔ ایک واقعے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> "صوبہ سرحد سے ایک پٹھان ان کے پاس ان کے مذہبی خیالات معلوم کرنے کے لئے آئے۔ سرسید نے ان سے گفتگو شروع کی ہی تھی کہ ایک جدید تعلیم یافتہ مسلمان بھی آ گئے۔ سرسید نے فوراً کہا" لیجئے، یہ آ گئے ہیں، آپ ان کو مطمئن کر دیجئے"۔ سرحدی پٹھان نے اس

نوجوان کی طرف رخ کیا لیکن اس کو مطمئن نہ کر سکا۔ جب وہ نوجوان
رخصت ہو گیا تو سرسید نے کہا ''جو عقائد آپ کے ہیں، وہی میرے
بھی ہیں لیکن میرے سامنے یہ سوال ہے کہ اس دور کے تعلیم یافتہ
مسلمان کو اسلام سے کیسے وابستہ رکھا جائے؟'' سرحدی پٹھان یہ سن کر
خاموش ہو گیا اور کہنے لگا ''میں آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آیا تھا اور
اب میں آپ کا ہم نوا ہو کر لوٹ رہا ہوں۔'' ۵

نہایت ہی مختصر طور پر بیان کردہ یہ واقعہ اس سے قبل 'برہان' دہلی کے شمارہ ۱۹۶۶ء میں ''سرسید احمد اور دیو بند'' کے عنوان سے بالتفصیل شائع ہو چکا ہے۔ مفتی صاحب محض یادداشت کے زور پر بیان کرتے ہوئے کچھ گڑبڑ کر گئے۔ یہ پٹھان نوجوان، جسے تفصیلی واقعے میں مُلا دوست محمد قندھاری بتایا گیا ہے، سرسید کے پاس صوبہ سرحد سے ان کے خیالات معلوم کرنے نہیں آیا تھا بلکہ دیو بند سے فارغ التحصیل ہو کر وہیں سے بقول خود ''ایک مضبوط لکڑی ہاتھ میں لے کر سرسید کا سر پھوڑنے کی غرض سے'' علی گڑھ گیا تھا قتل کرنے کی نیت سے نہیں۔ اصل واقعے میں بیان کردہ اہم نکتہ یہ ہے کہ اس سے قبل اس نے مولانا محمد قاسم نانوتوی سے سرسید کے خلاف اسلام عقائد کی نشان دہی کروائی تھی۔ راقم الحروف 'الحق' اکوڑہ خٹک کے شمارہ مارچ اپریل ۱۹۹۶ء میں اس واقعے کے مندرجات کو دلائل کی رُو سے غلط ثابت کر چکا ہے۔ (متذکرہ مضمون کتاب ہٰذا کے باب دوم میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے)

دوسرا واقعہ جس نے مجھے اصل میں چونکایا، اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''سرسید کے عقائد کی صحیح یا غلط شہرت کی وجہ سے مذہبی طبقہ ان سے سخت برہم تھا۔ امیر شاہ خاں کٹر قسم کے مذہبی نوجوان تھے اور دینی جذبات سے سرشار رہتے تھے۔ انہوں نے موقع پا کر اپنے پیر و مرشد حضرت (مولانا محمد قاسم) نانوتویؒ سے کہا ''حضرت! آپ اجازت دیں تو سرسید کا کام تمام کر دوں''۔ مولانا نے فرمایا ''ابھی ٹھہرو، عالم ربانی سے مشورہ کر لوں''۔ عالم ربانی سے مراد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے۔

مولانا نے ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا۔'' [9]

اس واقعے کی رو سے اکابرینِ دارالعلوم دیوبند کو بالواسطہ طور پر قاتلوں کا ایسا گروہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں دہشت گرد کہا جاتا ہے۔

اس واقعے کی جزئیات پر غور فرمایئے۔ امیر شاہ خاں نوجوان اپنے ''پیر و مرشد'' سے سرسید کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ روحانی پیشوا سے اس قسم کی گفتگو سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کی تربیت اس طرح کی گئی تھی کہ مذہبی اختلاف پر قتل کرنا اور کروانا ان لوگوں کا معمول تھا ورنہ مولانا نانوتوی سینہ طور پر یہ نہ کہتے ''ابھی ٹھہرو، عالم ربانی سے مشورہ کر لوں'' بلکہ اپنے مرید کو فوری طور پر ایسے ناجائز فعل سے باز رہنے کی تلقین کرتے۔ اس فقرے میں یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ بعض معاملات میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے مشاورت بھی کی جاتی تھی اور سرسید کے معاملے میں شاید اس وجہ سے اجازت نہ دی گئی کہ ان کو قتل کرنے سے حکومتی سطح پر زبردست ردِعمل کا خدشہ تھا۔

متذکرہ بالا تاثرات کی روشنی میں سوچنے کا مقام ہے کہ اس خودساختہ واقعہ کو بیان کر کے اکابرینِ دیوبند کو کس قماش کے مذہبی و روحانی پیشوا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟

(الحق اکوڑہ خٹک، اکتوبر ۲۰۰۲ء)

حوالہ جات

۱۔ ماہنامہ ''دارالعلوم'' دیوبند فروری ۱۹۷۹ء، ص ۲۶۔۲۷

۲۔ حیاتِ جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ اول، ص ۲۰۵

۳۔ مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید مطبوعہ مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۲۰۵

۴۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مطصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۶۰ء) حصہ اول، ص ۱۷

۵۔ سرسید احمد خاں، حالات و افکار (مولوی عبدالحق) انجمن ترقی اردو کراچی (۱۹۷۵ء) ص ۸۵

۶۔ میرے پچاس سال علی گڑھ میں (میر ولایت حسین) مطبوعہ کراچی، ص ۱۵۶

۷۔ حیاتِ جاوید (حصہ دوم) ص ۳۶۹

۸۔ ماہنامہ ''دارالعلوم'' (محولہ بالا) ص ۲۷

۹۔ ایضاً

سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم میں سرسید کا مبیّنہ حصہ

ماہنامہ ''الشریعہ'' کے گزشتہ شمارے میں دینی مدارس کے معاشرتی کردار کے حوالے سے کی جانے والی ایک بحث کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ بات جناب عطاء الحق قاسمی کے کالم میں منقول مولانا زاہدالراشدی کے بیان سے شروع ہوتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانانِ عالم کے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ جوابی بحث کرنے والوں نے اس موضوع کو صرف برِصغیر تک محدود کر دیا اور سرسید احمد خاں کو خواہ مخواہ بیچ میں لا کھڑا کیا کہ انہوں نے ''مسلمانوں کو جدید علوم سے روشناس کرنے کی ٹھانی اور (علما کی جانب سے) بدترین ظلم کا نشانہ بنے''۔ گویا کہ اگر یہ ''ظلم'' نہ ہوتا تو دنیا کے مسلمان اپنا جائز مقام ضروری طور پر حاصل کر لیتے اور مصائب و آلام کے اس دور سے نہ گزرتے جس سے دوچار ہیں۔

''مظلوم سرسید'' کے بارے میں یہ مسلک رکھنے والوں کا ارشاد سرآنکھوں پر کہ یہ ان کا قصور نہیں کیونکہ ہمارے تعلیمی نصاب اور ذرائع ابلاغ میں سرسید کے متعلق یہی کچھ بتایا جاتا ہے اور اس بات کی وضاحت نہیں کی جاتی کہ ان کی مبینہ تعلیمی جدوجہد کے پیچھے کیا جذبہ کارفرما تھا اور یہ کہ ان کی نظر میں جدید علوم کی تخصیص کیا تھی۔ کیا انہوں نے اپنے قائم کردہ مدرسۃ العلوم کے نصاب میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل کئے؟ تحقیق کیجئے تو معلوم ہو کہ سرسید آخر دم تک ٹیکنیکل تعلیم تک کے مخالف رہے۔ ان کے مدرسے کا آغاز ۱۸۷۵ء میں ہوا اور اس کے بائیس برس بعد بھی یعنی اپنے انتقال سے چند ماہ پیشتر تک وہ اس بات پر زور

دیتے رہے کہ "بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجے کی دماغی تعلیم کی اور اخلاق اور سوشل حالت کی درستی کی ہے"۔ [۱] ان کے سینہ جدید علوم وفنون کا حصہ دار بعد یہی نکتہ تھا کیونکہ کالج کے قیام میں جو مقاصد کارفرما تھے وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم سے قطعاً پورا نہ ہو سکتے تھے بلکہ "اعلیٰ درجے کی دماغی تعلیم" ہی کے ذریعے ممکن تھے۔ وہ مقاصد کیا تھے؟ اس کا پتہ ہمیں نصابی دانش وروں یا ذرائع ابلاغ کے تصوراتی تخلیق کاروں کی بجائے سرسید اور ان کے رفقا کے اصل بیانات اور ان کی تحریروں میں ملے گا جن کا ذکر ہمارے تعلیمی نصاب اور ذرائع ابلاغ میں ممنوع ہے۔

کالج کا سنگِ بنیاد رکھنے کے موقع پر وائسرائے کو جو سپاس نامہ پیش کیا گیا، اس میں "بانیان کالج کی نگاہ میں نمایاں مقاصد" کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ اس کا ایک اہم مقصد "ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق و کارآمد رعایا بنانا ہے"۔ [۲]

کالج کے ٹرسٹیوں نے ایک موقع پر اعلان کیا کہ "من جملہ کالج کے مقاصد اہم کے یہ مقصد نہایت اہم ہے کہ یہاں کے طلبہ کے دلوں میں حکومت برطانیہ کی برکات کا سچا اعتراف اور انگلش کیرکٹر کا نقش پیدا ہو"۔ [۳]

سرسید نے اپنے ایک خطاب میں بیان کیا کہ "اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو"۔ [۴]

ایک اور موقع پر انھوں نے کہا کہ "میرا سب سے بڑا مقصد کالج کے قائم کرنے سے یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور انگریزوں میں دوستانہ راہ و رسم پیدا ہو اور آپس کا تعصب اور نفرت دور ہو"۔ [۵]

یہ مقصد وقتی نہیں تھا، سرسید عمر بھر اسی دھن میں مگن رہے۔ ان کے عظیم رفیق کار اور سوانح نگار الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

> "ان کا مقصد محمڈن کالج قائم کرنے سے صرف یہی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اولاد اس میں تعلیم پائے بلکہ سب سے بڑا مقصد جو ۱۸۵۷ء سے لے کر آخر عمر تک ان کے پیش نظر رہا، یہ تھا کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں یک جہتی، میل جول اور اتحاد و ترقی ہو"۔ [۶]

چہ اس مقصد کو محض الفاظ تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس کی باقاعدہ تربیت دی جاتی رہی۔ طلبہ کے لئے بورڈنگ ہاؤس میں رہائش اسی وجہ سے ضروری قرار دی گئی تھی اور یہ جگہ ان کے لئے عملی تربیت گاہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ مولانا حالی بیان کرتے ہیں:

''شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت وفرمانبرداری، جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے، اس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہیں، ظاہراً ہندوستان کے کسی انسٹی ٹیوشن میں موجود نہیں ہیں۔'' [۷]

سرسید کے دستِ راست نواب محسن الملک اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

''ایک بورڈر، جب مدرسۃ العلوم کی چار دیواری میں قدم رکھتا ہے، اپنے تئیں نئی آب وہوا اور ایک نئی زندگی میں پاتا ہے اور اپنے گرد وپیش کی تمام چیزوں میں زندہ دلی اور شگفتگی اور حرکت اور جوش دیکھتا ہے۔ اس کے کانوں میں ہر طرف سے محبت، ہمدردی اور گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی کی آوازیں آتی ہیں۔'' [۸]

سرسید نے جو بیج بویا اس کی توصیف بیان کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں:

''وہ اپنی قوم میں وفاداری، اخلاص اور اطاعت کے ہمیشہ کے لئے بیج بوگیا ہے۔ وہ ان کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا بارآور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری وفرمانبرداری ہے۔'' [۹]

اسی مفہوم کو نواب محسن الملک نے ان الفاظ میں بیان کیا:

''اس کا بیج تو بویا سرسید نے، اب جب کہ یہ پھلے پھولے گا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تہذیب، شائستگی، علمی قابلیت اور گورنمنٹ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی مثال ہوں گے تو اس وقت گورنمنٹ انگریزی کی برکتوں اور آزادی کی بشارت دیتے پھریں گے۔'' [۱۰]

درج بالا حقائق کو جان کر بھی اگر کوئی یہ کہے کہ سرسید کی تعلیمی جدوجہد — جس کے پیچھے اول مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانا تھا تو اسے حسن ظن ہی کہا جا سکتا ہے۔ چلیے ایک لمحے کے لئے یہ تصور کر لیتے ہیں کہ برصغیر کے علما نے سرسید پر واقعی "ظلم" کیا اور ان کی تعلیمی کاوشوں کو ملیا میٹ کرنا چاہا تو کیا وہ اس میں کامیاب ہوئے؟ قطعاً نہیں۔ ان کے جاری کردہ سکول نے پہلے کالج کی سطح تک ترقی کی اور پھر ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی صورت اختیار کر گیا۔ ہزاروں مسلمان طلبہ اس سے فیض یاب ہوئے۔ انہوں نے کسی مولوی کے کہنے پر وہاں دی جانے والی تعلیم سے منہ نہیں موڑا۔ اس کے باوجود برصغیر کے مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ گئے۔ کیا دنیا کے دیگر اسلامی ممالک کے سرسید بھی اپنے اپنے ہاں کے مولویوں کے "بدترین ظلم" کا نشانہ بنے جو وہ ملک بھی ترقی کی منازل طے نہ کر سکے؟ ترکی کے بارے میں کیا رائے ہے کہ وہاں سرسید سے ہزار گنا ترقی پسند مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو جیسے افراد حکمران ہوئے جنہوں نے مولویوں کی پیداوار کا قلع قمع کر کے اپنے ملک کو الف سے یا تک یورپین بنا دیا۔ وہاں کے مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں کس قدر ترقی کی اور اپنی قوم کو کون سا جائز مقام دلا دیا جو ہم آج تک نہیں حاصل کر پائے؟

(الشریعہ گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۰۳ء)

حوالہ جات

۱۔ سرسید کے آخری مضامین (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۱۳۱
۲۔ بحوالہ دی لائف اینڈ ورک آف سرسید (گراہم) ہیڈر اینڈ سٹفٹن لندن (۱۹۰۹ء) ص ۱۷۹
۳۔ بحوالہ تذکرہ وقار (محمد امین زبیری) عزیزی پریس آگرہ (۱۹۳۸ء) ص ۲۱۲
۴۔ روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۵ء) ص ۱۷۰
۵۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز (سرسید) مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۴۳۰
۶۔ حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کانپور (۱۹۰۱ء) حصہ اول ص ۲۹۲
۷۔ ایضاً (حصہ دوم) ص ۹۲
۸۔ مجموعہ لیکچرز و اسپیچز (نواب محسن الملک) نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء) ص ۳۶۶
۹۔ مقالات حالی (حصہ دوم) مطبوعہ دہلی (۱۹۳۶ء) ص ۴۸
۱۰۔ مجموعہ لیکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک ص ۳۸۹

سرسید غریب کیوں کشتنی و گردن زدنی؟

روز نامہ ''دن'' کی گزشتہ دو اشاعتوں میں پیام شاہ جہان پوری نے اپنے کالموں میں ''سرسید احمد خاں کا گناہ'' کے زیرِ عنوان ایک اہم نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اگر اسے گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو یہ ان لوگوں کے لئے جو سرسری مطالعے کی عادت رکھتے ہیں، برین واشنگ کی ایک دانستہ کوشش محسوس ہوتی ہے جبکہ تحقیقی مزاج رکھنے والوں کے نزدیک ان کے نتائج محض الفاظ کی ہیرا پھیری ہیں۔ موصوف اس سے پیشتر بھی متعدد بار اس موضوع پر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ان کی مقالہ نما تحریر کا خاص پہلو اُن کا تحقیقی انداز ہے۔ انہوں نے ایسے فتوے پیش کئے ہیں جن میں ایک مخصوص ٹولے کے قوم دشمن کرتوت بظاہر جائز دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل وہ اپنی طرف سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انگریزی حکومت کی مخالفت شرعاً حرام تھی۔ دوسرے الفاظ میں برصغیر کے مسلمانوں نے آزادی کی خاطر انگریزوں کے خلاف جو قربانیاں دیں وہ ان کا ایک ناجائز فعل تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف بات کرنے سے گریزاں ہیں ورنہ ان کی نام نہاد تحقیق سے واضح طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں پاکستان کا قیام، جس کا حصول بہرحال انگریزی حکومت کی مخالفت کے بغیر ممکن نہ تھا، ناجائز ذریعے سے عمل میں آیا۔ راقم ان کی تحریر کو حسبِ سابق نظر انداز کر دیتا مگر انہوں نے جو آخر میں سوالیہ چیلنج کر ڈالا کہ ''کیا کسی کے پاس ان حقائق کا جواب ہے؟'' اس نے مجبور

کیا کہ موصوف کی مبینہ تحقیق کاوشوں کا اصل پس منظر پیش کیا جائے تاکہ سادہ لوح قارئین چیلنج کا جواب نہ پاکر ان کی باتوں کو حقیقت نہ سمجھ بیٹھیں۔ اخباری کالموں کی تنگ دامنی پیش نظر ہے، جواب میں اختصار کی انتہائی کوشش کے باوجود حقائق کی وضاحت میں ہلکی سی طوالت مجبوری ہے۔ (گو تشنگی پھر بھی محسوس ہوگی کیونکہ محدود ضخامت کے باعث مسئلہ کے ہر پہلو پر بحث ممکن نہ ہو سکے گی) ورنہ راقم کے پاس اس قدر مواد موجود ہے کہ موصوف کے زیر تسلط جریدے "تقاضے" کے بار بار شائع ہونے والے "۱۸۵۷ء کا جہاد نمبر" کے جواب میں کئی گنا ضخیم نمبر تیار کئے جا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ بات غور طلب ہے کہ موصوف کو اس دور میں جبکہ برصغیر میں انگریزوں کی غاصب حکمرانی کا نظریہ قبول کیا جا چکا ہے اور ۱۸۵۷ء کی جدوجہد "جنگ آزادی" تسلیم کی جاتی ہے، انگریزوں کی حکومت کو جائز ثابت کرنے کی اب کیا ضرورت پیش آگئی! وہ اپنے نظریے کے جواز میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے علما کے فتاویٰ پیش کرتے ہیں اور ہوشیاری یہ دکھاتے ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل ادوار کے مختلف حالات کے پس منظر میں تحریر کئے گئے فتووں کے نتائج کو زبردستی پیچھے لے جا کر ۱۸۵۷ء پر منطبق کر دیتے ہیں۔ وہ اس جدوجہد کو "فساد" قرار دینے والوں کی شان میں پورے جوش سے رطب اللسان ہیں اور ان کے لئے بڑے معزز القابات تحریر کرتے ہیں۔ وہ ایسے فتوے دینے والے علماء کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں ممتاز دینی شخصیت، جید عالم، اکابرین، فاضل علماء، بزرگ، شیخ الکل اور بے نفس عالم وغیرہ وغیرہ خطابات سے نوازتے ہیں۔

موصوف نے اپنے مسلک کی حمایت میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی ممانعت کے حق میں جن نکات کی نشان دہی کی ہے ان کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں بحث کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ وہ ان فتووں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان حکومت انگریزی سے وفاداری کا عہد و پیمان کر چکے تھے۔ اس لئے ان کی مخالفت کسی صورت

نہیں رہتے تھے۔ کون سا عہد و پیمان؟ کس نے کس حیثیت سے یہ عہد و پیمان کیا؟ کہاں کوئی معاہدہ ہوا؟ اس معاہدے کی شرائط کیا تھیں؟ کیا یہ انتظامی نوعیت کا معاہدہ تھا یا اس میں یہ شق بھی شامل تھی کہ ہندوستانی مسلمان انگریزوں کو باضابطہ حکمران تسلیم کرتے ہیں اور وہ ان کے وفادار رہیں گے؟ بالفرض محال اگر کسی معاہدے کی خبر گھڑ بھی لی جائے تو کیا انگریزوں نے خود اس معاہدے کی پاسداری کی یا حدود سے تجاوز کیا؟ اور کیا حدود تجاوز کرنے پر معاہدے برقرار رہتے ہیں؟ پھر جن ادوار میں مبینہ فتوے لکھے گئے، کیا ان میں کوئی معاہدے زیرِ عمل تھے؟ انگریزوں کے مقابلے میں فریق ثانی کون تھا اور کس بنیاد پر وہ فریق برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق دار قرار پایا تھا؟ کیا استفتا پیش کرنے والوں اور فتوے دینے والوں نے اپنے سوال و جواب میں مسئولہ نکات کو واقعی مدِنظر رکھا؟ صرف یہ کہہ دینے سے کہ "انگریزی حکومت اور رعایا کے درمیان ایمان و پیمان موجود ہے" بات نہیں بن جاتی۔ ان تمام نکات پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر موجودہ نشست میں ان تمام باتوں پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ ماضی کے تصوراتی عہد و پیمان کی بات کریں تو کل کلاں اگر ہماری کوئی اقلیت خدانخواستہ ہمارے کسی دشمن سے اپنی غلامی کا کوئی معاہدہ کر لے تو کیا پاکستانی مسلمانوں پر اس کی پابندی واجب ہو جائے گی؟

ایک بات راقم کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آ سکی کہ موصوف ایک خاص مسئلہ کے ضمن میں سرسید کے دفاع میں تو بہت فعال دکھائی دیتے ہیں مگر اس بحث میں مرزا غلام احمد قادیانی کا نام تک بھی نہیں لیتے حالانکہ سرسید کی طرح مرزا صاحب بھی بہت مطعون ہیں۔ وہ بھی تو اس معاملے میں اسلام کا نام لے کر وہی کچھ کہتے رہے جو سرسید نے فرمایا تھا مگر موصوف ان کے دفاع میں آگے نہیں آتے۔ اسے تجاہلِ عارفانہ کا نام دیا جائے یا کوئی خاص مصلحت؟ ایک ہی مسلک کے نہایت ہی قابلِ احترام علماء کے متضاد فتوؤں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں البتہ کسی فتوے کے نتائج سے اتفاق یا اختلاف سے قطع نظر یہ امر مسلّم ہے کہ موصوف کے پیش کردہ

فتووں کی عبارت ان مغلظات اور لعن طعن سے یکسر خالی ہے جو سرسید اور مرزا قادیانی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ موصوف "۱۸۵۷ء کا جہاد" یا "سرسید احمد خاں کا گناہ" کے عنوانات کے تحت جب بار بار انہی فتووں کا سہارا لیتے ہیں تو یہ شک قوی ہو جاتا ہے کہ سرسید کے دفاع کی آڑ میں اصل مقصود مرزا غلام احمد قادیانی کو بچانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں اشخاص اس مسئلے پر "متفق علیہ" اور حیران کن حد تک ہم آہنگ و ہم زبان تھے۔ اس موضوع پر ان کے اقوال زبان و بیان کی بندش اور طرزِ تحریر کے اعتبار سے اس قدر یکساں ہیں کہ بعض اوقات ان کی بناوٹ ایک ہی کارخانے کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بات اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک کہ موصوف کے القابات یافتہ علماء کے فتووں کے مقابلے میں ان دونوں کی یک زبانی کے نمونے پیش نہ کئے جائیں جن کی پردہ پوشی کی خاطر لوگ تحقیق کے نام پر بڑے بڑے پرفریب جال بنتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے موضوع پر ان حضرات کے اقوال کا ایک خاکہ ملاحظہ فرمائیں:

قولِ سرسید:

"ہر ضلع میں پاجی اور جاہلوں کی طرف سے جہاد کا نام ہوا..... اس زمانہ میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا، ایسے خراب اور بدرویہ اور بداطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے اور کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔"[1]

قولِ مرزا قادیانی:

"۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ بجز بدچلنی اور فسق و فجور کے اسلام کے رئیسوں کو اور کچھ یاد نہ تھا۔"[2]

قولِ سرسید:

"اس ہنگامہ میں نہایت بدمعاش اور جاہل بے علم آدمی، جو مولوی کے نام سے مشہور تھے..... ان کو تمام اخباروں میں اس طرح پر چھاپا گیا جیسے کہ کوئی سچ مچ کا مولوی اور

مسلمانوں کا بڑا عالم اور بڑا خدا پرست ہے حالانکہ وہ لوگ محض جاہل اور بے علم اور واہی آدمی تھے۔ کوئی مسلمان ان کو اچھا نہیں جانتا تھا اور ان میں سے کوئی شخص مسلمانوں میں مذہب کی باتوں میں مقتدا اور پیشوا اور مولوی نہ تھا۔ جس قدر کہ اچھے اور خدا پرست اور سچ مچ کے مولوی اور درویش تھے، ان میں سے کوئی شخص اس فساد میں شریک نہیں ہوا۔'' ۳

قولِ مرزا قادیانی:

''۱۸۵۷ء میں جو کچھ فساد ہوا اس میں بجز جہلا اور بدچلن لوگوں کے اور کوئی شائستہ اور نیک بخت مسلمان جو باعلم اور باتمیز تھا، ہرگز مفسدہ میں شامل نہیں ہوا۔'' ۴

قولِ سرسید:

''اس ہنگامہ میں کوئی بات بھی مذہب کے مطابق نہیں ہوئی ہاں، البتہ چند بدذاتوں نے دنیا کی طمع اور اپنی منفعت اور اپنے خیالات پورا کرنے کے اور جاہلوں کے بہکانے کو اور اپنے ساتھ جمعیت جمع کرنے کو جہاد کا نام لے دیا۔ پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرامزدگیوں میں سے ایک حرامزدگی تھی، نہ واقع میں جہاد۔'' ۵

قولِ مرزا قادیانی:

''جب ہم ۱۸۵۷ء کی سوانح کو دیکھتے ہیں اور اس زمانہ کے مولویوں کے فتووں پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے عام طور پر مہریں لگا دی تھیں کہ انگریزوں کو قتل کرنا چاہیے تو ہم بحر ندامت میں ڈوب جاتے ہیں کہ یہ کیسے مولوی تھے اور کیسے ان کے فتوے تھے جنہیں نہ رحم تھا نہ عقل تھی، نہ اخلاق نہ انصاف! ان لوگوں نے چوروں اور قزاقوں اور حرامیوں کی طرح اپنی محسن گورنمنٹ پر حملہ کرنا شروع کیا اور اس کا نام جہاد رکھا۔'' ۶

قولِ سرسید:

''یہ ہنگامہ فساد جو پیش آیا صرف ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال تھا تم نے بھی خدا کا شکر ادا نہیں کیا اور ہمیشہ ناشکری کرتے رہے، اس لئے خدا نے اس ناشکری کا وبال تم ہندوستانیوں پر ڈالا۔'' ۷

قول مرزا قادیانی:

''۱۸۵۷ء میں مفسدہ پرداز لوگوں کی حرکت کو خدا نے پسند نہیں کیا اور آخر طرح طرح کے عذابوں میں وہ مبتلا ہوئے کیونکہ انہوں نے اپنی محسن اور مربی گورنمنٹ کا مقابلہ کیا۔'' ۸

اس کے علاوہ سرسید نے اپنی تصانیف میں بار بار مجاہدین کو مفسد، حرام زادہ، نمک حرام، غنیم، دشمن، غدار، کافر، بے ایمان، بدذات، بدمعاش وغیرہ ناموں سے پکارا۔ میں یہاں محترم موصوف ہی کے انداز میں یہ دہائی دینے کی جسارت کرتا ہوں کہ کیا متذکرہ علماء کے فتووں کی زبان بھی ایسی گندی تھی؟ لوگو! انصاف کرو، انصاف!

موصوف کالم نگار ایک جگہ فرماتے ہیں: ''یہی مؤقف سرسید احمد خاں کا تھا کہ سلطنت برطانیہ میں مسلمان امن وامان کی زندگی گزار رہے ہیں اور انگریزی حکومت ان کی دینی و معاشرتی امور میں کوئی مداخلت نہیں کرتی اس لئے انگریزوں کے خلاف جہاد جائز نہیں''۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ سرسید کے اس موقف کو بیان کرتے ہوئے موصوف نے بددیانتی سے کام لیا ہے، ممکن ہے کہ ان کا مطالعہ سرسید نامکمل ہو کیونکہ سرسید اس معاملے میں مسلمانوں کے خلاف نہایت سخت رویہ رکھتے تھے۔ ایڈیٹر پائونیر کے نام ایک مکتوب میں انہوں نے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''اگر بالفرض گورنمنٹ انگریزی کی جانب سے کچھ دست اندازی بھی ہو تو ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ جائیں، نہ کہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں بغاوت اختیار کریں''۔ ۹

اس سے بھی بڑھ کر وہ اپنی تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

> ''جو لوگ اس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا اعلانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور اگر بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو

تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی
اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں''۔ [۱۱]

غور فرمائیں کہ انگریز ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ دست اندازی کریں بلکہ بوجہ اسلام ان پر ظلم کریں تو بھی سرسید مسلمانوں کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دیتے۔ کیا موصوف کے پیش کردہ علما کے فتووں میں مسلمانوں کو اس قدر بے غیرت بن جانے کی کوئی دلیل ملتی ہے؟ لوگو! انصاف کرو، انصاف!

آخر میں اس قدر عرض کروں گا کہ موصوف خود علماء کے فتووں کی عبارت کا سرسید کی تحریروں سے موازنہ کریں (سرسید کے ''جاسوسی کارناموں'' کا میں نے ابھی ذکر نہیں کیا) اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ کس نے کس حد تک قوم دشمنی یا غداری کا ارتکاب کیا۔ موصوف بار بار اس بات کا گلہ کرتے ہیں کہ صرف ''سرسید غریب کیوں کشتنی و قابل گردن زدنی؟'' تو عرض ہے کہ اس قبیل میں مرزا قادیانی، میر جعفر، میر صادق بھی شامل کئے جاتے ہیں حالانکہ یہ لوگ موصوف کے بیان کردہ شرعی تقاضوں کی روشنی میں سرسید سے کہیں زیادہ انگریزوں کے ''باعمل'' وفادار ثابت ہوئے تھے۔ کیا ایسی صورت میں موصوف پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ وہ ان اشخاص کے بھی دفاع کا فریضہ انجام دیں، بھرپور کالم لکھیں اور ''ثواب دارین'' حاصل کریں؟

(دن لاہور: ۲۳۔۲۴ مئی ۲۰۰۲ء)

حوالہ جات

۱۔ اسباب سرکشی ہندوستان (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۹ء) ص ۶۔۷

۲۔ ازالہ اوہام (مرزا غلام احمد قادیانی) مطبع ریاض ہند امرتسر (۱۸۹۱ء) ص ۴۲۲

۳۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) حصہ اول، ص ۱۰

۴۔ براہین احمدیہ (مرزا غلام احمد قادیانی) مطبوعہ لاہور (۱۹۷۰ء) حصہ سوم، ص ۶۸

۵۔ اسباب سرکشی ہندوستان، ص ۷

۶۔ ازالہ اوہام، ص ۳۳۷

۷۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۱۳۱۔۱۳۲

۸۔ تحفہ قیصریہ (مرزا غلام احمد قادیانی) مطبع ضیاء الاسلام قادیاں (۱۸۹۷ء) ص ۱۱

۹۔ مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین) یونین پرنٹنگ پریس دہلی (۱۹۶۰ء) ص ۶۶

۱۰۔ تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۳ء) جلد اول، ص ۲۳۹

جنگِ آزادی کے پرستاروں پرتنقید کی مہم

جناب پیام شاہ جہان پوری نے روزنامہ ''دن'' کی اشاعت ہائے ۲۴ر اور ۲۵ر اگست ۲۰۰۲ میں مطبوعہ اپنے کالموں میں جواب الجواب کے ساز وسامان کے ساتھ مسلح ہو کر ایک بار پھر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو فتنہ وفساد قرار دیا ہے۔ انہوں نے مجھ غریب کو احتساب کے کٹہرے میں کھڑا کر کے اول الزام یہ عائد کیا ہے کہ ان کے ایک کالم ''سرسید کا گناہ'' کے جواب میں میرا جو مضمون شائع ہوا، اس میں متعدد کتابوں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ''مگر حرام ہے جو کسی ایک اقتباس کے نیچے حوالہ دیا ہو''۔ وہ مجھ پر حسب توفیق خوب خوب برسے ہیں اور میرے انداز تحقیق کو ''سبحان اللہ'' کے زمرے میں ڈالتے ہوئے تان اس ضرب المثل پر توڑی ہے:

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا کار طفلاں تمام خواہد شد

میں ان کے ادب پارے کی تصوراتی رفعت پر انہیں مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں مگر کیسے بتاؤں کہ میں اس معاملے میں بے اختیار تھا۔ موصوف ایک سینئر صحافی، کالم نگار اور مدیر کہلاتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اخبار یا جرائد اپنی پالیسی کے تحت مستقل قلم نگاروں کو گاہے گاہے لکھنے والوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ موصوف کی صحافیانہ زندگی میں خود ان کے قلم سے مجھ جیسے کتنے گمنام قارئین کی تحریریں ادارتی کتر بیونت کی زد میں آئی ہوں گی۔ یہ ملزم اپنی صفائی میں صرف

اسے خود اس کیفیت پر دکھ ہوا تھا، لہٰذا مجبوراً اس مضمون کی فوٹو سٹیٹ نقل اکوزہ خنک کے اس جریدے میں اشاعت کے لئے بھیجنا پڑی جس کا ذکر موصوف نے اپنے ایک حوالے میں کیا ہے۔ یہ تمام حوالے سند کے طور پر مضمون کے ساتھ جون ۲۰۰۲ء کے شمارے میں شائع ہو چکے ہیں اور وہاں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ کاش! موصوف مجھ پر الزام عائد کرنے سے پہلے اپنے صحافتی تجربے کو ذہن میں لاتے ہوئے ذاتی مراسم سے اس امر کی تصدیق کر لیتے کہ حوالے کہیں ادارتی معمولات کی نذر تو نہیں ہو گئے۔

موصوف راقم کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ''مضمون نگار نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں نے انگریز کے خلاف بغاوت کو ناجائز'' ثابت کر کے'' آزادی کے لئے ملی تحریکات کو، جس میں تحریک پاکستان بھی شامل ہے، ناجائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ یہاں بھی موصوف نے حقیقت حال کے اظہار سے اغماض برتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کو حرام یا ناجائز میں نے ثابت نہیں کیا ہے بلکہ یہ ان علمائے دین نے ثابت کیا ہے جن کے فتوے ہم نے اپنے مضمون میں پیش کئے ہیں۔''

یہاں موصوف نے لفظی رد و بدل سے کام لیا ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ موصوف ''اپنی طرف سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں''، انہوں نے یوں تاثر دیا کہ میں نے ان کی طرف سے بغاوت کا ناجائز'' ثابت کرنا'' تسلیم کر لیا ہے۔ '' ثابت کرنا چاہنے'' اور '' ثابت کرنے'' میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ صورت اول میں صرف خواہش ہوتی ہے جبکہ صورت دوم میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ موصوف حقیقتاً کچھ ثابت نہیں کر سکے محض فتوے پیش کئے ہیں اور فتویٰ کسی مسئلے پر مفتی یا عالم کے اپنے ذہن کے مطابق اس کے مسلک کی صرف ترجمانی ہوتی ہے۔ بعض مسئلوں پر تو ایک ہی مسلک کے علما مختلف آراء کا اظہار کرتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں، لہٰذا ان سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اگر موصوف کے منتخب کردہ علماء کے فتووں

سے انہیں آقا و مولی ثابت ہو جاتے ہیں تو جن علماء نے انگریزوں کے خلاف فتوے دیے انہیں ثبوت کیوں نہیں مانا جاتا؟ موجودہ بحث سے اگر کوئی بات ثابت ہوتی ہے تو صرف یہ کہ فتوے انگریزوں کے حق میں بھی دیے گئے تھے اور ان کے خلاف بھی۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے جب موصوف کہتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کو حرام یا ناجائز انہوں نے نہیں بلکہ علمائے دین نے ثابت کیا ہے تو عرض ہے کہ ان کا ایسے فتوے بار بار پیش کرنا چہ معنی دارد؟ موصوف انہیں تسلیم کرتے ہیں، ان پر اصرار کرتے ہیں، انہیں ثبوت بھی کہتے ہیں اور آگے پیش کر دیتے ہیں تو بلا شک وشبہ یہ بات ان کی بھی ہوگئی کہ آزادی کے لئے ملی تحریکات، جس میں تحریک پاکستان بھی شامل ہے، حرام تھیں اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو تو موصوف خود اپنے الفاظ میں صاف صاف ''۱۸۵۷ء کے تلنگوں کی وحشیانہ بغاوت'' قرار دے ہی چکے ہیں۔

اس کے بعد موصوف راقم کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''آپ کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہم نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے مختلف حالات کے پس منظر میں تحریر کئے ہوئے فتووں کے نتائج کو زبردستی پیچھے لے جا کر ۱۸۵۷ء پر منطبق کر دیا ہے''۔

میرا یہ کہنا غلط ہے یا صحیح، پہلے اپنی تحریر پر غور فرمائیں۔ موصوف نے لکھا تھا:

> ''سرسید احمد خاں زیرک انسان تھے، علوم دینیہ سے واقف بھی تھے۔ بلاشبہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو جہاد قرار نہیں دیا بلکہ فساد قرار دیا مگر کیا اس فکر اور سوچ میں وہ تنہا تھے؟ ''اس دور'' کا کون سا مسلمان فرقہ ایسا تھا جس کے اکابر علماء نے انگریز کے خلاف ''اس بغاوت'' کی مذمت نہ کی ہو، بلکہ ان اکابر علماء نے تو ''اس بغاوت'' میں شرکت کو حرام قرار دیا چنانچہ......''

اس کے بعد انہوں نے اپنی بات ثابت کرنے کے لئے مختلف مسالک کے علما کے فتووں کی عبارتیں پیش کی ہیں۔

موصوف کی اس عبارت پر غور فرمایئے! اس میں ۱۸۵۷ء کے حوالے سے یہ تاثر دیا گیا ہے کہ ''اس دور'' کے تمام فرقوں کے اکابر علماء نے انگریز کے خلاف ''اس بغاوت'' (یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی) کی مذمت کی جبکہ ان کی اس عبارت والے مضمون میں ان کے نقل کردہ فتووں کی تمام عبارتیں متذکرہ بغاوت کے ذکر سے قطعاً خالی ہیں۔ یہ تمام عبارتیں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی تحریر کردہ ہیں اور انہی ادوار سے متعلق ہیں۔ میں اپنے دعوے پر اب بھی قائم ہوں۔ فتووں کے جو اقتباسات موصوف نے درج کئے تھے، ان میں کہیں بھی ''اس بغاوت'' یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی مذمت میں کوئی فقرہ ہے تو اس کی نشان دہی فرمایئے۔ غیر متعلق عبارتوں کے اقتباسات کے ساتھ ان کی حوالہ جاتی کتب سے اپنے مضمون کو مزین کر دینا ایک سراب ہے۔ اس سے متعلقہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی۔ مزید براں اگر کوئی شخص کسی سوچ اور فکر میں تنہا نہیں بلکہ بعض دوسرے بھی اس کے ساتھ شریک ہوں تو یہ امر اس ٹولے کی فکر کے سچا ہونے کی دلیل نہیں بن جاتی۔

موصوف نے اپنے موجودہ مضمون میں ایسے تاریخی قصوں کے اقتباسات درج کئے ہیں جن میں بعض معروف علماء کو انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں سے نبرد آزما بتایا گیا ہے۔ ان کے بارے میں عرض ہے کہ ایسے ہنگامی حالات کے دوران اور ان کے بعد بہت سے فرضی قصے کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ تحقیقی امور میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ایسے واقعات کے بارے میں دستاویزی ثبوت کے بغیر کسی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ ذاتی تجربات کے ضمن میں بیان کردہ واقعات البتہ قابل ترجیح ہوتے ہیں بشرطیکہ بیان کنندہ معروف اور قابل اعتماد ہو۔ بعض واقعہ نگار مخصوص مقاصد کے تحت کہانیاں گھڑتے ہیں جنہیں بعد میں وسعت دینے کا ''فریضہ'' ان کے مسلک وار انجام دیتے ہیں۔ تاریخ میں من گھڑت قصے بنانے والوں کا ذکر آتا [illegible] ان کی بیان کردہ ایسی کہانیوں کو تسلیم نہیں کرتے۔

موصوف یہ سوال کرتے ہیں کہ بہت سے علما جو غدر کے مخالف تھے، کیا غدارِ قوم اور اسلام دشمن تھے؟ میں یہ پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ وہ ڈھیروں علما، جو انگریز مخالف رویہ رکھتے تھے، کیا غدارِ قوم اور اسلام دشمن تھے؟ موصوف نے تو کسی کے اس قول پر کہ 'غدر میں بہت علما مخالف تھے کہ یہ جہاد نہیں' آناً فاناً یہ فیصلہ سنا دیا کہ 'بہت سے علما کثرتِ تعداد پر دلالت کرتے ہیں'۔ پھر انہوں نے چیدہ چیدہ علما کے فتووں کے ذکر کے ساتھ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کو 'ہمارے عہد کا فاضل مؤرخ اور اسکالر' قرار دیتے ہوئے ان کی کتاب 'جنگ آزادی ۱۸۵۷ء' کے حوالے سے ۱۸۵۷ء سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے معروف صاحب علم ملازمین کے ناموں کی ایک فہرست پیش کی ہے جنہوں نے 'بقول مؤلف سرکار کمپنی کا اقتدار مستحکم کیا'۔ 'بقول مؤلف' کے پردے میں یہ فہرست نقل کرنا بالکل بے مقصد ہے کیونکہ اول تو یہ زیرِ بحث دور ۱۸۵۷ء سے پہلے کی بات ہے جبکہ اصل مسئلہ پروان ہی نہ چڑھا تھا۔ دوسری بات یہ کہ ملازمت اور سیاسی وفاداری وخیر خواہی میں بہت فرق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس فہرست کو نقل کرتے ہوئے موصوف نے اصل حوالے میں درج ناموں کے ساتھ افراد کے سنین وفات حذف کر دیے جن سے معلوم ہوسکتا تھا کہ اس فہرست میں بعض ایسے اصحاب کا اندراج بھی ہے جو جنگ آزادی سے تیس چالیس سال قبل انتقال کر چکے تھے۔ اس طرح موصوف نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ انگریزوں کے وفادار علما کی ننھی منی تعداد میں کمپنی کے سترہ 'صاحب علم' ملازمین کا بطور علما اضافہ تو کر لیا مگر انہوں نے اسی 'فاضل مورخ اور اسکالر' کی اسی ضخیم کتاب سے ان بے شمار معروف علما کی فہرست ترتیب دینے کی زحمت گوارا نہ کی جنہوں نے انگریزوں کے خلاف قلمی اور عملی جدوجہد کی۔ موصوف نے مولوی عاشق علی میرٹھی کی کتاب 'تذکرۃ الرشید' کے حوالے سے بتایا ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی، حاجی امداد اللہ مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سرکار برطانیہ کے جاں نثار تھے جبکہ 'ہمارے عہد کا فاضل مؤرخ اور اسکالر' اپنی اسی کتاب میں حاجی امداد اللہ مکی کو 'امیر جہاد' اور مولانا رشید احمد گنگوہی کو اس حربی جماعت کے عہدۂ 'فصل قضایا' پر مامور بتا رہا ہے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام مجلس شوریٰ

کی فہرست میں درج کیا ہے (صفحہ ۱۷۸)۔ کس کی بات درست مانی جائے؟ موصوف تو اپنے مسلک کی حمایت میں صورت اوّل کو ترجیح دیں گے کیونکہ دوسری صورت پر "کز واکڑ واتھو" کی ضرب المثل صادق آتی ہے جبکہ تحقیقی نقطۂ نظر سے دونوں دعوے تشنۂ تحقیق ہیں کیونکہ دونوں مصنفین نے اپنی ان تحریروں کے ذیل میں کوئی حوالے درج نہیں کئے۔

موصوف نے سرسید کو نظریۂ پاکستان کا بانی اور سب سے پہلے دوقومی نظریے کی تصویری پیش کرنے والا قرار دیا ہے۔ میں اس دعوے کو برصغیر کی تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دیتا ہوں۔ سرسید نہ تو نظریۂ پاکستان کے بانی تھے اور نہ ہی دوقومی نظریے کے خالق۔ ہمارے ہاں یہ بات ایک خاص طبقے نے مخصوص مصلحتوں کے تحت پھیلائی ہے جسے ہمارے تعلیمی نصاب اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے تقویت پہنچائی جارہی ہے۔ نظریۂ قوم کے موضوع پر سرسید کے متعدد اقوال میں سے صرف چار مختصر اقتباسات پیش خدمت ہیں:

۱۔ تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں قوم کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ پسند نہیں کرتا۔ [۱]

۲۔ وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قوم میں سمجھے جائیں۔ [۲]

۳۔ لفظ "قوم" سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہ وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ "نیشن" (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ [۳]

۴۔ یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ [۴]

واضح ہو کہ اقتباس اول ۱۸۷۳ء اور باقی اقتباسات ۱۸۸۴ء کی تقریروں سے لئے گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں موصوف کے مضمون اول میں درج بنارس کا ۱۸۶۷ء کا حوالہ کوئی وقعت نہیں رکھتا کیونکہ کسی شخصیت کے آخری دور کے خیالات ہی اس کے اصلی افکار تسلیم کئے

جاتے ہیں۔ قائداعظم بھی تو پہلے ہندو اور مسلمانوں میں ''اتحاد کے سفیر'' کہلاتے تھے مگر بعد میں انہوں نے دو قومی نظریہ اپنایا تو یہی ان کی شخصیت کے ساتھ منسوب ہوا۔

موصوف قائداعظم اور ان کے چند ساتھیوں کا نام لے کر ان کی جدوجہد کے حوالے سے سوال کرتے ہیں کہ کیا انہوں نے ''کبھی سول نافرمانی کی؟ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا؟ پولیس کی لاٹھیاں کھائیں؟ کبھی جیل گئے؟''

سبحان اللہ! کیا ہی ہاتھ کی صفائی ہے! کیا آزادی کی تحریک میں پولیس کی لاٹھیاں کھانے اور جیل جانے والے ضروری طور پر فسادی اور دہشت گرد ہوتے ہیں؟ قائداعظم کی جماعت کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے سینکڑوں عہدیداروں نے جیل یاترا کی۔ اس کے علاوہ ہزاروں کارکن قیدی بنے اور لاٹھیاں کھائیں۔ آزادی کے پرستاروں کو کس ڈھٹائی کے ساتھ فسادیوں کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے اور ان کی قربانیوں کو وحشت اور دہشت سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ کسی تحریک میں شامل تمام ارکان کے لئے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ جیل جائیں یا لاٹھیاں کھائیں۔ تحریک میں ان کے رول کو دیکھا جاتا ہے۔ موصوف کے نامزد چند قائدین کو اگر یہ موقع میسر نہیں آسکا یا انہوں نے کسی حکمت عملی کے تحت ان سے گریز کیا تو یہ مثال کوئی ضابطہ نہیں بن جاتی۔ جنگوں میں کمانڈر انچیف کا کام حربی منصوبہ بندی اور ہراول دستوں کو باعمل رکھنا ہوتا ہے جبکہ عام فوجی اپنے متعین کردہ فرائض کے مطابق لڑتے ہیں۔ تحریکوں میں بھی قائدین اور کارکن وقت کی مصلحتوں کے مطابق حکمت عملیاں اپناتے ہیں۔ ہمیں آزادی پُرامن اور قانونی جدوجہد کے نتیجے میں نہیں بلکہ ہزار ہا جانبازوں کی قربانیوں کے صلے میں ملی۔ اس کی بنیاد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں رکھ دی گئی تھی۔ اگرچہ یہ جنگ کسی پیش بندی کے بغیر اچانک شروع ہوئی اور اس وجہ سے نظم وضبط یا باہمی روابط منصوبہ بندی اور مرکزیت کے فقدان کے علاوہ سرمائے کی عدم دستیابی اور آستین کے سانپوں کے مخبری کارناموں کے باعث وقتی طور پر ناکام ہوگئی مگر اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود مستقبل کے لئے جدوجہد کا موزوں راستہ متعین کرنے کی ایک راہ عمل چھوڑ گئی۔ اسے فساد یا دہشت گردی کہنے والوں کی اپنی ذہنی پستی اور ان کا اپنا گھٹیا معیار ہے۔ اس کے بعد نوے برس کے عرصے کے دوران بھی وقتاً فوقتاً

حربی معرکے جاری رہے اور یہی باعث ہے کہ انگریزوں کو توپوں، گولیوں، پھانسی کے پھندوں اور کالے پانی کی سزاؤں کے بعد بتدریج قید خانے بھرنے اور لاٹھیوں کے استعمال کی سطح تک اترنا پڑا۔ بعد میں وہ اگر گفت و شنید پر آمادہ ہوئے تو حریت پسندوں کی عملی جدوجہد ہی کی بنا پر، اگر چہ اس عمل میں بھی وہ ایک طویل عرصہ گزار گئے۔ اگر انہیں مستقل امن و سکون کا ماحول ملتا تو وہ کبھی جانے والے نہ تھے۔ وہ آرام سے سونے کی چڑیا کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے، اس لئے یہ جنگ کبھی نہ کبھی تو ہونا ہی تھی۔ اگر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں نہ ہوئی ہوتی تو ہم ۱۹۴۷ء میں آزاد نہ ہو سکتے۔ اس جنگ میں تاخیر ہوتی تو آزادی بھی پیچھے جا پڑتی۔ جو لوگ انگریزوں کے باجماعت حاشیہ بردار رہے اور اہلِ وطن کی جاسوسی کے کارنامے انجام دے کر سرکاری انعام و اکرام وصول کرتے رہے، انہیں مفت میں آزادی مل گئی۔ انعام و اکرام کے وہ مواقع نہ رہے تو ان کے دانشور اپنے قلم کے جوہر دکھا کر حریت پسندوں کے خلاف قوم کے افراد کے ذہنوں میں کھلے بندوں شکوک پیدا کرنے لگے اور بالآخر انہیں فسادی قرار دیتے ہوئے ان پر تبرا بھیجنے کی مہم شروع کر دی۔ ان میں ایک بات البتہ ضرور ہے کہ وہ لوگ احسان فراموش نہیں کیونکہ ایسا کر کے وہ سابق آقاؤں کا حقِ نمک ادا کر رہے ہیں۔

(نقیبِ ختمِ نبوت، ملتان، اپریل ۲۰۰۴ء)

(واضح ہو کہ درج بالا مضمون روزنامہ ''ڈان'' کے اربابِ اختیار نے کسی پالیسی کے نام پر شائع کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ وہ اخلاقی طور پر پابند تھے کہ اپنے اخبار میں مطبوعہ الزامات کا جواب شائع کریں)

حوالہ جات

۱۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۱۳۷

۲۔ سفرنامہ پنجاب (مرتبہ اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۳ء) ص ۱۴۳

۳۔ ایضاً ص ۱۶۷

۴۔ ایضاً ص ۱۹۳

سرسید اور علامہ اقبال کے نام پر انگریزوں کی غلامی کا جواز

یادش بخیر، حضرت پیام شاہ جہان پوری ایک مرتبہ پھر نام لئے بغیر اپنے کسی رہبر کو انگریز پرستی کے الزام سے بچانے کے لئے آ موجود ہوئے ہیں اور حسب سابق ''مخصوص حالات'' کے پُر فریب الفاظ کا سہارا لے کر انگریزوں کی غلامی کے دور کو جائز قرار دینے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ روزنامہ ''دن'' لاہور کی ۲۶ اور ۲۷ مارچ کی اشاعتوں میں انہوں نے ''سرسید و اقبال اور مخالفت فرنگ'' کے زیر عنوان کالموں میں سرسید کے ساتھ علامہ اقبال کی شہرت سے بھی فائدہ اٹھانا چاہا ہے۔ انگریزوں کے حق میں بعض مخصوص قسم کے علما کے فتوے پیش کرنا ان کا قدیمی معمول ہے۔ انہوں نے رسالہ ''نصرت الابرار'' کے صفحہ ۹ سے اس سوال کے جواب میں کہ ''سلطنت انگلشیہ، جس میں ہم کو امور دینیہ پر عمل کرنے سے روک نہیں ہے، بہتر ہے یا حکومت روس جو سخت متعصب اور دشمن قدیمی سلطان روم کی ہے'' مولوی عبدالعزیز لدھیانوی کا جواب نقل کیا ہے۔ پھر پیچھے جا کر صفحہ ۶ پر درج مولوی محمد فضل عظیم خطیب دیوبندی کی ایک رائے کو ''اس فتوے'' پر زبردستی چسپاں کر دیا ہے حالانکہ متذکرہ رائے کا ''اس فتوے'' سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ یہ دراصل لدھیانوی علما بر ادران سے ایک جھوٹی تحریر منسوب ہو جانے پر دیئے گئے فتووں کے معذرت نامے سے متعلق ہے۔

اس شعوری کوشش کے بعد فاضل کالم نگار نے اگلے صفحات میں پہنچ کر بڑی محنت و مشقت سے فتویٰ کنندگان کی گنتی کی اور شہروں کے نام ڈھونڈ ڈھونڈ کر درج کئے۔ لطف کی بات

یہ ہے کہ جس شخصیت کو مثال بنانے کے لئے اس کی حمایت میں یہ سارا تردد کیا گیا، متذکرہ فتووں میں اس کے برعکس وہ شخصیت خود ان کے بیان کردہ علما کی نظروں میں سخت مطعون ہے۔ ان علمانے درج بالا سوال کو چھوا تک نہیں بلکہ اگلے سوالوں کے جوابات میں سرسید اور ان کے ساتھیوں کی کھلے الفاظ میں تکذیب کی ہے اور ان پر کفر تک کے فتوے عائد کئے ہیں۔ ان علما میں مولوی محمد لدھیانوی نے سرسید کی جماعت میں شمولیت کو دیدہ دانستہ قعر ضلالت میں پڑنے اور اسلام کو ہاتھ سے دینے کے مترادف قرار دیا ہے۔ [۱] مولوی عبدالعزیز لدھیانوی کے مطابق مولوی محمد صاحب نے انہی کی تقریر کو "لباس فاخرانہ پہنا کر یہ استفتا تحریر فرمایا"۔ [۲] مولوی عبداللہ لدھیانوی نے لکھا ہے کہ "تحریرات سید احمد خاں سے صاف ظاہر ہے کہ منکر کتب سماویہ کا صریح طور پر ہے، اس کے کافر و مرتد ہونے میں کچھ شبہ نہیں"۔ [۳] دیگر معروف علما میں مولوی رشید احمد گنگوہی نے یہ رائے دی ہے کہ "سید احمد سے تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔ اگرچہ وہ خیر خواہی قومی کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام و مسلمان کو سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا"۔ [۴] مولوی محمود حسن دیوبندی نے جماعت نیچریہ کے حوالے سے علما کے فتووں کو "امر حق موافق کتاب وسنت" قرار دیا ہے۔ [۵] مولوی احمد حسن ولد مولوی محمد قاسم مدرس مدرسہ عربی دیوبند نے سرسید کے بارے میں یہاں تک لکھا ہے کہ "لاریب یہ شخص کافر ہے، اس کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے"۔ [۶] مولوی محمد فضل عظیم خطیب دیوبند نے ان جوابات پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ [۷] مولوی محمد عبدالحق مؤلف تفسیر حقانی بھی سرسید کے خلاف دستخط کنندگان میں شامل ہیں۔ [۸] رسالے کے آخر میں مولوی امداد العلی (ڈپٹی کلکٹر کانپور) کی تالیف "امداد الآفاق" کا خلاصہ درج ہے جس کے شروع ہی میں بیان کیا گیا ہے کہ "سید احمد دائرہ اسلام سے خارج ہے اور اس کے مدرسہ کی مدد کرنی حرام ہے"۔ [۹]

فاضل کالم نگار نے انگریزوں کی حمایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اس سے زیادہ واضح رائے انگریزوں کی اطاعت کرنے کے بارے میں اور کیا ہوسکتی ہے جو دیوبندی مکتبہ فکر

ے ان جدید علماء نے ظاہر کی جن کا ہم پایہ کوئی عالم اس وقت ملک پنجاب میں نہ تھا'' مگر ان علما نے ان صفحات پر جو اصل بات کی، موصوف اسے قصداً چھپا گئے۔ اسی رسالے کے صفحہ ۴ پر مرزا غلام احمد قادیانی کے کفر کی بات بھی کی گئی ہے مگر موصوف نے اس کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔ شاید ایسا کرنا ان کے مشن کا ایک حصہ ہے۔ یہ عجیب معیار ہے کہ انگریزوں کی اطاعت کے مسئلے پر جو علما 'جدید'' ٹھہریں ان کی مبینہ رائے کو خوب خوب اچھالا جائے مگر سرسید اور مرزا غلام احمد قادیانی پر ان کے کفر کے فتووں کو چھپا دیا جائے۔ ایسا کرنا تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں۔ موصوف کا بقیہ کالم غلط بنیادوں پر قائم دلائل کے باعث محض خانہ پُری ہے لہٰذا اس پر بحث وقت کا ضیاع ہوگا۔ باقی رہی علامہ اقبال کی بات، ان کے کلام سے اپنی حمایت میں کوئی مواد پیش کرنا موصوف کے بس میں نہ تھا اس لئے سرسید کی شان میں علامہ کے اشعار پیش کر کے بالواسطہ طور پر اپنا کام چلانا چاہا ہے (جیسے قادیانیوں کا طریقہ کار ہے کہ وہ حضورِ اکرم ﷺ کی شان میں مرزا غلام احمد قادیانی کا کلام پیش کر کے اپنے پیشوا کو سچا ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔ علامہ اقبال کا زیر تبصرہ معاملے میں کیا نقطہ نظر تھا؟ اس کے جواب میں کہ ''حکومت برطانیہ کے زیرِ سایہ مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہے'' جیسے جواز پیش کرنے والے مُلّاؤں کے متعلق ان کا یہ شعر پیش کیا جاسکتا ہے:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

(دن، لاہور، ۲۶ مئی ۲۰۰۴ء، ص ۱۱)

حوالہ جات

۱۔ نصرت الابرار (مرتبہ مولوی محمد لدھیانوی) مطبع صحافی لاہور (۱۸۸۸ء) ص ۱۸

۲۔ ایضاً

۴ ایضاً، ص ۱۹

۵ ایضاً، ص ۲۳

۶ ایضاً، ص ۲۴

۷ ایضاً

۸ ایضاً، ص ۲۶

۹ ایضاً، ص ۳۳

سرسید کے ذکر میں حدِّ ادب کی قیود

بازیافت کے شمارہ ۲ میں ڈاکٹر ظفر حسن کے پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالے ''سرسید اور حالی کا نظریۂ فطرت'' پر تبصرہ شامل ہے۔ فاضل تبصرہ نگار نے صاحبِ مقالہ پر سرسید کی تحقیر کا الزام عائد کرتے ہوئے ان کے مقالے کے درج ذیل تین فقروں کو غرور اور تکبر سے معمور بتایا ہے:

> ''اگر سرسید کو مغربی افکار سے آگاہی حاصل ہوتی......''
>
> ''مگر سرسید کو اس کا قطعاً احساس نہ تھا......''
>
> ''سرسید کے یہاں دلائل میں جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں وہ ان کی تعلیم مکمل نہ ہونے کی وجہ سے وجود میں آئیں''۔[۱]

فاضل مبصر نے مقالے کے آخری دو ابواب کا ذکر کرتے ہوئے صاحبِ مقالہ کے مبینہ غرور اور تکبر کی بالواسطہ طور پر یوں عکاسی کی ہے:

> ''ان ابواب میں انھوں نے دلائل اور اقتباسات کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید احمد خاں نہ فطرت کے مغربی تصور سے پوری طرح واقف تھے اور نہ ہی اس کی تاریخ سے۔ ان کا فطرت کا تصور اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مغربی تصورِ فطرت کے سرسری علم سے ماخوذ تھا۔ اگر وہ (صاحبِ مقالہ کی طرح) مغربی تصورِ فطرت کی

مکمل نہیں تھی، جبکہ صاحب مقالہ ماشا اللہ پی ایچ ڈی ہیں۔'' [۵]

کسی تحریر کو دوسروں کی تحقیر قرار دینے کا فاضل مبصر کا معیار کہاں تک درست ہے۔ اس سے قطع نظر یہ فیصلہ کرنے کے مجاز قارئین ہیں کہ ان کے اپنے ہی تعین کردہ معیار کے مطابق ان کی اپنی عبارت سے صاحب مقالہ کی تحقیر ہوتی ہے یا نہیں! انہیں مقالہ نگار سے یہ شکایت ہے کہ ''سرسید اور حالی کے حوالے سے بعض اوقات ان کا انداز حدِ ادب سے تجاوز کر جاتا ہے''۔ [۶] سرسید کے بارے میں وہ تلقین کرتے ہیں کہ ''ایسے انسان کے بارے میں لکھتے ہوئے ہمیشہ احتیاط اور ادب سے کام لینا چاہیے''۔ [۷]

کسی شخصیت سے بے پناہ عقیدت اور مرعوبیت تعلیم یافتہ افراد کو بھی سحرزدہ کر دیتی ہے، اور یہ کیفیت ان کے قابلِ احترام ممدوح کی انسانی فطری کمزوریوں کا ذکر قبول کرنے میں سدِ راہ ہو جاتی ہے۔ خاندانی بزرگوں کی حد تک تو بطور احترام خاموشی اختیار کرنے کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر تاریخی شخصیات کے ضمن میں ایسا کرنا تاریخ مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ ہر فرد کو اختیار ہے کہ اپنے ممدوح کی عقیدت مندی پر بھرپور قائم رہے مگر محض عقیدت میں حقائق کو تسلیم نہ کرنا قطعاً غیر علمی رویہ ہے۔ کسی کا یہ قول برحق ہے کہ ''تاریخ تاریخ ہوا کرتی ہے، بے شک عقیدتیں مجروح کیوں نہ ہوں''۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ علمی بحث میں شاگردوں نے اپنے نامور اساتذہ سے اختلاف کیا، یہاں تک کہ ان کے نام پر متوازی مکتبِ فکر قائم ہو گئے۔ کسی نے انہیں ''حدِ ادب'' کے تصوراتی دائرے سے باہر نکلنے کا طعنہ نہیں دیا، اس لئے کہ اگر علمی بحث میں سنجیدہ اختلاف کو بے ادبی قرار دے دیا جائے تو علمی وسعتیں جامد ہو کر رہ جائیں اور غلط طور پر اخذ کردہ علمی نکات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے شدہ اصول قرار پائیں۔

اگر ہم سرسید کے دور پر نظر ڈالیں تو اس وقت نہ تو ٹیلی ویژن تھا اور نہ ریڈیو۔ پریس نہایت محدود تھا۔ آج کی مانند بین الاقوامی کانفرنسوں کا رواج نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو ذرائع آمد و رفت کی سست رفتاری کے باعث ان میں شرکت ایک مسئلہ تھا۔ مغربی افکار کی لہروں کے ریلے اور ان کی تاریخ کا پس منظر برصغیر میں مکمل طور پر نہ پہنچ پائے تھے۔ سرسید خود انگریزی زبان سے نابلد تھے اور یورپی خیالات سے محدود آگاہی کے لئے بھی برصغیر کے انگریزی خواں طبقے کے دست نگر تھے۔ ایسے میں اگر صاحب مقالہ نے مغربی افکار سے سرسید کے آگاہ نہ

ہونے کا ذکر کر دیا تو غلط نہیں کیا۔ ان کی تو یہ بات بھی سو فی صد درست ہے کہ سرسید کی تعلیم مکمل نہ تھی۔ ایسی ''بے ادبی'' ان کے ساتھ ان کے سب سے بڑے مقلد الطاف حسین حالی بھی کر چکے ہیں جو لکھتے ہیں کہ سرسید نے ''قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی''۔ [۵] صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انھوں نے سرسید کی تفسیر کے متعلق یہ رائے دی کہ ''سرسید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں''۔ [۶] انھوں نے اس امر کی بھی نشان دہی کی کہ ''بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہوگیا اور کیونکر ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں''۔ [۷] اس کیفیت کو وہ ایک جگہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''آخر عمر میں سرسید کی خودرائی یا جو وثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہوگیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔ ہرچند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔'' [۸]

علی گڑھ تحریک کی ایک نامور شخصیت ڈپٹی نذیر احمد سرسید کے بہترین معاونوں میں سے تھے۔ سرسید کی تفسیر کے متعلق ان کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

> ''مجھ کو ان کے معتقدات ہا سرِ ہا تسلیم نہیں۔ سید احمد خاں صاحب کی تفسیر ایک دوست کے پاس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے نزدیک وہ تفسیر ''دیوانِ حافظ'' کی ان شروح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جن کے مصنفین نے جوڑوں سے کان گانٹھ کر سارے دیوان کو کتاب تصوف بنانا چاہا۔ جو معانی سید احمد خاں صاحب نے منطوق آیات قرآنی سے اپنے پندار میں استنباط کئے (اور میرے نزدیک زبردستی مڑھے اور

معانی کو ماننا مشکل ۔ یہ وہ معانی ہیں جن کی طرف نہ خدا کا ذہن منتقل ہوا، نہ جبریل حامل وحی کا، نہ رسولؐ خدا کا، نہ قرآن کے کاتب و مدون کا، نہ اصحاب کا، نہ تابعین کا، نہ تبع تابعین کا، نہ جمہور مسلمین کا۔"[۹]

یہی نہیں بلکہ ڈپٹی نذیر احمد نے سرسید سے اپنی مخالفت کا برسر عام اقرار کرتے ہوئے ان سے معذرت کرنے سے انکار کا اعلان یوں کیا:

"بے شک میں نے سید احمد خاں کی مخالفت کی ہے اور مخالفت بھی کی ہے تو شاید بری طرح۔ تو کیا مجھ کو اس مخالفت کے لئے معذرت کرنی چاہیے؟ اگر میں سمجھوں کہ سید احمد خاں مجھ سے معذرت کے متوقع ہوں گے تو پہلا آدمی جو منصب ریفارمری سے ان کو معزول کئے جانے کی رائے دے، میں ہوں۔"[۱۰]

سرسید کے دست راست نواب محسن الملک، جن کا یہ دعویٰ ہے کہ "مجھ سے زیادہ سرسید کو جاننے والا اور ان کی عزت کرنے والا، ان کی خوبیوں کو سمجھنے والا کوئی دوسرا نہیں"[۱۱] بیان کرتے ہیں کہ "اصلی اور سچی بات کو ہم تسلیم کرتے رہے اور بُری بات کو ان کی نہ مانتے تھے اور صاف ان کے روبرو انکار کردیتے تھے"۔[۱۲]

سرسید کے دوسرے قریب ترین رفیق نواب وقار الملک نے سرسید کے ایک خط کے جواب میں ان کی امت اسلامیہ کے لئے خدمات تسلیم کرنے کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کے متعلق ان کے خیالات پر اپنی شدید ناپسندیدگی کا اظہار یوں کیا:

"اگر آپ کے خط میں امام ابوحنیفہؒ پر طعن و تشنیع نہ ہوتی اور آپ ان کو ضمناً حیلہ باز نہ کہتے تو میں اس خاص جملے کے جواب ہی کو قلم انداز کر جاتا، لیکن اس بات کی آپ مجھ سے توقع چھوڑ دیں کہ میں ان پیشوایان دین پر، جنھوں نے نہایت نیک نیتی سے آپ ہی کی مانند اپنی تمام عمر امت اسلامیہ کی درستیِ احوال میں صرف کی ہو، تبرا سننے پر راضی ہوں۔"[۱۳]

فاضل مبصر زیر تبصرہ مقالے میں علوم و تاریخ کے ان نشتر وں کی نشان دہی نہ کر سکے جو سرسید نے نامور اور قابل احترام ہستیوں پر آزمائے۔ ان کی معلومات کے لئے ذیل میں، وہ

چند فقرات درج کئے جاتے ہیں جو انھوں نے امام غزالی کے متعلق جنھیں وہ بڑا عالم بھی قرار دیتے ہیں تحریر کئے۔ ان میں سے کون کون سے فقرات مغروریت اور تکبر کے ذیل میں آتے ہیں، ان کی شناخت غیر جانب دار مبصری کر سکتے ہیں:

- ''علم کیمیا کی نسبت جو امام صاحب نے لکھا ہے، اس کی نسبت ہم کچھ لکھنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ اس علم سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں اور سونا اور چاندی ہی بنانے کی دھن میں پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔'' [۱۴]
- ''اس مثال میں تو امام صاحب نے صرف مُلّا پن ہی برتا ہے۔'' [۱۵]
- ''اخیر کے دو لفظ امام صاحب کے سخت گرفت کے قابل ہیں، اور صرف گرفت ہی کے قابل نہیں بلکہ غلط بھی ہیں۔'' [۱۶]
- ''جو کچھ امام صاحب نے بیان کیا، رکاکت سے خالی نہیں۔'' [۱۷]
- ''امام صاحب کی دلیلوں کی رکاکت ولغویت اور مہمل قصوں پر اُن کا مبنی ہونا اور ایسے بڑے عالم کا اس طرح پر تعلیمی وتربیتی گڑھوں میں گر پڑنا خود ان کی دلیلوں سے ظاہر ہوتا ہے۔'' [۱۸]
- ''امام صاحب فرماتے ہیں کہ خاموش، ایسی باتوں سے ضررِ عظیم دین میں پیدا ہوتا ہے۔ سید احمد اس کی حقیقت اور ماہیت سمجھانے کو مستعد ہوتا ہے، پھر ان دونوں میں سے کون اسلام کی حقانیت پر زیادہ یقین رکھتا ہے!'' [۱۹]
- ''اس مقام پر تو امام صاحب نے اپنی تمام فضیلت اور امامت کو ڈبو دیا اور محض جاہلوں اور متعصبوں کی سی باتیں لکھی ہیں۔'' [۲۰]
- ''یہ تمام امور، جو امام صاحب نے بیان کئے ہیں، بودی بودی باتوں پر مبنی ہیں۔'' [۲۱]
- ''اس مقام پر امام صاحب نے نہایت مُلّا پن برتا ہے اور عام مُلّانوں کی سی باتیں کی ہیں۔'' [۲۲]
- ''اس مقام پر بھی امام صاحب نے اس طرح پر، جیسے کوئی کھسیانا محض

۸ حیات جاوید (بحوالہ بالا) حصہ دوم، ص ۵۲۲

۹ موعظۂ حسنہ (ڈپٹی نذیر احمد) مطبع انصاری دہلی (۱۸۹۰ء) ص ۱۷۵

۱۰ لکچروں کا مجموعہ (ڈپٹی نذیر احمد) مفید عام اسٹیم پریس آگرہ (۱۹۱۸) جلد اول، ص ۴۲۶

۱۱ مجموعہ لکچرز محسن الملک، نول کشور پریس لاہور (۱۹۰۴ء) ص ۵۰۸

۱۲ ایضاً، ص ۳۱۲

۱۳ سیلکٹڈ ڈاکومنٹس فرام دی علی گڑھ آرکائیوز، یونیورسٹی پریس علی گڑھ (۱۹۶۶ء) ص ۱۸۶

۱۴ النظر (سرسید احمد خاں) مصطفائی پریس لاہور (س ـ ن) ص ۴۹

۱۵ ایضاً، ص ۷۵

۱۶ ایضاً، ص ۷۸

۱۷ ایضاً، ص ۸۳

۱۸ ایضاً، ص ۸۹

۱۹ ایضاً، ص ۹۳

۲۰ ایضاً، ص ۹۷

۲۱ ایضاً، ص ۱۰۰

۲۲ ایضاً، ص ۱۰۲

۲۳ ایضاً، ص ۱۰۷

۲۴ تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۰ء) جلد اول، ص ۳۰

۲۵ خطبات احمدیہ، مسلم پرنٹنگ پریس لاہور (س ـ ن) ص ۱۵۲

۲۶ خطبات سرسید، مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۷۳ء) جلد دوم، ص ۵۰۱

۲۷ مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب لاہور، جلد ۱۳، ص ۳۹۲

۲۸ ایضاً، ص ۳۷۵

۲۹ ایضاً، جلد ۱۵، ص ۱۵۸

۳۰ ایضاً، جلد ۳، ص ۲۱

۳۱ ایضاً، جلد ۷، ص ۲۸۸

۳۲ ایضاً، جلد ۲، ص ۱۹۲

۳۳ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفید خلائق پریس آگرہ (۱۸۵۸ء)

۳۴ [illegible]

۲

سرسید، قائدِاعظم اور نظریہ قومیت

تاریخ کا بیان بڑا ہی کٹھن کام ہے، خاص کر ماضی قریب کی تاریخ جس کے اچھے برے اثرات تاریخ لکھنے والے خود محسوس کر رہے ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ماضی کے اس دور میں براہ راست شریک سمجھ رہے ہوتے ہیں، لہٰذا حالات و واقعات کے بیان میں ان کے ذاتی محسوسات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ بعض موقعوں پر نامور مؤرخین اور سنجیدہ مصنفین کے قلم کانپنے لگتے ہیں کیونکہ جس نقطۂ نظر سے وہ کسی واقعے کو دیکھنا چاہتے ہیں، حقائق اس کی تائید نہیں کر رہے ہوتے۔ جو قلم کار خود کو ذرا سیانے سمجھتے ہیں وہ اس صورت حال میں منفی ذرائع اختیار کرتے ہوئے اس واقعے میں ایسے استثنائی نکتے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اُن کے کام آسکیں، البتہ وہ انہیں استثنا کے زمرے میں اس لئے نہیں رکھتے کہ اس سے ان کے نقطۂ نظر کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ یوں حقائق پر پردے ڈال دیے جاتے ہیں؛ اور جب کسی قومی مسئلے کے بارے میں یہ سلسلہ دراز کر دیا جائے تو افرادِ قوم کے اذہان تبدیل ہو جاتے ہیں۔

جناب پروفیسر فتح محمد ملک وسیع مطالعہ کے حامل محب وطن لکھاری ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ کہیں سے کوئی ایسی آواز اٹھے جو اُن کی دانست میں ملکی تاریخ کا حلیہ بگاڑنے کا سبب بن سکتی ہو تو وہ فوری طور پر اپنے قلم کو حرکت میں لا کر اسے تاریخی حوالوں کے زور پر خاموش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ہماری تاریخ میں کچھ ایسے گھپلے جڑ پکڑ چکے ہیں جو خود حقائق پیش کرنے والوں کے یقین اور ایمان کا حصہ بن چکے ہیں،

یہاں تک کہ ان کی تکذیب میں نا قابل تردید حوالے پیش کئے جائیں تو پہلے وہ ان سنی کر دیتے ہیں اور جب ان حوالوں کو دہرایا جائے تو ایسا کرنے والوں کے خلاف مصنوعی جذباتی طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود سچ لکھنے والے اپنا کام جاری رکھتے ہیں اور یوں قلم کی حرمت برقرار رہتی ہے۔

نوائے وقت کے دوشماروں ۲۸ اور ۲۹ نومبر ۲۰۰۴ء میں پروفیسر صاحب موصوف کا ایک مضمون ''دو قومی نظریہ تین مراحل'' مطالعہ میں آیا۔ اس میں سرسید احمد خاں کے نظریۂ قومیت کے ضمن میں کانگرس کے رہنما بدرالدین طیب جی کے نام ان کے ایک خط کا اقتباس پیش کیا گیا ہے جس میں سرسید متحدہ قومیت کے نظریے کی تردید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سرسید کا یہ بیان دراصل مخصوص حالات میں خاص مصلحتوں کے تحت دیا گیا جس پر ہم نے ان کی بنیادی فکر ہونے کی چھاپ لگا دی اور ان کے دیگر بیسیوں بیانات نظر انداز کر دئے جو انہوں نے اس فکر کے برعکس متعدد موقعوں پر اپنی تقریروں اور تحریروں میں پیش کئے۔ سرسید کا نظریۂ قومیت کیا تھا، اس کے بیان سے پیشتر بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے خیالات ملاحظہ فرمائیے جو انہوں نے ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی جلسے میں دو قومی نظریے کی وضاحت میں پیش کئے:

> ''ہندو اور مسلمان دو مختلف مذہبی معتقدات، دو مختلف ادبیات اور دو مختلف النوع معاشرتی اطوار کے ماتحت ہیں۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے، نہ ایک دستر خوان پر کھانا کھاتے ہیں اور یہ بھی اصرار کے ساتھ کہیے کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ حیات انسانی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی تمنائے ترقیات کے لئے مختلف تاریخوں سے شغف

رکھتے ہیں۔ ان کے اس ذوق و شوق کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ دونوں قوموں کی رزمیہ نظمیں، ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور رہنما دوسری قوم کے بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے "[1]

سرسید بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں تسلیم کرتے ہیں مگر جہاں قائد اعظم ان دونوں میں بنیادی مذہبی اور تہذیبی اختلافات اجاگر کرتے ہیں وہاں سرسید مذہب کو قطع نظر کرتے ہوئے ان میں مشترک تہذیبی اور حیاتی اقدار نمایاں کرتے ہیں اور اہل وطن ہونے کے ناطے ان دونوں کو ایک قوم قرار دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

"ملک ہندوستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور ہیں ...... ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں، ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں، مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں، یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس حصہ سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے، قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔"[2]

جناب پروفیسر فتح محمد ملک تحریر کرتے ہیں کہ بدرالدین طیب جی کے خط کے جواب

میں" خود سرسید نے اردو لفظ قوم کا مفہوم متعین کرنے کی خاطر انگریزی لفظ نیشن بھی لکھ دیا تھا"۔ آیئے، ہم انہی دو الفاظ کی کیفیت سرسید کے اس بیان میں دیکھتے ہیں:

"لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معانی ہیں جس میں میں لفظ "نیشن" کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے..."[۳]

اسی مفہوم کو سرسید نے ایک اور موقع پر ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"صاحبو، وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو قومیں سمجھے جائیں۔"[۴]

ایک اور خطاب میں سرسید اپنے اسی نظریے کو یوں بیان کرتے ہیں:

"تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں قوم کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ پسند نہیں کرتا۔"[۵]

قائداعظم کا نظریۂ قومیت مسلمانوں اور ہندوؤں کو محض دو قومیں قرار دینے پر اکتفا نہیں کرتا، نہ انگریزی اقتدار کو جوں کا توں برقرار رکھنے کا پرچار کرتا ہے۔ وہ برطانیہ سے مکمل آزادی کا طلب گار ہے، جس کا اظہار ان کے درج ذیل بیان سے ہوتا ہے:

"ہم اپنی آزادی چاہتے ہیں، ہم اپنی سرزمین کے خود مالک بننا چاہتے ہیں اور برطانوی اقتدار کو خیرباد کہنا چاہتے ہیں۔"[۶]

اس کے برعکس سرسید ہندوستان پر برطانوی اقتدار کی شان میں یوں رطب اللسان ہیں:

"ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی، جس کے سایۂ عاطفت میں ہم امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔"[۷]

یہی نہیں بلکہ سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ "اگر بالفرض گورنمنٹ

انگریزی کی جانب سے کچھ دست اندازی بھی ہوتو ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں، نہ کہ گورنمنٹ کے مقابلہ میں بغاوت اختیار کریں''۔ [8]

اس سے بھی بڑھ کر سرسید اپنے نظریات کو اپنی تفسیر القرآن میں مذہبی سند کا درجہ عطا کرتے ہوئے خامہ فرسا ہیں کہ '' جو لوگ اس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا اعلانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور گو بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی (اسلام نے) ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں''۔ [9]

سرسید نہ صرف برطانوی اقتدار کو برقرار رکھنے کا پرچار کرتے ہیں بلکہ اس کی مضبوطی کے لئے اپنی خدمات کو یوں پیش کرتے ہیں:

> '' اگر میری قسمت میں ہو کہ میں وائسرائے ہو جاؤں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ .... نہایت مضبوط وائسرائے کے طور پر ملکہ معظمہ کی حکومت ہندوستان میں قائم رکھوں۔'' [10]

وہ انگریزی حکومت کے تسلسل کے حق میں اس قدر جذباتی ہیں کہ ناممکن کے خواہش مند ہیں۔ فرماتے ہیں:

> '' ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (Eternal) ہونی چاہیے۔'' [11]

یہ جواز پیش کرنا کہ سرسید اپنے آخری دور میں درج بالا خیالات سے رجوع کر چکے تھے، قطعی بے بنیاد ہوگا۔ اس کا ثبوت سرسید کے درج ذیل الفاظ ہیں جو انہوں نے اپنی وفات سے محض چھ ماہ قبل اپنے ایک مضمون میں تحریر کئے:

> '' ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کوئی بات قولاً یا فعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو۔'' [12]

تاریخ کے بیان کو تاریخی واقعات کی توضیح تک محدود رکھا جائے تو حق ہے۔ اگر ہم

شخصیت پرستی کا عنصر بیچ میں لے آئیں تو لفاظی اور انشاپردازی کے زور سے اصل واقعات کو کچھ کا کچھ بنا ڈالتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی نصاب میں اس مسئلے پر یہی کیفیت برپا ہے جس سے اذہان تبدیل ہو رہے ہیں لہٰذا موجودہ نصاب کی پروردہ تعلیم یافتہ نسل کی مجبوری ہے کہ بے چاری نادانستگی میں اسی کو بیچ جان کر اس کی مزید اشاعت میں مصروف ہے۔

(خبریں، لاہور۔ ۱۲ فروری ۲۰۰۵ء)

یہ مضمون جو اصولی طور پر "نوائے وقت" میں شائع ہونا چاہیے تھا، ذاتی طور پر وہاں کی ایک نہایت معتبر اور ذمہ دار شخصیت کے حوالے کیا گیا مگر بدقسمتی سے اشاعت سے محروم رہا، لہٰذا حقائق کی وضاحت کے لئے دوسرا سہارا ڈھونڈنے پر مجبور ہونا پڑا۔

حوالہ جات

۱۔ خطبات جناح، اوبستان لاہور (۱۹۳۶ء) ص ۶۵
۲۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید۔ مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۱۷۴
۳۔ سفرنامہ پنجاب (مرتبہ اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء) ص ۱۶۷
۴۔ ایضاً ص ۱۴۳
۵۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید ص ۱۳۷
۶۔ ارشادات جناح۔ اوبستان لاہور (طبع سوم) ص ۳۳۵
۷۔ روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۵ء) ص ۱۶۹
۸۔ مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ: مشتاق حسین) یونین پرنٹنگ پریس دہلی (۱۹۶۰ء) ص ۲۶
۹۔ تفسیر القرآن، جلد اول (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۰ء) ص ۳۳۹
۱۰۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید ص ۳۳۸
۱۱۔ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۹۸ء) ص ۷۵
۱۲۔ آخری مضامین سرسید (مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۱۰۱

سرسید کے نظریہ قومیت کے بیان میں حالی کا حوالہ

اصولی طور پر یہ مضمون بھی ''نوائے وقت'' میں شائع ہونا چاہیے تھا
مگر سابقہ تجربے کی بنا پر اس کے لئے بھی دوسرا سہارا لینا پڑا

''نوائے وقت'' لاہور کے شمارہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء میں جناب منیر احمد منیر کا ایک مضمون ''قائداعظم کا پاکستان اور چوہدری رحمت علی'' بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا۔ صاحب مضمون نے قیام پاکستان کے پس منظر میں دوقومی نظریہ کو ایک سیاسی نظریے کے طور پر ترویج کرنے کا سہرا سرسید کے سر باندھا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ''اب تک کی تحقیق کے مطابق ۱۸۶۸ء میں سرسید احمد خاں نے اسے اجاگر کیا تھا''۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی کی تالیف ''حیاتِ جاوید'' کے ایک صفحے کا فرضی حوالہ دے کر داوین میں درج ذیل عبارت سرسید سے منسوب کی ہے:

> ''ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں اور یہ کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوسکتیں۔''

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حالی نے اپنی پوری تالیف میں ان الفاظ پر مشتمل یا اس مفہوم کی کوئی عبارت سرسید سے منسوب نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ انہیں آخر دم تک متحدہ قومیت کے نظریے پر کاربند بتاتے ہیں۔ سرسید کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ''انہوں نے بارہا اپنی پبلک اسپیچوں میں ظاہر کیا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ سب اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں''۔[۱] ۱۸۶۷ء میں بنارس کے کمشنر کے ساتھ سرسید کی جس گفتگو کو دوقومی نظریے کی

ابتدا یا اسے اجاگر کرنا کہا جاتا ہے وہ مسلمانوں کی ترقی کی بابت تھی اور اس میں انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی عناد کے حوالے سے عام ہندوستانیوں کی بھلائی کے خیال کے بارے میں یہ کہا تھا کہ "اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی"۔ [۲] اس فقرے میں اس دو قومی نظریے کا تصور خدا جانے کیسے تخلیق کر لیا گیا جو قیام پاکستان کی بنیاد بنا۔ پاکستان کا مطالبہ الگ مذہب اور الگ تہذیب کی بنیاد پر کیا گیا تھا، نہ کہ ترقی کے نام پر۔ اس تحریک میں ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے خلاف بہت کچھ لکھا اور بولا گیا۔ اس کے برعکس مولانا حالی نے سرسید کی "بے تعصبی" کے زیرِ عنوان ان کی اس خاصیت کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے، درج ذیل ہے:

> "انہوں نے جتنے رفاہ عام کے کام کیے، ان میں تمام ہندو مسلمانوں کو شریک کیا۔ سوسائٹی کے اخبار میں جو کہ پینتیس برس ان کے ہاتھ تلے رہا، کبھی بھول کر بھی کوئی آرٹیکل یا نوٹ ایسا نہیں لکھا جس سے کہ مذہبی تعصب کی بو آتی ہو، کبھی گورنمنٹ سے اس بات کی شکایت نہیں کی کہ مسلمانوں کی تعداد بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری ملازمت میں بہت کم ہے، کبھی کسی ہندو عہدہ دار کی ترقی پر اعتراض یا ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ برخلاف اس کے ہمیشہ مسلمانوں کو نصیحت کی کہ سرکاری ملازمت کا استحقاق پیدا کریں، ہمیشہ ہندو لیڈروں اور ریفارمروں کا ذکر ادب اور تعظیم کے ساتھ اپنے اخبار میں اور پبلک اسپیچوں میں کیا اور ہمیشہ ان کے مرنے پر حد سے زیادہ رنج اور افسوس ظاہر کیا۔" [۳]

۱۸۶۷ء میں بنارس کی گفتگو کے سترہ سال بعد ۱۸۸۴ء میں سرسید نے اپنی تقریروں میں جن خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا حالی نے ان کے وہ اقتباسات بھی پیش کیے ہیں جن میں واضح الفاظ میں متحدہ قومیت کا پرچار ہے۔ لفظ "قوم" کی تعریف اور ہندوستان میں اس کی تطبیق میں سرسید نے کہا:

> "قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو ان میں بعض خصوصیتیں بھی ہوں۔ [illegible]

اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے ؟ کیا اسی زمین میں تم دونوں دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے ؟ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔'' [۳۲]

یہی نہیں، سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی ہندو قرار دیتے ہیں اور اس کے حق میں جو جواز پیش کرتے ہیں، حالی نے اس کا حوالہ سرسید ہی کے الفاظ میں درج کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان (یعنی ہندو مسلمانوں) کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ ''ہندو'' یعنی ہندوستان میں رہنے والی قوم۔'' [۳۳]

سرسید نے اپنے یہ خیالات مرتے دم تک ترک نہیں کئے۔ ان کی وفات سے ساڑھے نو ماہ قبل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۱۲ جون ۱۸۹۷ء کے شمارے میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے درج بالا نظریے کا یوں اعادہ کیا:

''صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں، ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں، پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریہ قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے

درج بالا اقتباسات پر کسی تبصرے کی گنجائش محسوس نہیں ہوتی، سرسید اور حالی کے الفاظ حقائق کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہمارے نامی گرامی قلم کار فرضی حوالے پیش کر کے قوم کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سرسید کا نظریہ قومیت آپ نے سطور بالا میں ملاحظہ فرمایا، اس کا موازنہ قائداعظم کے اس نظریۂ قومیت سے کیجیے جو انہوں نے گاندھی جی کے نام اپنے خط محررہ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء میں بیان کیا اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ملاحظہ کیجیے:

> ''ہمارا دعویٰ ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کی رو سے مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے اور مزید برآں یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنے خاص تہذیب و تمدن، زبان و ادب، فنون و تعمیرات، اسم و اصطلاحات، معیار قدر و تناسب، تشریعی قوانین، ضوابط اخلاق، رسم و رواج، نظام تقویم، تاریخ و روایات اور رجحانات و عزائم رکھتی ہے۔ غرض یہ کہ ہمارا ایک خاص نظریہ حیات ہے اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصور رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔'' [۷]

(پاکستان لاہور۔۱۲ جنوری ۲۰۰۵ء)

حوالہ جات

[۱] حیات جاوید، حصہ اول (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) ص ۲۷۲

[۲] ایضاً، ص ۱۳۰

[۳] ایضاً (حصہ دوم) ص ۵۵۲

[۴] ایضاً، ص ۵۵۱

[۵] ایضاً

[۶] آخری مضامین سرسید (مرتبہ امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۵۵

[۷] جناح گاندھی گفت و شنید (پیش کار: نوابزادہ لیاقت علی خاں) آل انڈیا مسلم لیگ دہلی (۱۹۴۴ء) ص ۶۵

سرسید کے بارے میں تاریخی افسانوں کی حقیقت

''الشریعہ'' کے گزشتہ تین شماروں میں ''تاریخی افسانے اور ان کی حقیقت'' کے عنوان سے پروفیسر شاہدہ قاضی، جناب شاہنواز فاروقی اور مسٹر یوسف خاں جذاب کی علمی بحث مطالعہ میں آئی۔ اول الذکر اور مؤخر الذکر نے تاریخی افسانوں کے رد میں بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ اس ردوقدح میں سرسید کے بارے میں ایسی باتوں کو بھی حقیقت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو خود تاریخی افسانوں کے ضمن میں آتی ہیں اور جن کی اشاعت ہمارا تعلیمی نصاب اور ذرائع ابلاغ کئی نسلوں سے کرتے آ رہے ہیں۔ راقم ایک محدود دائرے میں اس موضوع پر سرسید کی اپنی تحریروں سے حقیقت کی نقاب کشائی کرنے کی جسارت کرتا ہے۔

فاروقی صاحب نے اپنے مضمون میں تحریر کیا تھا کہ ''سرسید بلاشبہ انگریزوں کے وفادار تھے بلکہ تاریخی شواہد سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ مجاہدین آزادی کی مخبری کرتے رہے''۔ [۱] مسٹر جذاب نے اس پر یہ تبصرہ فرمایا کہ یہ بات ''سراسر ظلم اور ناانصافی ہے''۔ [۲] اس سلسلے میں ہم سرسید ہی سے رجوع کرتے ہیں کہ وہ اس الزام پر اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وہ اپنے کردار کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ہوئی، فدوی بہت نیک نام اور سرکار دولت مدار انگریزی کا طرفدار اور خیر خواہ رہا۔'' ۳

اس خیر خواہی کے عوض انہیں کیا ملا، انہی کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

''اس کے عوض میں سرکار نے میری بڑی قدردانی کی، عہدہ صدر الصدوری پر ترقی کی اور علاوہ اس کے دو سو روپیہ ماہواری پنشن مجھ کو اور میرے بڑے بیٹے کو عنایت فرمائے اور خلعت پانچ پارچہ اور تین رقم جواہر، ایک شمشیر عمدہ قیمتی ہزار روپیہ کا اور ہزار روپیہ نقد واسطے مدخرچ کے مرحمت فرمایا۔'' ۴

انعام و اکرام کی درج بالا رقوم کی مالیت کا تعین موجودہ زمانے کے حساب سے نہیں بلکہ ڈیڑھ سو برس قبل کے دور کے مطابق کرنا ضروری ہے۔ انگریزوں کی وفاداری کا یہ جذبہ اس واقعہ کے چالیس سال بعد، یعنی ان کی حیات کے آخری سال میں بھی پوری طرح کارفرما تھا۔ لکھتے ہیں:

''ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیر خواہ اور وفادار رہیں اور کوئی بات قولاً و فعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیر خواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو۔'' ۵

ثابت ہوا کہ سرسید مرتے دم تک انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ ایک موقع پر وہ مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی فرمانبرداری کا عرصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی، جس کے سایۂ عاطفت میں ہم امن و امان سے زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔ میری یہ رائے آج کی نہیں بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں۔'' ۶

ان کے یہ خیالات ۱۸۷۳ء کے ہیں اور سنہ پیدائش ۱۸۱۷ء ہے۔ متذکرہ پچاس ساٹھ برس پیچھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے وفادارانہ جذبات کی بنیاد اُن کے بچپن میں پڑی۔ اس حساب سے وہ اپنی پیدائش سے وفات تک انگریزوں کے وفادار رہے۔ وہ اپنی تمنا کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانۂ دراز تک ہی نہیں بلکہ ازل (Eternal) ہونی چاہیے۔'' ۷

سرسید کے ایسے خیالات کے اندراج کے لئے ایک دفتر چاہیے۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے درج بالا اقتباسات پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے کہ یہی ان کی وفاداری کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔

سرسید پر دوسرا الزام مجاہدین آزادی کی مخبری کا ہے۔ اس کی صداقت جاننے کے لئے ہم ان کی تاریخی تصانیف کی ورق گردانی کرتے ہیں۔ ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' میں وہ جنگ آزادی کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جب غدر ہوا، میں بجنور میں صدرامین تھا کہ دفعۃً سرکشی میرٹھ کی خبر بجنور میں پہنچی۔ اول تو ہم نے جھوٹ جانا مگر جب یقین ہوا تو اسی وقت سے میں نے اپنی گورنمنٹ کی خیرخواہی اور سرکار کی وفاداری پر چست کمر باندھی۔'' ۸

اپنی تصنیف ''سرکشی ضلع بجنور'' میں سرسید نے اپنی وفاداری کے کاموں کا ذکر بڑی تفصیل اور فخر سے بیان کیا ہے۔ نواب محمود خاں نے جب بجنور پر قبضہ کیا تو انہوں نے اپنی جان کو داؤ پر لگا کر انگریزوں کو وہاں سے بحفاظت نکالنے میں اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لیا۔ وہ ان کے ساتھ نہیں گئے۔ کیوں؟ انگریزوں کے اخبار ''مارننگ ایڈورٹائزر'' مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۸۵ء میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے:

> "Syed Ahmad Stayed behind at Bijnore, pretending to serve the Nawab, but really working for the English masters." ۹

ترجمہ: ''سید احمد پیچھے بجنور میں نواب (محمود خاں) کی ملازمت کے بہانے ٹھہرے مگر یہ قیام دراصل انگریز آقاؤں کے لئے کام کرنے کی خاطر تھا۔''

اس کام کا آغاز انہوں نے جس طرح کیا، سرسید اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نواب نے ہم کو کہا کہ تم سب اپنا اپنا کام کرو، اس وقت میں نے اور سید تراب علی تحصیلدار اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے باہم مشورہ کیا اور آپس کی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے جب تک کہ باہم کمیٹی کے اس کی صلاح نہ ہو لے۔ چنانچہ اسی وقت کام کرنے کے باب میں یہ رائے ٹھہری کہ میر سید تراب علی تحصیلدار بجنور کو جو ضروری حکم نواب کا پہنچے، اس کو لاچار تعمیل کریں اور باقی احکام سب ملتوی پڑے رہنے دیں اور باقی مال گزاری، بجز اس قدر روپیہ کے جس سے تنخواہ عملہ تحصیل و تھانہ تقسیم ہو جائے، اور کچھ وصول نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور بخشی رام تحویل دار کی معرفت، کہ وہ بھی خیر خواہ سرکار اور ہمارا ہم راز تھا، جو مال گزار آیا اس کو فہمائش کی گئی کہ روپیہ مت دے......'' [۱۰]

اس دوران منیر خاں جہادی ان کے درپے ہوا۔ اس کا ذکر سرسید کی اپنی زبانی سنئے جس میں انہوں نے انگریزوں سے ''خفیہ خط و کتابت'' رکھنے کا برملا اعتراف کیا ہے:

''منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر اور میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط و کتابت رکھتے ہیں اس لئے ان کا قتل واجب ہے۔ اور درحقیقت ہماری خفیہ خط و کتابت جناب مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی۔'' [۱۱]

قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصنیف میں ان خطوط کی نقول بھی شامل کی ہیں جو انہوں نے خفیہ طور پر انگریزوں کو لکھے۔ ان میں "باغیوں" کی عسکری کیفیت بیان کر کے بار بار بجنور پر جلد از جلد حملہ آور ہونے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ساری کتاب انگریزوں سے ان کی جاں نثاری کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ پھر جب حالات سے مجبور ہو کر وہ بجنور سے بھاگے اور بعد میں انگریزی فوج نے بجنور پر چڑھائی کی تو وہ اس کے عقب میں رواں دواں تھے۔ ایک محاربے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تمام جنگل اور سڑک پر ہتھیار بکھرے ہوئے تھے اور ہر ہر قدم پر لاش پڑی تھی۔ میں، جو لشکر محارب کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا، قصداً لاشوں کو دیکھتا تھا کہ شاید کوئی شناخت میں آئے مگر کوئی نامی آدمی نہیں مارا گیا بلکہ دو لاشیں تلنگام نمک حرام کی نظر پڑیں....." [۲۲]

پوری کتاب حریت پسندوں کے لئے غلیظ گالیوں سے بھری پڑی ہے۔ مفسد، غنیم، غادر، کم بخت، بدذات، بدنیتی اور فساد کا پتلا، بدمعاش، قدیمی بدمعاش، پکا بدمعاش اور حرامزادہ جیسے الفاظ بکثرت استعمال کئے گئے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ تمام "القابات" مسلمانوں کو دئے گئے ہیں جبکہ ہندوؤں کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا گیا ہے کیونکہ وہ انگریزوں کے حق میں سرسید کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔

اپنی بحث میں سرسید کی وکالت کرتے ہوئے مسٹر جذاب لکھتے ہیں کہ "ایک طرف ہندو اور انگریز اُن کے مخالف تھے تو دوسری طرف مسلمان اُن کو تکفیر کے بار پہنا رہے تھے"۔ [۲۳] کیا موصوف یہ بتانا گوارا کریں گے کہ کس نسل کے انگریز اُن کی مخالفت کر رہے تھے؟ الف سے یائے تک سب ان کے دوست تھے۔ ایک انگریز کرنل نے سب سے پہلے ان کی سوانح حیات لکھ کر انہیں بلند مقام عطا کیا۔ ہندوستان سے برطانیہ تک انگریزی اخبارات ان کی تعریفوں کے پل باندھتے رہے۔ لندن گئے تو ملکہ معظمہ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور گلیڈ اسٹون کراس کے ہاتھ کو بوسا دینے کی سعادت ملی۔ کالج معا انگریزوں کی مدد

عقائد کون سے اسلام اور کون سے مذہب میں روشن خیالی کے زمرے میں آتے ہیں! شیطان، جنّہ اور ملائکہ کا وجود اور انبیا علیہم السلام کے معجزات پر اہلِ کتاب حاکم بھی اعتقاد رکھتے تھے جنھیں ان کے دینی عالموں نے آج تک چیلنج نہیں کیا۔ سرسید جس قسم کا روشن خیال اسلام ایجاد کر رہے تھے، اس پر تو ان کے اندھے اور بے مغز عشاق بھی یقین نہیں رکھتے۔ سرسید نے اسلام کی جو تعبیر کی، علمۃ المسلمین نے اسے کبھی قبول نہیں کیا۔ یہ ملک سرسید کے نظریہ (فرنگی وفاداری) کے برعکس عالم وجود میں آیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزی حکومت کی برکات کے نظریے کو رد کر کے اپنی جدو جہد سے آزادی حاصل کی۔ اس کے قیام میں نہ سرسید کی روشن خیالی کا حصہ ہے اور نہ ان کی سیاسی پالیسی کا۔ بہتر ہے کہ دوسروں کو ملک چھوڑنے کا مشورہ دینے والے سرسید پرست خود اپنے مہدی اور امام کے ''برکاتی'' آقاؤں کے ملک سدھاریں۔

(الشریعہ گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء)

حوالہ جات

۱ الشریعہ گوجرانوالہ (جولائی ۲۰۰۵ء) ص ۳۲

۲ ایضاً (ستمبر ۲۰۰۵ء) ص ۱۸

۳ مکتوبات سرسید۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ جلد اول (۱۹۸۵ء) ص ۳۰۹

۴ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) حصہ اول، ص ۱۷

۵ آخری مضامین (سرسید احمد خاں) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۱۰۱

۶ مکمل مجموعہ لیکچرز سرسید۔ مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۳۳۲

۷ ایڈریس اور اسپیچز متعلق ایم اے او کالج (مرتبہ نواب محسن الملک) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۹۸ء) ص ۷۵

۸ لائل محمڈنز آف انڈیا (جلد اول) ص ۴۳

۹۔ Reviews on Syed Ahmad Khan's Life & Work, Aligarh Institute Press Aligarh,(1886) P.2

۱۰۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص۳۲

۱۱۔ ایضاً، ص۳۷

۱۲۔ ایضاً، ص۱۳۳

۱۳۔ الشریعہ گوجرانوالہ (ستمبر ۲۰۰۵ء) ص۱۸

۱۴۔ ایڈریس اور اسپیچیں، ص۳۲

۱۵۔ تذکرہ وقار (محمد امین زبیری) عزیزی پریس آگرہ (۱۹۳۸ء) ص۲۱۴

۱۶۔ مجموعہ لیکچرز نواب محسن الملک۔ نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء) ص۳۸٦

۱۷۔ کلیات نثر حالی (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹٦۸ء) ص۵۸

۱۸۔ موج کوثر (شیخ محمد اکرام) مرکنٹائل پریس لاہور (۱۹۴۰ء) ص۵۳

۱۹۔ ایضاً، ص۵۱

۲۰۔ الشریعہ گوجرانوالہ (ستمبر ۲۰۰۵ء) ص۱۸

باب دوم

تضادات وتحریفات

سرسید کا نظریۂ قومیت اور مولوی عبدالحق

قیامِ پاکستان کے بعد جب علی گڑھ کے تعلیم یافتہ طبقے نے ایک منصوبے کے تحت شعبۂ نوکرشاہی پر اقتدار جما لیا تو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی سربراہی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بانی سرسید کے بت کو نئے سرے سے قومی پس منظر کی روشنی میں تراشنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کی ابتدا غیر محسوس طور پر سرسید کو دو قومی نظریے کا خالق قرار دینے سے ہوئی۔ اس خود ساختہ مفروضے کو اس شدت اور چالاکی کے ساتھ فروغ دیا گیا کہ بڑے بڑے دانشور اس کا شکار ہو گئے اور ملک کے اکثر قلم کاروں، اساتذہ اور صحافیوں نے آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیا۔ یہ فکر تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے نئی نسل کو اس طرح منتقل کی گئی کہ ان کے اذہان تسخیر کر لئے گئے، یہاں تک کہ اس امر پر یقین ہی حب الوطنی کا ایک معیار قرار پایا۔ اس مقصد کے لئے اول مولوی عبدالحق نے ذہنی دھلائی کا بڑا ہنرمندانہ انداز اختیار کیا۔ ایک مضمون میں وہ اس ہنرمندی کا آغاز ان فقرات سے کرتے ہیں:

> "سرسید نے ۵۷ء کے بعد جب قومی خدمت شروع کی تو جتنے کام کئے ان میں کبھی ہندو مسلم کا امتیاز نہ کیا اور نہ کبھی اس کا خیال آیا۔ ...... [illegible] ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں بار ہا اس [illegible] بڑے خلوص اور پر اثر الفاظ میں بیان کیا ہے۔"[1]

اس کے بعد مولوی عبدالحق سرسید کی تقریروں سے چند اقتباسات [illegible]

سے صرف پہلا اور آخری اقتباس ملاحظہ ہو:

"اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں، جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے، ایک ہونا چاہیے۔" ؎

"میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم سب، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہیں۔ یہی مختلف وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ 'ہندو' یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔" ؎

ان اقتباسات کے فوراً بعد مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"ان اقوال سے ظاہر ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے کس قدر حامی تھے۔ تقریر و تحریر میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے بوئے تعصب آتی ہو یا ہندوؤں کی دل آزاری کا باعث ہو...... لیکن جب ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی تو سرسید کے دل کو بڑی ٹھیس لگی اور بہت صدمہ ہوا۔ مولانا

حالی لکھتے ہیں کہ سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو
گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا
کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ
انہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر
سے، جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب
میں گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر
انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص
مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے پہلے تم ہمیشہ عام
ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا، اب مجھے
یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں
گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن
لوگوں کے سبب، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ
رہے گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہو تو
نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا، مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی
پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔" [۲]

ذرا انصاف کیجیے کہ مولوی عبدالحق نے متحدہ قومیت کے حق میں سرسید کے بیانات
سے جو اقتباسات درج کئے ہیں وہ ان کے ۱۸۸۴ء کے دورۂ پنجاب کے دوران کی گئی تقریروں
سے لئے گئے ہیں اور اس کا حوالہ خود ہی پہلے اقتباس کے آخر میں بھی درج کیا ہے۔ ان
اقتباسات کو پیش کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد انہوں نے "لیکن" سے جو فقرہ شروع کیا
ہے اس سے قارئین کو بالواسطہ طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اردو ہندی نزاع کا واقعہ
اس کے بعد پیش آیا اور اس صدمے سے سرسید نے گویا سابقہ خیالات ترک کر دئے۔ اس تاثر
کی تخلیق کے بعد وہ یہ دور کی کوڑی لائے کہ "ہندو مسلم نزاع یہیں سے شروع ہوتی ہے اور وہ
قومی نظریے کی ابتدا یہیں سے ہوئی"۔ [۵]

انسان خطا کا پتلا ہے۔ خطا سے بچنے کی کوشش کے باوجود اس سے سہو ہو جانا ممکن ہے اور ایسی صورت میں سہو نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ مولوی عبدالحق کی سہو ہوتی تو اور بات تھی مگر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نزاع کا مذکورہ واقعہ سرسید کی درج بالا تقریروں سے ستر ہ سال قبل (۱۸۶۷ء میں) پیش آیا۔ حالی کی حیات جاوید میں، جہاں سے انہوں نے یہ واقعہ نقل کیا، اس کا بیان ہی متذکرہ سال سے شروع ہوتا ہے۔ ؎ خود انہوں نے متعدد موقعوں پر بنارس کے اس ہندی اردو نزاع کے بیان میں ۱۸۶۷ء ہی کا ذکر کیا۔ ان کے مجموعہ خطبات کے صفحات ۱۰۵، ۱۱۲، ۲۶۷، ۲۷۱، ۳۱۸، ۳۳۹ اور ۵۲۰ پر باقاعدہ پورے ہندسوں میں اس سال کا حوالہ موجود ہے۔ اسی طرح اپنے مجموعہ مضامین میں انہوں نے دو مختلف مواقع کی تحریروں میں اسی سال کے ذکر کے ساتھ متذکرہ واقعہ پر بحث کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ:

> ''اس وقت سے محض اردو کی مخالفت کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہو گئیں اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی اور یہی دو قومی نظریہ پاکستان کی بنا کا باعث ہوا'' ؎

جب موصوف نے سرسید کے حوالے سے ۱۸۶۷ء میں دو قومی نظریے کی بنیاد ڈال دی تو پھر متحدہ قومیت کے حق میں سرسید کے ۱۸۸۴ء کے خیالات کس کھاتے میں جاتے ہیں؟ مضمون زیر بحث میں سال کا ذکر کر دینے سے قارئین کو گمراہ کرنا ممکن نہ تھا اس لئے اسے حذف کر دینا ہی مناسب خیال کیا گیا۔ اگر مولوی عبدالحق ''لیکن'' کے لفظ کے بعد ۱۸۸۴ء سے زمانہ بعد کے اس قسم کے کسی واقعے کا حوالہ پیش کرتے تو کچھ بات بن جاتی لیکن ایسا کوئی واقعہ تخلیق کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی، اس لئے الفاظ کے ہیر پھیر سے من پسند نتائج اخذ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ مولوی عبدالحق کی اس گمراہ کن تحریر سے متاثر پاکستان کے اکثر جز وقتی اور ہمہ وقتی قلم کار، جن کی معلومات کا منبع اصل ماخذ نہیں بلکہ محض سطحی اور تعریفی مضامین ہوتے ہیں، بغیر تحقیق و تصدیق یہی ہانکے چلے جا رہے ہیں کہ ''سرسید پہلے متحدہ قومیت کے حامی تھے مگر جب بنارس کا اردو ہندی تنازعہ پیش آیا تو انہیں دکھ ہوا اور دو قومی نظریے کی ابتدا ہوئی'' اور نئی پود بھی اس جھوٹ کو سچ سمجھ کر اس نظریے پر عمل پیرا ہے۔ ۱۸۸۴ء کے خیالات کو ۱۸۶۷ء

میں ترک کر دینے کا معاملہ کچھ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں بن فلاں نے اپنی شادی سے سترہ سال قبل اپنی بیوی کو طلاق دے دی یا ایک باپ نے اپنی بیٹی کی پیدائش سے سترہ سال قبل اسے ہلاک کر ڈالا۔

یہ تو تھا اس مسئلے میں مولوی عبدالحق کی غلط بیانی کا پس منظر، اب ان کے تخلیق کردہ ''تحقیقی نتیجے'' پر چند تاثرات ملاحظہ فرمائیے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی تحریر کرتے ہیں:

> ''بعض کوتاہ بینوں نے سرسید کے اردو ہندی تنازعے میں طرز عمل اور نقطۂ فکر کو غلط پیش کیا ہے۔ سرسید اردو کو ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ سماجی اور لسانی جدوجہد کا نتیجہ سمجھتے تھے اور اس سے علیحدگی کی تحریک کو اپنے متحدہ قومی نظریات کے منافی تصور کرتے تھے۔'' [۸]

ڈاکٹر منور حسین اس لسانی تنازعے کے پس منظر میں متذکرہ نتیجہ اخذ کرنے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سرسید نے ہمیشہ متحدہ قومیت کی وکالت کی، اسکے حق میں دلیلیں فراہم کیں اور اس تصور کو فروغ دینے کے خواہش مند رہے مگر لسانی تنازعے کے آئینے میں ان کی نگاہوں نے دیکھا کہ اب یہ دونوں فرقے کبھی بھی متحد و متفق نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج وسیع ہوتی جائے گی۔ اس پیشین گوئی کو دعوت و تلقین سمجھنا بوالعجمی اور ستم ظریفی ہے۔'' [۹]

سرسید نے قیام لندن کے دوران نواب محسن الملک کے نام ایک [illegible] ہندی تنازعے کا ذکر کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس طرح ''[illegible] جائیں گے''۔ [۱۰] بعض حلقے اسے تقسیم ہند کی پیش گوئی [illegible] یونیورسٹی کے فاضل اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے استاد اختر الواسع [illegible] ہوئے لکھتے ہیں:

''سرسید کے اس خیال کا کہ ''ہندو علیحدہ، مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے'' سہارا لے کر کچھ لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کی وجہ سے مسلمان فرقہ وارانہ سیاست کا شکار ہو گئے یا یہ سب خداوندانِ حکومت (یعنی حکومت برطانیہ) کی رضا اور خوشی کے لئے کیا گیا تھا، بالکل غلط ہے افسوس تو یہ ہے کہ ہندوستانی قومیت کا تصور آج تک سرسید کے نظریۂ قومیت کی سرحد کو چھو بھی نہیں سکا ہے۔'' [۱۱]

بہر حال مولوی عبدالحق اس واقعہ ہی کو دوقومی نظریے کی ابتدا کہتے ہیں اور پھر اس سے یہ نتیجہ بھی نکالتے ہیں کہ:

''قصرِ پاکستان کی بنیاد میں پہلی اینٹ اردو نے رکھی۔'' [۱۲]

اور غالباً سرسید کی اردو کے حق میں مساعی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں:

''قصرِ پاکستان کی بنیاد میں پہلی اینٹ اسی پیر مرد نے رکھی تھی۔'' [۱۳]

پھر ان دونوں خیالات کو اس طرح یک جا کرتے ہیں:

''قصرِ پاکستان کی بنیاد میں پہلی اینٹ اسی پیر مرد کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور وہ اینٹ اردو زبان تھی۔'' [۱۴]

درج بالا فقرات کی جزئیات پر بحث سے گریز کرتے ہوئے اور تمام بحث کو سمیٹے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولوی عبدالحق کی نگاہ میں ''دوقومی نظریہ'' ایک مثبت فکر تھی جس کے باعث پاکستان عالمِ وجود میں آیا لہٰذا وہ اپنی تحقیق کا سہارا لے کر اس کا کریڈٹ سرسید کو دیتے ہیں۔ واضح ہو کہ دوقومی نظریے کے حق میں موصوف کے تمام خیالات اس وقت کے ہیں جب ان کے مکتبۂ فکر علی گڑھ سے تعلق رکھنے والے طبقہ نے ملک کے شعبۂ نوکر شاہی میں اچھی طرح پاؤں جمالئے تھے اور تعلیمی نصاب میں ان کا عمل دخل قوی ہو گیا تھا۔ اس سے قبل الگ قومیت کے نظریے کی ترویج کے پس منظر میں کئی برسوں پر پھیلے ہوئے ان کے چیدہ چیدہ خیالات ملاحظہ فرمائیں:

''۵۷ء کے بعد سے رفتہ رفتہ زبان کی چھیڑ شروع ہوتی ہے۔ جب

ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط اٹھ گیا اور انگریزی حکومت قائم ہوگئی تو اس وقت ہندوؤں کی ایک جماعت میں قومیت کا ایک نیا احساس پیدا ہوا اور اپنی قدیم تہذیب کو پھر زندہ کرنا چاہا۔" [۱۵]

"قومیت کی تکمیل بغیر زبان کے نہیں ہوسکتی اس لئے جدید قومیت کے مدعیوں نے اردو کے خلاف جہاد شروع کیا اور اس کی بجائے ہندی کو رواج دینے کی کوشش کی۔" [۱۶]

"آل انڈیا ریڈیو کے ناظم اور اردو کے حامیوں کا منشا یہ تھا کہ خبریں ایسی سادہ اور سہل زبان میں ہونی چاہئیں جسے سب سمجھ سکیں مگر وہ کسی طرح نہیں مانتے تھے اور مصر تھے کہ وہ الگ الگ زبانوں میں نشر ہونی چاہئیں۔ جس طرح ان صاحبوں نے دوقومی نظریے قائم کر کے ہندو مسلمانوں میں افتراق و نفاق پیدا کیا تھا، اسی طرح وہ دو زبانوں کو الگ الگ رواج دے کر اس نظریے کو اور مستحکم کرنا چاہتے تھے۔" [۱۷]

"ہندو مسلم اختلاف کی ابتدا سیاست سے نہیں بلکہ اردو کی مخالفت سے ہوئی ...... (ہندو) مختلف صورتوں اور ترکیبوں سے اس آگ کو سلگاتے رہے اور قومی نظریے قائم کر کے ہندو مسلم اختلاف کو بڑھاتے رہے اور دوقومی نظریے کے بانی ہندو تھے، نہ کہ قائداعظم یا مسلم لیگ۔ یہ قائداعظم پر ہندوؤں کا بہتان ہے۔" [۱۸]

جب مولوی عبدالحق دوقومی نظریے کا بانی ہندوؤں کو بتاتے ہیں، کسی مسلمان کو بانی سمجھنے کو بہتان قرار دیتے ہیں اور اسے ہندو مسلم نفاق کا باعث قرار دے [illegible] کے الفاظ و معانی کے مفہوم سے منفی قرار پایا۔ سوچنے کا مقام ہے کہ [illegible] سرسید کے معاملے میں مثبت کیسے ہوگیا!

حوالہ جات

۱۔ سرسید احمد خاں ۔ حالات و افکار (مولوی عبدالحق) انجمن ترقی اردو کراچی (۱۹۵۹ء) ص ۵۹_۶۰

۲۔ ایضاً ص ۶۰

۳۔ ایضاً ص ۶۱

۴۔ ایضاً ص ۶۲_۶۳

۵۔ ایضاً ص ۶۳

۶۔ حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ اول، ص ۱۳۰

۷۔ سرسید احمد خاں (محولہ بالا) ص ۱۶۱

۸۔ سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے (خلیق احمد نظامی) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۳ء) ص ۵۲

۹۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ (مارچ اپریل ۱۹۹۸ء) ص ۶۰

۱۰۔ خطوط سرسید (مرتبہ سید راس مسعود) نظامی پریس بدایوں (۱۹۲۴ء) ص ۸۸

۱۱۔ جامعہ دہلی (جولائی ۱۹۹۸ء) ص ۳۳۱_۳۳۳

۱۲۔ خطبات عبدالحق (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۵۲ء) ص ۳۳۹

۱۳۔ سرسید احمد خاں (محولہ بالا) ص ۱۶۲

۱۴۔ ایضاً ص ۳۳۹

۱۵۔ خطبات عبدالحق، ص ۳۳۲

۱۶۔ ایضاً ص ۳۷۱

۱۷۔ ایضاً ص ۳۶۳

۱۸۔ ایضاً ص ۳۱۸

مُلّا دوست محمد قندھاری کی سرسید سے مبینہ ملاقات کی داستان

''برہان'' دہلی کے شمارے ستمبر ۱۹۶۶ء میں مولانا حکیم فضل الرحمٰن صاحب سواتی کا ایک مضمون ''سرسید احمد اور دیو بند'' شائع ہوا جس میں صاحب مضمون نے مُلّا دوست محمد خاں قندھاری کی سرسید احمد خاں سے ایک مبینہ ملاقات کا واقعہ خود انہی کی زبانی روایت کیا ہے۔ اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین بھی اس کی تفصیلات سے آگاہ ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں:

> ''میری عمر کم وبیش ۱۴ برس کی تھی۔ میرے استاد جو میرے والد بزرگوار کے شاگرد بھی تھے، میں ان سے شرح جامی پڑھ رہا تھا کہ ان کو ایک خط موضع چارسدہ ضلع پشاور سے ان کے استاد مُلّا دوست محمد خاں قندھاری کے پاس سے ملا کہ فوراً چلے آؤ، جمعہ کے روز یہاں ایک عظیم الشان فاتحہ خوانی ہے، اس میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔ خط دیکھتے ہی آپ جانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ میں بھی ساتھ ہو گیا۔ دوسرے روز صبح آٹھ بجے چارسدہ پہنچے۔ یہاں جامع مسجد میں جا کر دیکھا کہ لوگ بہت بڑی تعداد میں تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ ہم بھی تلاوت کرنے لگے۔ مُلّا دوست محمد خاں صاحب نے کہا کہ علی گڑھ کے سرسید

احمد خاں صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، یہ قرآن خوانی ان کے حق میں ہے۔ ایک صاحب نے کہا "وہ نیچری تھے، وہ اس فاتحہ خوانی سے قائل نہ تھے، پھر ان کے حق میں یہ فاتحہ خوانی کیوں کی جاتی ہے؟" مُلّا دوست محمد خاں نے کہا کہ "ہم بھی پہلے ان کو نیچری ہی سمجھتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند جب قائم ہوا تو میں اس میں داخل ہوا اور تعلیم پانے لگا۔ دارالعلوم کے جملہ اساتذہ اور طلبہ سرسید احمد خاں کو بہت برا بھلا کہتے تھے کہ وہ اسلام کے حامی نہیں ہیں بلکہ حکومت برطانیہ کے حامی اور ثناخواں ہیں، اور یہ بھی سنتا تھا کہ علی گڑھ والے دیوبند والوں کو برا بھلا کہتے ہیں، اس لئے میرے دل میں سرسید احمد خاں صاحب سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ آٹھ سال تو یونہی گزر گئے۔ جب میں فارغ التحصیل ہو گیا تو ایک دن سرسید کی تفسیر قرآن میری نظر سے گزری جس نے علمائے دیوبند کو بہت برافروختہ کر رکھا تھا۔ ایک دن میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ سے عرض کیا کہ اس تفسیر میں وہ کون سے مقامات ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں؟ انہوں نے ان مقامات کو دکھایا تو میرے دل میں سرسید کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی کیونکہ اس تفسیر میں جن و شیاطین اور ملائکہ کا انکار تھا۔ میں سخت طیش میں آ گیا اور تفسیر کو بغل میں رکھ اور بڑی مضبوط لکڑی ہاتھ میں لے سرسید کا سر پھوڑنے کی غرض سے علی گڑھ روانہ ہو گیا"۔

"علی گڑھ پہنچ کر کالج کا پتا اور پوچھا کہ سرسید احمد کہاں ملیں؟ کسی نے کہا کہ سامنے جو کمرہ دکھائی دیتا ہے وہ اس میں بیٹھے ہیں۔ میں جب اس کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک بزرگ بیٹھے

ہوئے ہیں، گھنی اور لمبی داڑھی، چہرہ خوبصورت اور بارعب، شیروانی اور پاجامہ زیب تن ہے۔ میں نے السلام علیکم کہا اور پوچھا کہ سرسید احمد کہاں ہیں، میں ان سے ملنے آیا ہوں۔ انہوں نے کہا: "ان سے آپ کو کیا کام ہے اور آپ کہاں سے آئے ہیں؟" میں نے کہا "دیوبند سے آیا ہوں اور یہ تفسیر، جو ان کی تصنیف ہے، اس سے متعلق ان سے گفتگو کرنی ہے"۔ انہوں نے کہا "آپ تشریف رکھئے" اور ادھر چپڑاسی سے کہا کہ ٹھنڈا شربت بنا کر انہیں پلا دو۔ چپڑاسی نے فوراً تعمیل کی۔ گرمی کے دن تھے اس لئے ٹھنڈا شربت پیتے ہی سب جوش فرو کیا اور دل میں جو خیال تھا کہ سرسید کا سر پھوڑوں گا تو وہ خیال دل سے جاتا رہا، اب صرف گفتگو کا خیال باقی رہا۔ اتنے میں ایک نوجوان، جو کوٹ پتلون میں ملبوس تھا، سرسید نے اس سے کہا "دیکھو، یہ صاحب دیوبند سے آئے ہیں، نسلاً تو افغان معلوم ہوتے ہیں لیکن دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ جب سے ہمارا کالج قائم ہوا ہے دیوبند کا کوئی عالم یا فارغ التحصیل یہاں نہیں آیا ہے، یہ پہلا اتفاق ہے جو ملا صاحب تشریف لائے ہیں"۔ یہ سنتے ہی وہ نوجوان مجھ سے بڑی محبت سے پیش آیا اور میری دست بوسی کی۔ اس کے بعد سرسید نے مجھ سے کہا کہ "اس نوجوان کو کچھ نصیحت کیجئے، یہ کالج میں انگریزی کی تعلیم پا رہا ہے، علوم دینیہ سے واقف نہیں"۔ میں نے کہا "میں کوئی مقرر نہیں ہوں، میں دارالعلوم میں آٹھ سال تعلیم پا کر اب فارغ التحصیل ہوا ہوں۔ سند پا کر وطن جانے کے ارادے میں تھا کہ یہاں آ گیا"۔ انہوں نے فرمایا کہ "تقریر کی کوئی ضرورت نہیں ہے آج کی بات

شب معراج ہے، معراج کے بارے میں کچھ کہیے"۔ اس پر میں نے وہ طویل حدیث بیان کرنا شروع کر دی جو کتب احادیث میں ہے۔ میں نے کہا "رات کے وقت حضرت جبریلؑ براق لے کر آئے، حضرت محمد ﷺ کو اس پر سوار کرایا اور ایک لحظہ میں بیت المقدس پہنچے، وہاں تمام انبیا علیہم السلام جمع تھے، آپ نے امامت کی۔ پھر اوپر آسمانوں کی طرف پرواز کی۔ جب سدرۃ المنتہیٰ پہنچے تو حضرت جبریلؑ یہاں رک گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلا لیا اور اپنے آپ کو انہیں دکھا دیا اور تمام امور شرعیہ سے آگاہ کر دیا"۔ وہ نوجوان یہ تمام باتیں سن کر بہت برافروختہ ہوا اور بولا "ہم تو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ عیسوی اور یہودی مذہب میں ہی خلاف عقل باتیں ہوتی ہیں، اسلام میں ایسی باتیں جو خلاف عقل ہوں نہیں ہوتیں"۔ یہ سن کر مجھے اس نوجوان پر بہت غصہ آیا لیکن سرسید کا رعب مجھ پر ایسا طاری تھا کہ میں کچھ نہ بولا۔ اب سرسید نے مجھ سے کہا "آپ کے پاس جو تفسیر ہے اسے کھول کر دیکھئے، آیت معراج کے تحت اس میں کیا لکھا ہے؟ اس تفسیر کو غور سے دیکھئے اور اس نوجوان کو بھی سنا دیجئے"۔ چنانچہ میں نے اسے دیکھا۔ اس میں درج تھا کہ معراج جسمانی نہ تھی بلکہ روحانی تھی اور یہ روایت حضرت عائشہؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی بتائی گئی تھی۔ یہ سن کر نوجوان آمنا و صدقنا پکارنے لگا"۔

"اب سرسید نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا "مُلّا جی! یہ کتاب میں نے ان طلبہ کے واسطے لکھی ہے جو انگریزی کی تعلیم پا رہے ہیں، مذہب کی کوئی بات خلاف عقل ہو تو یہ تسلیم نہیں کرتے۔ آپ نے جو

حدیث سنائی اس کے حرف حرف پر میرا عقیدہ ہے، ان اللہ علی کل شیء قدیر بالکل صحیح ہے۔ ملائکہ جو آسمانوں پر ہیں ایک لحظہ میں زمین پر اتر جاتے ہیں اور ہمارے رسول پاک حضرت محمد ﷺ چند منٹوں میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ گئے اور اپنے محبوب پاک سے ملاقی ہوئے، پھر جنت اور دوزخ کا بھی اچھی طرح معائنہ کیا، یہ سب باتیں ایسی ہیں جن پر میرا ایمان اور یقین کامل ہے۔ میں علمائے دیوبند کو ورثۃ الانبیا کہتا ہوں۔ ان سے کہیے کہ وہ مجھے اپنا بھائی خیال کریں، انما المومنون اخوۃ۔ یہ کالج میں نے اس لئے قائم کیا ہے کہ حکومت مسلمانوں پر نظرِ عنایت مبذول رکھے اور انہیں دشمن نہ سمجھے۔ ہندو بھائیوں نے تو حکومت میں اچھا اقتدار حاصل کیا ہے، اب اگر ہم حکومت کا اعتماد حاصل نہ کریں گے تو حکومت میں کوئی جگہ نہ ملے گی۔ میں اور کالج کے اساتذہ اور طلبہ مذہب سے روگرداں نہیں ہیں۔ جب کالج قائم ہوا تھا تو اس وقت میں نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ تھے کہ کالج کے طلبہ کے سر پر قرآن ہوگا اور سیدھے ہاتھ میں احادیث ہوں گی اور بائیں ہاتھ میں دنیوی علوم کی کتابیں۔ آپ علمائے دیوبند سے پوچھیے کہ میری تفسیر میں کیا کوئی ایسی بات ہے جو شیخ بوعلی سینا کی کتابوں میں موجود نہ ہو؟ شیخ بوعلی سینا کی تصانیف تو دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں داخل ہیں اور مجھے ناحق طعن کرتے ہیں"۔ یہ سنتے ہی میں سرسید احمد خاں سے بغل گیر ہوگیا اور صاف الفاظ میں کہا کہ آپ اپنی بات پر قائم رہیے، میں علمائے دیوبند کو آپ کے خیالات سے [illegible] طرح سے آگاہ کردوں گا، اور وہ لکڑی جو اُن کا سر پھوڑنے کے

میرے ہاتھ میں تھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر پھینک دیا۔‘‘[1]

فاضل مضمون نگار نے اپنے سامنے سرسید کے عقائد پر ہونے والی گفتگو کے ذکر کو جس طرح قلم بند کیا ہے اس سے حیرت ہوتی ہے کہ وہ چودہ برس کی عمر میں ہی اس موضوع پر اس قدر وسیع معلومات رکھتے تھے کہ ایسی پیچیدہ گفتگو کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لیا ورنہ ان کے لئے ایک عرصہ بعد اسے اس کی جزئیات کے ساتھ اس وضاحت سے بیان کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ان کا طرزِ بیان نہایت دلچسپ اور انشائیہ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے البتہ بیان میں چند باتیں واقعاتی طور پر محلِ نظر ہیں اور بعض مقامات پر بیان کنندہ یا راوی میں سے کسی نہ کسی سے تسامح ہوا ہے۔ لہٰذا اصل حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے اس واقعے کا تجزیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ذیلی باتوں کو چھوڑتے ہوئے صرف چند بنیادی نکات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مُلّا صاحب کے بیان سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ:

۱۔ اس وقت مولانا محمد قاسم حیات تھے اور مُلّا صاحب نے انہی سے خلافِ اسلام تفسیری مقامات کی نشان دہی کروائی۔

۲۔ سرسید کی تفسیر شائع ہو چکی تھی اور وہی تفسیر مُلّا صاحب بغل میں داب کر علی گڑھ روانہ ہوئے۔

۳۔ روزِ گفتگو شبِ معراج تھی اور یہی موضوعِ گفتگو کی بنیاد بنا۔

ان نکات کا تجزیہ کرنے کے لئے ہمیں ان سے متعلق بالترتیب ان حقائق کو مدِنظر رکھنا ہوگا کہ:

۱۔ مولانا محمد قاسمؒ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء تک حیات تھے۔[2]

۲۔ مولانا کے سالِ وفات تک سرسید کی تفسیر کا صرف پہلا حصہ شائع ہوا تھا اور یہ اشاعت اول تھی جو اسی سال یعنی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔

۳۔ تفسیر کی اشاعت کے بعد سب سے پہلی ’’شبِ معراج‘‘ زیادہ سے زیادہ ۲۶ رجب

۱۲۹۷ھ مطابق ۳ جولائی ۱۸۸۰ء کو واقع ہوئی۔ ؎

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ سرسید کی تفسیر کا متذکرہ حصہ مولانا محمد قاسم کے انتقال والے مہینے تک چھپ چکا تھا اور مُلّا صاحب نے انہی دنوں میں ان سے قابلِ اعتراض مقامات کی نشان دہی کروائی جس پر وہ "سخت طیش کی حالت میں سرسید کا سر پھوڑنے کی غرض سے" علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ غضب کے اس عالم میں بھی ممکن ہے کہ دیوبند سے ان کی روانگی میں زیادہ سے زیادہ دو چار روز کی تاخیر ہوئی ہو مگر بڑی عجیب بات ہے کہ وہ مولانا کے انتقال (۴ جمادی الاولی) سے بھی پونے تین ماہ بعد (۲۶ رجب کو) علی گڑھ پہنچے۔ پھر بحث کے دوران سرسید کا ان سے یہ کہنا کہ "آپ کے پاس جو تفسیر ہے اسے کھول کر دیکھئے کہ آیت معراج کے تحت اس میں کیا لکھا ہے؟" اور جواباً وہاں معراج النبیؐ کے جسمانی یا روحانی ہونے کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ یا دوسرے صحابہ کی کسی روایت کا ذکر موجود ہونا قطعی محلِ نظر ہے۔ تفسیر کے متذکرہ حصے میں ان مقامات کا کوئی وجود نہیں۔ اس موضوع پر بحث تفسیر کے حصہ ششم میں شامل ہے جو مولانا محمد قاسم کے انتقال کے پندرہ سال بعد ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح سرسید کی زبانی ان سے یہ الفاظ اگلوائے گئے ہیں کہ "جب کالج قائم ہوا تھا تو اس وقت میں نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ تھے کہ کالج کے طلبہ کے سر پر قرآن ہوگا ......وغیرہ" اگر چہ یہ الفاظ ہو بہو وہ نہیں مگر انہی جیسے ہیں اور بہت مشہور ہیں البتہ وہ کالج کے قیام کے سولہ سترہ برس بعد سرسید کی ۱۸۹۳ء میں کی گئی ایک تقریر کا اقتباس ہیں ؎ جب کہ بیان کنندہ اسے زیادہ سے زیادہ ۱۸۸۰ء کا واقعہ بیان کرتا ہے۔

متذکرہ بالا نکات کے تجزیے کے بعد ہم سرسید کے اس مبینہ جواز کی طرف آتے ہیں جو انہوں نے مُلّا صاحب کے سامنے اپنے ذاتی عقائد اور اپنی تفسیروں میں اختلاف ہونے کے بارے میں بیان کیا۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے ظاہری طور پر ان سے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے ان عقائد کی تردید کی ہو جن کا وہ نہایت

میرے ہاتھ میں تھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر پھینک دیا۔"[1]

فاضل مضمون نگار نے اپنے سامنے سرسید کے عقائد پر ہونے والی گفتگو کے ذکر کو جس طرح قلم بند کیا ہے اس سے حیرت ہوتی ہے کہ وہ چودہ برس کی عمر میں ہی اس موضوع پر اس قدر وسیع معلومات رکھتے تھے کہ ایسی پیچیدہ گفتگو کے مفہوم کو پوری طرح سمجھ لیا ورنہ ان کے لئے ایک عرصہ بعد اسے اس کی جزئیات کے ساتھ اس وضاحت سے بیان کرنا ممکن نہ ہوتا۔ ان کا طرز بیان نہایت دلچسپ اور انشائیہ کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے البتہ بیان میں چند باتیں واقعاتی طور پر محل نظر ہیں اور بعض مقامات پر بیان کنندہ یا راوی میں سے کسی نہ کسی سے تسامح ہوا ہے۔ لہٰذا اصل حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے اس واقعے کا تجزیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ذیلی باتوں کو چھوڑتے ہوئے صرف چند بنیادی نکات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مُلّا صاحب کے بیان سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ:

۱۔ اس وقت مولانا محمد قاسم حیات تھے اور مُلّا صاحب نے انہی سے خلافِ اسلام تفسیری مقامات کی نشان دہی کروائی۔

۲۔ سرسید کی تفسیر شائع ہو چکی تھی اور وہی تفسیر مُلّا صاحب بغل میں داب کر علی گڑھ روانہ ہوئے۔

۳۔ روزِ گفتگو شبِ معراج تھی اور یہی موضوعِ گفتگو کی بنیاد بنا۔

ان نکات کا تجزیہ کرنے کے لئے ہمیں ان سے متعلق بالترتیب ان حقائق کو مدنظر رکھنا ہوگا کہ:

۱۔ مولانا محمد قاسمؒ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء تک حیات تھے۔[2]

۲۔ مولانا کے سالِ وفات تک سرسید کی تفسیر کا صرف پہلا حصہ شائع ہوا تھا اور یہ اشاعت اول تھی جو اسی سال یعنی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔

۳۔ تفسیر کی اشاعت کے بعد سب سے پہلی "شبِ معراج" زیادہ سے زیادہ ۲۶ر رجب

۱۲۹۷ھ مطابق ۴ جولائی ۱۸۸۰ء کو واقع ہوئی۔ [۳]

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ سرسید کی تفسیر کا متذکرہ حصہ مولانا محمد قاسم کے انتقال والے مہینے تک چھپ چکا تھا اور مُلّا صاحب نے انہی دنوں میں ان سے قابلِ اعتراض مقامات کی نشان دہی کروائی جس پر وہ ''سخت طیش کی حالت میں سرسید کا سر پھوڑنے کی غرض سے'' علی گڑھ روانہ ہوگئے۔ غضب کے اس عالم میں بھی ممکن ہے کہ دیوبند سے ان کی روانگی میں زیادہ سے زیادہ دو چار روز کی تاخیر ہوگئی ہو مگر بڑی عجیب بات ہے کہ وہ مولانا کے انتقال (۴ جمادی الاولیٰ) سے بھی پونے تین ماہ بعد (۲۶ رجب کو) علی گڑھ پہنچے۔ پھر بحث کے دوران سرسید کا ان سے یہ کہنا کہ ''آپ کے پاس جو تفسیر ہے اسے کھول کر دیکھئے کہ آیت معراج کے تحت اس میں کیا لکھا ہے؟'' اور جواباً وہاں معراج النبیؐ کے جسمانی یا روحانی ہونے کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ یا دوسرے صحابہ کی کسی روایت کا ذکر موجود ہونا قطعی محلِ نظر ہے۔ تفسیر کے متذکرہ حصے میں ان مقامات کا کوئی وجود نہیں۔ اس موضوع پر بحث تفسیر کے حصہ ششم میں شامل ہے جو مولانا محمد قاسم کے انتقال کے پندرہ سال بعد ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح سرسید کی زبانی ان سے یہ الفاظ اگلوائے گئے ہیں کہ ''جب کالج قائم ہوا تھا تو اس وقت میں نے جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ تھے کہ کالج کے طلبہ کے سر پر قرآن ہوگا ......وغیرہ'' اگرچہ یہ الفاظ بے ہودہ نہیں مگر انہی جیسے ہیں اور بہت مشہور ہیں البتہ وہ کالج کے قیام کے سولہ سترہ برس بعد سرسید کی ۱۸۹۴ء میں کی گئی ایک تقریر کا اقتباس ہیں [۳] جب کہ بیان کنندہ اسے زیادہ سے زیادہ ۱۸۸۰ء کا واقعہ بیان کرتا ہے۔

متذکرہ بالا نکات کے تجزیے کے بعد ہم سرسید کے اس مبینہ جواز کی طرف آتے ہیں جو انہوں نے مُلّا صاحب کے سامنے اپنے ذاتی عقائد اور اپنی تفسیروں میں اختلاف ہونے کے بارے میں بیان کیا۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے ظاہری طور پر ان سے یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنے ان عقائد کی تردید کی ہو جن کا وہ نہایت

جوش و خروش کے ساتھ پرچار کر رہے تھے۔ ان میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے آج کے پرستاروں کی مانند اس طرح جوازات کے دفتر قائم نہیں کرتے تھے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ وہ مُلّا صاحب کی بیان کردہ باتوں پر اپنے ایمان اور یقین کامل کا اظہار بھی کریں اور اس ایمان و یقین کے خلاف بھرپور انداز میں کتابیں بھی لکھیں اور ایسا کرتے ہوئے جملہ مفسرین کرام کو خوب خوب رگیدیں، اور اس تمام ''جدوجہد'' کا مقصد محض یہ ہو کہ انگریزی پڑھنے والے طلبہ، جو خلاف عقل باتوں کو تسلیم نہیں کرتے، مطمئن ہو جائیں گے! سرسید کی تفسیری تحریروں پر غور فرمایئے کہ انہوں نے جس فلسفیانہ اور منطقی انداز میں حتمہ و مسائل پر بحث کی ہے، کیا کالج میں انگریزی کی تعلیم پانے والے طالب علم اس قابل تھے کہ اس بحث کو سمجھ سکیں؟ پھر جب صورت یہ ہو کہ سرسید خود مُلّا صاحب سے ایک نوجوان کو نصیحت کرنے کی فرمائش کریں جو اُن کے بقول ''کالج میں انگریزی کی تعلیم پا رہا ہے اور علومِ دینیہ سے واقف نہیں ہے'' وہ نوجوان تو سرسید کی پروازوں کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے تھے۔ سرسید کے مخالفین ہوں یا ان کے شیدائی یا پھر غیر جانب دار محقق، کوئی بھی حتیٰ کہ گفتگو میں سرسید سے منسوب عقائد کو ان کے ذاتی افکار تسلیم نہیں کر سکتا۔ ان سے لاکھ اختلاف کرنے والے بھی یہ تسلیم کریں گے کہ وہ اندر اور باہر سے ایک تھے۔ انہوں نے خود پر کفر کے فتوے عائد ہونا گوارا کر لئے مگر اپنی بات پر اڑے رہے۔ وہ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔ بقول مولانا محمد قاسم ''کوئی کچھ کہو، وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ ان کے انداز تحریر سے نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے''۔ [۵] ایسی صورت میں ان کا اپنے ہی اشاعتی افکار کی تردید کرنا سخت تعجب انگیز ہے۔ یہ جواز کہ ''یہ کتاب میں نے ان طلبہ کے واسطے لکھی ہے جو انگریزی کی تعلیم پا رہے ہیں'' اس کی تردید میں سرسید کا درج ذیل بیان ہی کافی ہے:

''اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور لوہے کے ایک صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا

ا لیے رکھ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آئے اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تا کہ صرف خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سر دست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔'' ۲

یعنی سرسید جو کچھ لکھ رہے تھے وہ ان کے ''اپنے'' خیالات تھے جنہیں انہوں نے بہ مجبوری ظاہر کیا۔ غور کا مقام ہے کہ جو ''راز'' سرسید کے قریب ترین رفقائے کار سے عمر بھر مخفی رہا اور جسے سارے ملک کے علما، فضلا اور اساتذہ کبھی نہ جان سکے وہ انہوں نے مُلا صاحب پر پہلی ہی ملاقات میں عیاں کر دیا، اور پھر دیوبند کے تازہ فارغ التحصیل مُلا صاحب کی سادہ لوحی ملاحظہ فرمائیے کہ اسے نہ صرف بغیر سوچے سمجھے فوری طور پر قبول کر لیا بلکہ سرسید کو اپنی بات پر قائم رہنے یعنی اپنا سلسلہ جاری رکھنے کی تلقین بھی کر دی۔ میری دانست میں اصل بات یہ ہے کہ مُلا صاحب کی سرسید سے ملاقات ہی مشتبہ ہے۔ اُس زمانے میں آج کی مانند کہ ایک بچہ بھی اخبارات میں مشہور لوگوں کی تصاویر کی روز مرہ اشاعت کے باعث انہیں فوراً پہچان لیتا ہے، تصویر کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسے اخبارات موجود تھے۔ نیز علمائے کرام اس معاملے میں اتنے سخت واقع ہوئے تھے کہ اپنے حلقوں میں ایسے رسائل یا کتابیں نہیں گھسنے دیتے تھے جن میں تصویریں چھپی ہوئی ہوں۔ مُلا صاحب نے جس طرح اپنی کیفیت بیان کی ہے، یوں لگتا ہے کہ وہاں پر موجود سرسید کے کسی بزرگ دوست نے ان کے تیور دیکھتے ہوئے خود کو سرسید ظاہر کیا اور متذکرہ بالا گفتگو کر کے ان سے جان چھڑائی۔ اس طرح مُلا صاحب ان کی اصلیت نہ پہچان سکنے کے باعث ان تمام باتوں کو سچ سمجھ بیٹھے۔

سرسید کے آخری دور کے ایک رفیق کار عبدالرزاق کانپوری اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''علی گڑھ میں ان کے رفیق زین العابدین سب جج پنشنر تھے۔ سید

جوش و خروش کے ساتھ پرچار کر رہے تھے۔ ان میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے آج کے پرستاروں کی مانند اس طرح جوازات کے دفتر قائم نہیں کرتے تھے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ وہ مُلّا صاحب کی بیان کردہ باتوں پر اپنے ایمان اور یقین کامل کا اظہار بھی کریں اور اس ایمان و یقین کے خلاف بھرپور انداز میں کتابیں بھی لکھیں اور ایسا کرتے ہوئے جملہ مفسرین کرام کو خوب خوب رگیدیں، اور اس تمام ''جدو جہد'' کا مقصد محض یہ ہو کہ انگریزی پڑھنے والے طلبہ، جو خلاف عقل باتوں کو تسلیم نہیں کرتے، مطمئن ہو جائیں گے! سرسید کی تفسیری تحریروں پر غور فرمایئے کہ انہوں نے جس فلسفیانہ اور منطقی انداز میں متعدد مسائل پر بحث کی ہے، کیا کالج میں انگریزی کی تعلیم پانے والے طالب علم اس قابل تھے کہ اس بحث کو سمجھ سکیں؟ پھر جب صورت یہ ہو کہ سرسید خود مُلّا صاحب سے ایک نوجوان کو نصیحت کرنے کی فرمائش کریں جو ان کے بقول ''کالج میں انگریزی کی تعلیم پا رہا ہے اور علوم دینیہ سے واقف نہیں ہے'' وہ نوجوان تو سرسید کی پروازوں کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتے تھے۔ سرسید کے مخالفین ہوں یا ان کے شیدائی یا پھر غیر جانب دار محقق، کوئی بھی متذکرہ گفتگو میں سرسید سے منسوب عقائد کو ان کے ذاتی افکار تسلیم نہیں کر سکتا۔ ان سے لاکھ اختلاف کرنے والے بھی یہ تسلیم کریں گے کہ وہ اندر اور باہر سے ایک تھے۔ انہوں نے خود پر کفر کے فتوے عائد ہونا گوارا کر لئے مگر اپنی بات پر اڑے رہے۔ وہ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔ بقول مولانا محمد قاسم ''کوئی کچھ کہو، وہ اپنی وہی کہے جائیں گے۔ ان کے انداز تحریر سے نمایاں ہے کہ وہ اپنے خیالات کو ایسا سمجھتے ہیں کہ کبھی غلط نہ کہیں گے''۔ [۵] ایسی صورت میں ان کا اپنے ہی اشاعتی افکار کی تردید کرنا سخت تعجب انگیز ہے۔ یہ جواز کہ ''یہ کتاب میں نے ان طلبہ کے واسطے لکھی ہے جو انگریزی کی تعلیم پا رہے ہیں'' اس کی تردید میں سرسید کا درج ذیل بیان ہی کافی ہے:

''اگر زمانے کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور لوہے کے ایک صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا

ا   نہ جاتا کہ جب تک ایسا اور ایسا زمانہ نہ آئے اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے۔ اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا ہوں اور گراں بیچتا ہوں تا کہ صرف خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سر دست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔'' [۶]

یعنی سرسید جو کچھ لکھ رہے تھے وہ ان کے ''اپنے'' خیالات تھے جنہیں انہوں نے بہ مجبوری ظاہر کیا۔ غور کا مقام ہے کہ جو ''راز'' سرسید کے قریب ترین رفقائے کار سے عمر بھر مخفی رہا اور جسے سارے ملک کے علما، فضلا اور اساتذہ کبھی نہ جان سکے وہ انہوں نے مُلّا صاحب پر پہلی ہی ملاقات میں عیاں کر دیا، اور پھر دیوبند کے تازہ فارغ التحصیل مُلّا صاحب کی سادہ لوحی ملاحظہ فرمایئے کہ اسے نہ صرف بغیر سوچے سمجھے فوری طور پر قبول کر لیا بلکہ سرسید کو اپنی بات پر قائم رہنے یعنی اپنا سلسلہ جاری رکھنے کی تلقین بھی کر دی۔ میری دانست میں اصل بات یہ ہے کہ مُلّا صاحب کی سرسید سے ملاقات ہی مشتبہ ہے۔ اُس زمانے میں آج کی مانند کہ ایک بچہ بھی اخبارات میں مشہور لوگوں کی تصاویر کی روز مرّہ اشاعت کے باعث انہیں فوراً پہچان لیتا ہے، تصویر کا زیادہ رواج نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسے اخبارات موجود تھے۔ نیز علمائے کرام اس معاملے میں اتنے سخت واقع ہوئے تھے کہ اپنے حلقوں میں ایسے رسائل یا کتابیں نہیں گھسنے دیتے تھے جن میں تصویریں چھپی ہوئی ہوں۔ مُلّا صاحب نے جس طرح اپنی کیفیت بیان کی ہے، یوں لگتا ہے کہ وہاں پر موجود سرسید کے کسی بزرگ دوست نے ان کے تیور دیکھتے ہوئے خود کو سرسید ظاہر کیا اور متذکرہ بالا گفتگو کر کے ان سے جان چھڑائی۔ اس طرح مُلّا صاحب ان کی اصلیت نہ پہچان سکنے کے باعث ان تمام باتوں کو سچ سمجھ بیٹھے۔

سرسید کے آخری دور کے ایک رفیق کار عبدالرزاق کانپوری اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں:

''علی گڑھ میں ان کے رفیق زین العابدین سب جج پنشنر تھے۔ سید

صاحب ان کو ازراہِ محبت زینو بھیا کہتے تھے۔ ان کی ڈاڑھی بھی سید
صاحب سے طول وعرض میں ملتی تھی ..... '' ۷

ممکن ہے کہ مُلّا صاحب سے ملنے والے مبینہ سرسید ان کے رفیق زینو بھیا ہی ہوں۔

(الحق، اکوڑہ خٹک۔ مارچ اپریل ۱۹۹۶ء)

حوالہ جات

۱۔ برہان دہلی (ستمبر ۱۹۶۶ء) ص ۳۷-۵۰

۲۔ سرسید کی تعلیمی تحریریں (مرتبہ اصغر عباس) ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (۱۹۸۹ء) ص ۱۴

۳۔ جوہر تقویم (ضیاء الدین لاہوری) الجمعیۃ پبلی کیشنز لاہور (۲۰۰۳ء) ص ۲۲۵

۴۔ خطبات سرسید (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۷۳ء) ص ۲۷۶

۵۔ تصفیۃ العقائد (محمد قاسم نانوتوی) دارالاشاعت کراچی (۱۹۷۶ء) ص ۹

۶۔ حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ دوم، ص ۵۴۳

۷۔ تہذیب الاخلاق لاہور (ستمبر ۱۹۹۳ء) ص ۳۵

صاف گو سرسید کی تحریروں میں پرستاروں کی تحریفات

ہمارے بعض قلم کار جب مطالعے کے بغیر انشاپرداز یا محقق بننے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی تحریروں میں تضاد کا عنصر جنم لیتا ہے۔ انہیں خود بھی اس کا احساس ہوتا ہے اس لئے وہ قاری کے متوقع تاثر کو زائل کرنے کے لئے اوٹ پٹانگ توجیہات سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق وہ حقائق سے ناواقف قارئین کی آنکھوں میں دھول جھونک کر انہیں اپنا ہم خیال تو بنا لیتے ہیں مگر اپنے طرزِ عمل سے قوم میں غیر حقیقی رویے پیدا کرنے کی قباحت کو تقویت بخشتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا تھوڑا بہت مطالعہ تو ہوتا ہے مگر اس کی سوچ اور فکر محدود ہوتی ہے۔ جب اسے مصنف بننے کا شوق چراتا ہے تو وہ اس تضاد کو دور کرنے کے لئے حقائق کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اصل واقعات کو برعکس انداز میں بیان کرتا ہے، حوالوں کی تحریروں میں تحریف کرتا ہے اور اس طرح قوم کو بددیانتی کا درس دیتا ہے۔ یہ کام چھوٹے موٹے قلم کار ہی نہیں کرتے بلکہ نامور مصنفین کی تحریروں میں بھی یہ عنصر پایا جاتا ہے۔ اور جب انہیں اس تضاد یا تحریف کی نشان دہی کی جاتی ہے تو اس طبقے کے لوگ بھڑوں کے چھتے کی مانند ایسا کرنے والوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

سرسید احمد خاں ان شخصیات میں سے ہیں جو انتقال کے بعد اپنے ہی پرستاروں کا تختۂ مشق بن گئے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ ان کے شیدائی ان کے ساتھ ایسا مذاق کریں گے کہ انہوں

نے زندگی بھر جو خاص نصب العین اپنائے رکھا، اس کے بیان میں وہ ان کی حقیقی تصویر کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیں گے۔ سرسید کے افکار و نظریات ہمیں پسند ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ان پر نہایت خلوص کے ساتھ کاربند رہے۔ ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے نظریے کے مطابق ان کے افعال و کردار سے اتفاق یا اختلاف کرے۔ ان کے کاموں کو اچھا یا برا سمجھنا افراد کا اپنا معاملہ ہے لیکن بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرسید نے جو کچھ کہا اس کا اعتراف کئی مجالس میں برسر عام کیا اور اس پر فخر کا اظہار کیا۔ اس معاملے میں ان کی تحریریں تاریخی ریکارڈ کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس ان کے شیدائی اپنے ممدوح کی بیان کردہ مستند روایات پر حسب منشا رنگ چڑھا کر حقائق کو مسخ کرتے ہیں اور نیا ریکارڈ ترتیب دیتے ہیں۔

ہمارے ملک کی ایک محترم خاتون اہل قلم سید انیس فاطمہ بریلوی کی کتاب ''۵۷ کے ہیرو'' میں حضرت محل، جنرل بخت خان اور جنرل محمود خان کے حالات تحریر کئے گئے ہیں۔ محترمہ مصنفہ نے مؤخر الذکر شخصیت کے ذکر میں سرسید احمد خاں کی تصنیف ''سرکشی ضلع بجنور'' کو تمام تذکرہ نگاروں کا ماخذ بتایا ہے۔ خود انہوں نے متعدد مقامات پر اس کتاب سے حوالے دیئے ہیں مگر نہایت تعجب کی بات ہے کہ جس کتاب کا مقدمہ معروف مصنف پروفیسر رشید احمد صدیقی سے لکھوایا گیا اور انہوں نے ان کے مضامین کی تحسین کی ہو، اس میں سرسید جیسی نامور شخصیت کی تصنیف سے حوالوں کی تحریروں میں کھلی تحریف موجود ہو! حوالوں کی تحریریں باریک قلم کے ساتھ کتابت کی گئی ہیں اور انہیں سکیڑ کر الگ پیروں کی صورت بھی دی گئی ہے۔ اس انداز سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ حوالوں کے الفاظ اصل ماخذ سے ہو بہو نقل کئے گئے ہیں مگر یہاں کئی تحریریں اپنے الفاظ میں بیان کی گئی ہیں جس سے ان میں اصل مفہوم سے بالکل متضاد تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے حوالوں کے ساتھ اکثر صفحات نمبر نہیں بتائے گئے جس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا مقصد قاری کو تصدیق کے لئے اصل حوالے سے دور رکھنا یا پھر تمام کارروائی سرسید کی شخصیت کو تنقید سے بچانے کے لئے کی گئی ہے۔

کتاب میں ایک جگہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے ضمن میں سرسید کی ایک تحریر کے الفاظ یوں نقل کئے گئے ہیں:

''درحقیقت خفیہ خط وکتابت جان کرافٹ ولسن بہادر سے تھی''۔ [1]

اس فقرے میں ایک خاص مقصد کے تحت صیغہ متکلم کا لفظ ''ہماری'' حذف کر دیا گیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ سرسید کے ایک ساتھی ڈپٹی رحمت خاں، جسے محترمہ مصنفہ نے چند سطور قبل ''انگریزوں کے پٹھو'' کا لقب دیا ہے، اس کی انگریزوں سے خفیہ خط وکتابت تھی۔ متذکرہ فقرہ اس وقت تک بے معنی معلوم ہوتا ہے جب تک کہ اس کا پس منظر بیان نہ کیا جائے۔ اتفاق سے اصل ماخذ میں اس فقرے سے قبل کی چند سطور سرسید ہی کی زبانی صورت حال کی وضاحت کر رہی ہیں۔ سرسید فرماتے ہیں:

> ''منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور محمد صدر امین اور رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر اور میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے، اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط وکتابت رکھتے ہیں اس لئے ان کا قتل واجب ہے۔ اور درحقیقت ہماری خفیہ خط و کتابت جناب مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی۔'' [2]

اس عبارت میں سرسید نے اپنے ہمراہ دوساتھیوں کا ذکر کرتے ہوئے انگریزوں سے اپنی خفیہ خط وکتابت کا برملا اعتراف کیا ہے مگر ستم کی انتہا دیکھیے کہ ''لاتقربوالصلوٰۃ'' کی مانند فقرے کا ایک حصہ پیش کرنے اور اس میں سے بھی بنیادی لفظ ''ہماری'' غائب کر دینے سے مفہوم کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا؟

محترمہ مصنفہ نے ڈپٹی رحمت خان کو انگریزوں کا پٹھو قرار دیا مگر ان کے رفیق اعلیٰ سرسید

* منیر خان جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور محمد
صدر امین اور رحمت خان صاحب ڈپٹی کلکٹر اور میر سید تراب علی
تحصیلدار بجنور پر یہہ الزام لگایا کہ اُنھوں نے انگریزوں کی رفاقت
کی ہے اور اُنکو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے اور اب بھی انگریزوں سے
سازش اور خط وکتابت رکھتے ہیں اِس لیئے اِنکا قتل واجب ہے اور
درحقیقت ہماری خفیہ خط وکتابت جناب مسٹر جان کری کرافٹ
ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی اور اِس میں بھی کچھہ شک
نہیں کہ ہمارے ساتھہ فساد کرنے میں نواب کا بھی اشارہ تھا کیونکہ
اِسمیں بڑی حکمت یہہ تھی کہ جہادیوں کے ہاتھہ سے ہم لوگوں
کے مارے جانے میں نواب کی کچھہ بدنامی نہ ہوتی تھی اور کام نکلتا
تھا اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر کی نسبت علاوہ اِس الزام
کے یہہ بھی جرم لگایا گیا تھا کہ عیسائی مکتب ہر جگہہ بٹھاتا
پھرتا تھا غرضکہ منیر خان نے ہم پر زیادتی کی اور بجبر وحکومت
ہمکو طلب کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر حاضر ہوگے تو بہتر ہوگا اور بڑی
مشکل یہہ ہوئی کہ چند چپراسیان تحصیل ہم سے مخالف اور
جہادیوں سے جا ملے تھے اِس لیئے لاچار میں اور سید تراب علی
تحصیلدار اُسکے پاس گئے منیر خان نے مجھہ سے درباب مسئلہ جہاد
گفتگو کی میں نے اُس سے کہا کہ شرع کی بموجب جہاد نہیں ہے
اور اِسی قسم کی گفتگو کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے اُسکے دوسرے
دن منیر خان مذکور مولوی علیم اللہ رئیس بجنور پاس گیا اور درباب
مسئلہ جہاد اُنسے گفتگو کی تحقیق سنا کہ مولوی علیم اللہ نے بہت
دلیری سے اُس کے ساتھہ گفتگو کی اور بہت دلیلوں سے اُسکو قائل
کیا کہ مذہب کی روسے جہاد نہیں ہے مگر اِس گفتگو پر بہت
رنجیدہ ہوا اور منیر خان کے ساتھیوں نے مولوی علیم اللہ کے قتل کو
تلوار نکالی مگر لوگوں نے بیچ میں پڑ کر بچا دیا اُس کے دوسرے
دن منیر خان معہ اپنے ساتھیوں کے بجز اُن چند آدمیوں کے جنھوں نے
اِن گفتگوؤں کے بعد ساتھہ چھوڑ دیا تھا دھلی چلا گیا اور وہاں جاکر
لڑائی میں مارا گیا ۔

"سرکشی ضلع بجنور" میں سرسید کا مہم نویسی کے الزام کا ذاتی اعتراف

کا ذکر گول کر گئیں۔ ضلع بجنور کے مجسٹریٹ کلکٹر کی رپورٹ نمبر ۵۶ مورخہ ۵ جون ۱۸۵۸ء متذکرہ بالا تینوں اصحاب کے ذکر پر مبنی ہے۔ اس کی دفعہ ۱۵ کا متعلقہ اقتباس حقیقت حال کی یوں وضاحت کرتا ہے:

''ان تینوں صاحب نے سرکار کی بہت خیرخواہی کی۔ اگر ہم ان میں سے کسی کی زیادہ تر توصیف کریں تو نسبت سید احمد خاں کی ہی کر سکتے ہیں، کس واسطے کہ یہ صاحب بہت دانا ہیں۔ ان کی خیرخواہی ایسی جاں فشانی سے ہوئی کہ اس سے زیادہ ہرگز ممکن نہیں۔'' ؎

بجنور کے ہندو چودھریوں کی مسلم کشی کا ذکر کرتے ہوئے محترمہ مصنفہ سرسید کی ایک تحریر کو یوں درج کرتی ہیں:

''چاند پور میں اس سے زیادہ مصیبت دیکھنی تھی۔ جب وہاں پہنچے اور مسلمانوں کو معلوم ہوا تو صدہا آدمی گنڈاسہ، تلوار، بندوقیں لے کر چڑھ آئے اور سب بلوائی پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ چودھریوں نے سازش کر کے مسلمانوں کو مروا دیا، مسلمانوں کو ذبح کروایا، اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔'' ؎

اس عبارت میں بھی صیغہ متکلم کے الفاظ کو حذف کر کے مفہوم کو الٹ دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اصل عبارت کے الفاظ ''چودھریوں سے'' میں تحریف کر کے انہیں ''چودھریوں نے'' بنا دیا گیا جس سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ یہ سب کچھ ہندو چودھریوں کا کیا دھرا تھا اور انہوں ''نے'' سازش کر کے مسلمانوں کو مروایا جب کہ اصل صورت حال یہ ہے کہ یہ تمام کیفیت سرسید نے اپنے متعلق تحریر کی ہے۔ دراصل متذکرہ بالا عبارت سرسید کی کتاب کے دو مختلف صفحات سے چند فقرے منتخب کر کے مختصر طور پر ملتے جلتے انداز میں تشکیل دی گئی ہے۔ تفصیلات میں پڑے بغیر صرف انہی فقرات کی اصل عبارت درج کی جاتی ہے جو اپنی تشریح آپ ہے۔ سرسید

چاند پور میں اِس سے زیادہ مصیبت ہماری قسمت میں لکھی تھی کہ جب ہم قریب دروازۂ چاند پور کے پہونچے اور بدمعاشان مسلمانان چاند پور کو ہمارے آنے کی خبر ہوئی دفعتاً محلہ بتیاپارہ میں ڈھول ہوا اور صدہا آدمی تلوار اور گنڈاسہ اور طمنچہ اور بندوق لیکر ہم پرچڑھ آئے ہمارے مارے جانے میں کچھہ شبہہ باقی نتھا مگر فی الفور میر صادق علی رئیس چاند پور ہماری مدد کو پہونچے اور اپنے رشتہداروں اور ملازمان کو ساتھہ لیکر اُن مفسدوں کو روکا اِس عرصہ میں اور بہت سے آدمی شہر کے ہماری اعانت کو آئے اور اُن بدذاتوں کے ہاتھہ سے ہمکو بچایا اور میر صادق علی ہمکو اپنے مکان پر لیگئے اور وہاں امن دیا دوسرے روز خود ساتھہ ہوکر موضع چنچولہ تک پہونچا دیا وہاں سے ہم بچھراؤں گئے اور وہاں سے عرضی مفصل سرگذشت کی بحضور حکام لکھی اور چند روز بسبب بیماری کے مقام کرکے ڈپٹی صاحب براہ خورجہ بعد پہونچانے اپنے اہل و عیال کے اور میں صنوامیں سیدھا بمقام میرٹھہ بحضور حکام عالی مقام حاضر ہوئے *

«سرکشی ضلع بجنور» میں سرسید کا خود ہندوؤں سے مل کر مسلمانوں کو مروانے کے الزام کا ذکر

چاند پور میں جو ہمپر آفت پڑی کو اصلی منشاء اُسکا یہی تھا کہ ہم سرکار کے خیر خواہ اور طرفدار تھے اور علاقیہ سرکار کیطرفداری کر کر انتظام ضلع کا اُٹھا لیا تھا لیکن اِسقدر عام بلوے کے ہمارے پر ہولیکا یہہ سبب تھا اور سب بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ چودھریوں سے سازش کرکے نگینہ میں مسلمانوں کو مروادیا اور لوگوں کی جورو بیٹی کی بے عزتی کروائی اور ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا اب ہم زندہ نچھوڑینگے چنانچہ یہہ سب باتیں ہم اپنے کان سے سنتے تھے اور ہلدور سے حلوائیان اور جولاہوں کے زخمی مرد اور عورت اور بچے جو بچکر بھاگے تھے وہ تھوڑی دیر پہلے ہم سے چاند پور میں پہونچ چکے تھے اُنکا حال دیکھکر زیادہ تر لوگ ناراض ہورہے تھے کہ ہم بے گناہ دفعتاً وہاں جا پہونچے بیہودہ آدمی تو سمجھہ گئے کہ یہہ کام اِنھوں نے نہیں کیا مگر جاہل لوگوں نے نہ مانا

اپنے فرار کے واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چاند پور میں اس سے زیادہ مصیبت ہماری قسمت میں لکھی تھی کہ جب ''ہم'' قریب دروازہ چاند پور کے پہنچے اور ''بدمعاشان مسلمانان چاند پور'' کو ''ہمارے'' آنے کی خبر ہوئی، دفعتاً محلہ بتیا پارہ میں ڈھول ہوا اور صدہا آدمی تلوار اور گنڈاسہ اور طمنچہ اور بندوق لے ''ہم'' پر چڑھ آئے ...... سب بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ ''چودھریوں نے'' سازش کر کے نگینہ میں مسلمانوں کو مروا دیا اور لوگوں کی جورو بیٹی کی بے عزتی کروائی اور ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا، اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔'' ۵

ایک اور مقام پر محترمہ معنفہ سرکشی ضلع بجنور کے حوالے سے تحریر کرتی ہیں:

''سرسید لکھتے ہیں: لوگوں کو عبرت ناک سبق دینے کے لئے نجیب آباد میں بھی انہی مظالم کا اعادہ کیا گیا جو بقیہ ہندوستان پر توڑے جا رہے تھے......'' ۶

سرسید سے غلط طور پر منسوب کیا گیا یہ فقرہ سرسید کی ہزارہا صفحات پر پھیلی ہوئی تحریروں میں کہیں موجود نہیں اور نہ ان کی کسی تحریر یا تقریر سے اس قسم کا مفہوم برآمد ہوتا ہے۔

(نقیب ختم نبوت، ملتان۔ مارچ ۱۹۹۸ء)

حوالہ جات

۱ ۵۷ء کے ہیرو (سیدہ انیس فاطمہ بریلوی) اقبال بک ڈپو کراچی (۱۹۵۷ء) ص ۱۲۵

۲ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مطبع مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۳۷

۳ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ اول) مطبع مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۶۰ء) ص ۲۵

۴ علماء کے ہیرو، ص ۱۲۷

۵ سرکشی ضلع بجنور، ص ۱۰۲۔۱۰۶

۶ علماء کے ہیرو، ص ۱۳۶۔۱۴۳

مطالعۂ سرسید — تضادات کے چند اہم پہلو

مطالعۂ سرسید کے دوران بعض ایسے مقامات آتے ہیں جہاں قاری سخت الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ مضمون نگار یا مؤلف کی زیرِ مطالعہ باتوں پر یقین کرے یا اس کی کسی دوسرے موقع کی متضاد تحریر کو سچ مانے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی خاص مسئلے کے ضمن میں سرسید کے ''کارنامے'' کے طور پر بیان کردہ اس کا تجزیہ درست ہے یا اس ''کارنامے'' کے رد میں سرسید کا اپنا بیان قابلِ قبول ہے۔ جب وہ قومی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تاریخ کی باتوں کا سرسید کے اقوال و اعمال کے ساتھ موازنہ کرتا ہے تو انہیں ایک دوسرے کی ضد پا کر پریشان ہو جاتا ہے۔ میں اپنے تعلیمی نصاب کے شکار اس معصوم قاری کی بات نہیں کر رہا جو ہمارے موجودہ تعلیمی ماحول میں مخصوص حلقوں کی ہر بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے، میرا مطلب اس قاری سے ہے جو مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ذہن سے، ہاں — اپنے ذہن سے سوچتا ہے اور موضوعات سے متعلق سیاق و سباق کو بھی مدِ نظر رکھتا ہے، مگر چونکہ وہ بھی تعلیمی نصاب کی تکمیل کے مراحل سے گزر کر اس مقام تک پہنچا ہے اور یوں اجتماعی ذہنی دھلائی کے غیر محسوس عمل کے زیرِ اثر بھی رہا ہے اس لئے آزادانہ سوچ کے آغاز میں اس کی پریشانی ایک قدرتی امر ہے۔ یہ کیفیت اسے اصل مآخذ کی ورق گردانی پر آمادہ کرتی ہے اور تمام حالات پر غور کر کے وہ بالآخر حقائق تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ اس کے برعکس نصاب زدہ قاری اس ترد د میں پڑنے کی زحمت گوارا کرنا ضیاعِ اوقات سمجھتا ہے اور کولھو کے بیل کی مانند موجود، نصاب کے

کھونٹے کے گرد چکر لگاتے رہنے ہی کو فخر سمجھتا ہے۔ سہل پسندی اسے تحقیق کی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ اگر وہ اپنا نام خود ساختہ دانش وروں کی فہرست میں شامل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کا تعصب مزید قوی ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کے سامنے بے شک حقائق کا انبار لگا دیا جائے، وہ اپنے تعصب کو ذہن سے نہیں نکالتا بلکہ رٹے رٹائے جملوں سے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کے افکار پر بے شمار مقالے لکھتا ہے، کتابیں تالیف کرتا ہے مگر ان کی اہم تصانیف کا مطالعہ تو کجا، انہیں ہاتھ تک لگانے کی بھی نوبت نہیں آنے دیتا کیونکہ اس موضوع پر جو کچھ اس کے ذہن میں پختہ ہو چکا ہے وہی اس کا علم اول تا آخر ہے۔ وہ اسے ہی مکمل سمجھتا ہے اور مزید مطالعے کو اپنی توہین سمجھتا ہے لہٰذا اس کی تمام ''تخلیقات'' الفاظ کے الٹ پھیر سے گھوم پھر کر ایک ہی مخصوص نکتے پر آن جمع ہوتی ہیں۔ اس کا محدود علم ہی اس کی دانش وری کی بنیاد ہے اس لئے وہ حقائق قبول کر کے اپنی دانش وری کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اسے خدشہ ہوتا ہے کہ اس طرح اسے اپنی سابقہ تحریروں کا رد کرنا پڑے گا اور اس کی ''قدر و قیمت'' نہیں رہے گی۔ حقائق کو قبول نہ کرنے کے سبب اس کی تحریروں میں تضاد جنم لیتا ہے مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لاعلم رہنے ہی میں اپنی ''عافیت'' سمجھتا ہے یا پھر ''میں نہ مانوں'' کی گردان الاپتا رہتا ہے۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت ان کے بعض اختلافی تعلیمی و سیاسی افکار اور مذہبی عقائد کے باعث ان کے عہد ہی سے متنازعہ فیہ چلی آ رہی ہے۔ ان کے پرستار اہل قلم افراد کی جذباتی تحریروں نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کو بری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ بعض نامور اساتذہ اور معروف دانش ور اپنے لیکچروں اور مقالوں میں ان کے متنازعہ کردار کے بارے میں لفاظی کے وہ جوہر دکھاتے ہیں کہ اصل مسئلہ دبا دیا جاتا ہے اور صرف ہمدردانہ جذبات ابھارے جاتے ہیں۔ وہ علمی دلائل تسلیم نہیں کرتے بلکہ محض عقیدت کے سہارے مفروضے قائم کرتے ہیں۔ یہ رویہ موجودہ دور میں ہی نہیں اپنایا گیا، ہم اسے سرسید کے رفقا میں بھی موجود پاتے ہیں۔ ذیل میں چند مشہور شخصیات اور مصنفین کی تقریروں اور تحریروں سے وہ اقتباس پیش کئے جاتے ہیں جن میں واضح طور پر تضاد پایا جاتا ہے۔

نواب محسن الملک

سرسید کے دستِ راست نواب محسن الملک سرسید کے متعلق بیان کرتے ہیں:

"انہوں نے اسبابِ غدر پر ایک رسالہ لکھا اور ابھی غدر فرو نہ ہونے پایا تھا کہ اس کو ہندوستان اور ولایت میں مشتہر کر دیا ... اور باوجود یکہ اس وقت وہ نہ انگریزی جانتے تھے اور نہ انگریزوں سے اختلاط رکھتے تھے، صرف اپنی سچائی اور انگریزوں کے انصاف کے بھروسہ پر ایسے خطرناک رسالہ کے پیش کرنے میں کچھ بھی باک نہ کیا، اور چونکہ سچی نیت اور سچے دل سے حسبۃً للہ وہ رسالہ لکھا تھا، اس کا اثر بھی پورا ہوا اور لارڈ کیننگ نے امنِ عام کی منادی کرا دی۔"[1]

سن ستاون کے دوران سرسید نے اپنی جان کو داؤ پر لگا کر انگریز آقاؤں کو باغیوں کے غیظ و غضب سے بچایا، اہلِ وطن ہم مذہب انقلابیوں کی جاسوسی کرتے رہنے کے واضح اعترافات کئے، بجنور میں بغاوت دبانے کے لئے حاکمِ ضلع مقرر کئے جانے پر اپنی سرگرمیاں دکھائیں اور ان تمام خدمات کے صلے میں انعام و اکرام، دو نسلوں تک پنشن اور ترقی منصب سے نوازے گئے۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ "اسبابِ بغاوت" کی اشاعت کے وقت وہ انگریزوں سے اختلاط نہ رکھتے تھے، ستم ظریفی کی انتہا ہے۔ پھر متذکرہ رسالہ مبینہ "غدر" فرو ہونے کے بعد ۱۸۵۹ء میں شائع ہو کر ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ میں پیش ہوا، جبکہ امنِ عام اور معافی کے اعلانات اس سے کہیں قبل ہو چکے تھے۔ لہٰذا اسے سرسید کے رسالہ کا اثر ظاہر کرنا واقعۃً غلط بیانی ہے۔

الطاف حسین حالی

خواجہ الطاف حسین حالی سرسید کے مستند سوانح نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ سرسید کی تفسیر القرآن کے بارے میں ان کی مندرجہ ذیل تحریریں قابلِ غور ہیں:

"آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جودوثوق کہ ان کو اپنی رایوں پر تھا، وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔ بعض آیات قرآنی کے وہ ایسے معنی بیان کرتے تھے جن کو سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر ایسا عالی دماغ آدمی ان

کمزور اور بودی تاویلوں کو صحیح سمجھتا ہے۔ ہر چند کہ ان کے دوست ان تاویلوں پر ہنستے تھے مگر وہ کسی طرح اپنی رائے سے رجوع نہ کرتے تھے۔'' [۲]

''بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیونکر ایسی تاویلات باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیونکر ایسی فاحش غلطیاں ان کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں!'' [۳]

''اگر چہ سرسید نے اس تفسیر میں جابجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں۔'' [۴]

الہامی کتاب قرآن مجید کی تفسیر میں ''جابجا ٹھوکریں''، ''فاحش غلطیاں'' اور ''بودی تاویلیں'' موجود ہونا تسلیم مگر عقیدت کا عالم ملاحظہ فرمائیے کہ وہی تفسیر اس عالی دماغ شخص کی ''مذہبی خدمات میں ایک نہایت جلیل القدر خدمت''! تضاد بیانی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے؟

سرسید کی ایک تالیف کی تعریف کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں:

''کتاب خطبات احمدیہ، جو انہوں نے لندن جا کر تالیف کی ہے، ظاہر ہے کہ اپنے لئے ایک عمدہ ذخیرہ آخرت کا مہیا کیا ہے اور کیا عجب ہے کہ فریضۂ حج جو باوجود استطاعت اور قُربِ مسافت، ان سے ادا نہ ہو سکا، اس کی تلافی اسی تالیف سے ہو جائے۔'' [۵]

حیرت ہوتی ہے جب حالی ایک اور جگہ ان کی ''استطاعت'' کے بارے میں یہ تحریر کرتے ہیں:

''حج اور زکوٰۃ کی ان میں کبھی استطاعت نہیں ہوئی اور قرض روپیہ لے کر جس طرح کہ انہوں نے لندن کا سفر کیا اس طرح سفر حج کرنے کو وہ

ناجائز سمجھتے تھے۔'' ۷

یہاں پر سرسید کے حج کرنے یا نہ کرنے کے جواز سے قطعاً کوئی بحث نہیں، مقصود اس تضاد بیانی کی نشان دہی کرنا ہے جو شخصیت پرستی اور عقیدت کے جذبات کے تحت جنم لیتی ہے اور عظیم مصنفین میں بھی موجود ہوتی ہے۔

شیخ محمد اکرام

ہمارے زمانے کے ایک مصنف شیخ محمد اکرام مرحوم کی تالیف ''موجِ کوثر'' سے ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ سرسید کی مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف تحریر کرتے ہیں:

> ''ان کی سب سے زیادہ مخالفت اس وقت ہوئی جب انہوں نے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنہیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے، مثلاً شیطان، اجنہ اور ملائک کے وجود سے انکار، حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار، حضرت عیسیٰ و حضرت موسیٰ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے۔'' ۷

موجِ کوثر کے سالِ طبع اول (۱۹۴۰ء) سے صدی کے چھٹے عشرے تک کی اشاعتوں میں یہ عبارت یونہی شائع ہوتی رہی۔ اس کے بعد اس عبارت میں بیان کردہ سرسید کے عقائد کو حذف کر دیا گیا اور ان کی جگہ مندرجہ ذیل عقائد شامل کئے گئے:

> ''......مثلاً طیور مختنقہ اہلِ کتاب کے کھانے کا جواز، اجنّہ کے وجود سے انکار، آسمانوں کے متعلق عام نقطۂ نظر کی تردید، حدیث بحیرہ کی صحت سے انکار وغیرہ وغیرہ۔'' ۸

دونوں عبارتوں پر غور کیجیے۔ کس قدر دیدہ دلیری کے ساتھ عبارت میں ان عقائد کو، جو عام مسلمانوں میں بنیادی حیثیت کے طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں، کم شدت کے حامل اور فروعی اختلافات میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس تبدیلی کے ذریعے قاری کو پہلی عبارت سے متضاد

مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر مسلمان سرسید کے ولایت جانے سے پہلے ہی ان سے بدظن تھے۔ لیکن ان کی سب سے زیادہ مخالفت اُس وقت ہوئی جب اُنہوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ اور ان مذہبی عقائد کا اظہار کیا جنہیں عام مسلمان تعلیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے۔ مثلاً شیطان۔ اجنہ اور ملائک کے وجود سے انکار۔ حضرت عیسےٰؑ کے بن باپ کے پیدا ہونے یا زندہ آسمان پر جانے سے انکار۔ حضرت عیسےٰؑ و حضرت موسےٰؑ کے معجزات سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے۔ اور اگرچہ یہ صحیح ہے۔ کہ یہ کام اُنہوں نے خالص اسلامی ہمدردی سے متاثر ہو کر کیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان عقائد کی مخالفت لازمی اور قدرتی تھی۔

"موجِ کوثر" کی دو مختلف اشاعتوں میں ایک عبارت کے دو روپ
(پہلی عبارت میں ترمیم کر کے متضاد تاثر دیا گیا)

مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر مسلمان سرسید کے ولایت جانے سے پہلے ہی ان سے بدظن تھے، لیکن ان کی سب سے زیادہ مخالفت اُس وقت ہوئی جب انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ان خیالات کا اظہار کیا جنھیں عام مسلمان تعلیمِ اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے۔ مثلاً طیور مختنقہ اہلِ کتاب کے کھانے کا جواز، اجنہ کے وجود سے انکار، آسمانوں کے متعلق عام نقطۂ نظر کی تردید، حدیثِ تشبہ کی صحت سے انکار وغیرہ وغیرہ۔ سرسید نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ کام انھوں نے خالص اسلامی ہمدردی سے متاثر ہو کر کیا، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان خیالات کی مخالفت لازمی اور قدرتی تھی

دے کر سرسید کو یوں مظلوم ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فروعی اختلافات کے سبب زبردست مخالفت کرنا مخالفین کی زیادتی تھی۔

مولوی عبدالحق

ہمارے ہی زمانے کے ایک اور مؤلف مرحوم مولوی عبدالحق نے سرسید اور ان کے کارناموں پر چند طویل مضامین تحریر کئے ہیں اوران مضامین کو ایک کتاب کی صورت بھی دی گئی ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ ان مضامین میں فاضل مؤلف سرسید کے متروک خیالات کے زور پر اُن کے طویل قدوقامت میں مزید اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کتاب میں ''سرسید احمد خاں کی مجوزہ ورنیکلر یونیورسٹی'' اور'' سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ'' کے عنوانات کے تحت دو مضامین شامل ہیں جن کی بنیاد سرسید کی وہ مساعی ہیں جو انہوں نے اردو ذریعۂ تعلیم کی ترویج میں کیں۔ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام (۱۸۶۲ء) اور ورنیکلر یونیورسٹی کی تجویز (۱۸۶۷ء) اردو کی خدمات کے سلسلے میں سرسید کے نہایت ٹھوس اور مفید منصوبے تھے مگر ایک وقت آیا کہ انہوں نے خود ہی اپنے خیالات کو باطل ٹھہرایا اور پھر آخر عمر تک انگریزی ذریعۂ تعلیم کی ترویج کی جدوجہد کرتے رہے۔ ہمارے'' بابائے اردو'' انگریزی ذریعۂ تعلیم کے حق میں تو سرسید کی اصل کوششوں پر مکمل پردہ ڈالتے ہیں مگر اُن خیالات کو جنھیں سرسید رد کر چکے تھے،ان کے اصل افکار کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں سرسید نے ۱۸۸۲ء میں ایجوکیشن کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے اپنی رائے کو غلط قرار دیا اور اس کا یوں اعتراف کیا:

> ''میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ میکالے کے منٹ ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی،اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت

سے یورپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں۔
میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں
لانے کی کوشش کی۔ بہت سے مباحثے مختلف جلسوں میں کئے، اس
مضمون پر متعدد رسالے اور مضمون لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو
عرض داشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹفک
سوسائٹی علی گڑھ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا
انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا مگر انجام کار میں اپنی رائے کی
غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔'' [۹]

اس کے بعد ۱۸۸۴ء میں ایک تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ان خیالات کا اظہار کیا:

''میں کہتا ہوں کہ پنجاب کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ ان جدید علوم کو
اپنی زبان کے ترجموں سے حاصل کر لیں گے اور یہی بنا مشرقی زبان کی
یونیورسٹی قائم کرنے کی ہوئی مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں پہلا شخص
ہوں جس کے خیال میں بیس بائیس برس قبل یہی بات آئی تھی۔ میں
نے صرف اس کو خیال ہی نہیں کیا تھا بلکہ کر کے دکھایا اور آزمایا، تجربہ
کیا۔ سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جو اَب تک زندہ ہے۔ اس میں یہی کام
شروع کیا تھا تاکہ علوم اور فنون کی کتابیں اپنی زبان میں ترجمہ ہو کر قوم
کی تعلیم کے لئے شائع کی جائیں، مگر بعد تجربے کے معلوم ہوا کہ ان
جدید علوم کا ترجمہ کر کے اپنی قوم کو سکھلانا ناممکن ہے۔'' [۱۰]

پھر ۱۸۸۷ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ایک رپورٹ پڑھتے
ہوئے انہوں نے کہا:

''بانیانِ سوسائٹی کو بعد غور و تجربہ کے یقین ہو گیا کہ ملک کو بذریعہ
ترجموں کے اعلیٰ درجے کی تعلیم تک پہنچانا غیر ممکن ہے، اور جب تک کہ
زبان انگریزی ہی میں ان کو اعلیٰ درجے تک کی تعلیم نہ دی جائے ان کا

اعلیٰ درجے تک پہنچنا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔'' [۱۱]

سرسید کے جن اصلی خیالات کو مولوی عبدالحق چھپاتے ہیں ان کے چند اور نمونے ملاحظہ فرمائیں۔ان کی ۱۸۹۳ء کی ایک تقریر کے الفاظ درج ذیل ہیں:

''ہمیں اپنی قوم کو انگریزی زبان کی، جس کو خدا نے اپنی مرضی سے ہم پر حکومت دی ہے اور جس کے جانے بغیر ہم دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے بلکہ میں کہوں گا کہ دین کی بھی خدمت نہیں کر سکتے تعلیم دینا ہے۔'' [۱۲]

پھر ۱۸۹۶ء میں ان کے جو خیالات تھے وہ بھی قابل غور ہیں۔محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''انگریزی قطع نظر اس کے کہ وہ ہمارے حاکموں کی بھی زبان ہے اور علاوہ علوم حاصل کرنے کے اور بہت سے وجوہ سے ہمارے بکا آمد ہے، ہمارے دسترس میں ہے اور اس لئے لازم ہو گیا ہے کہ ہم اسی زبان میں ان علوم کو حاصل کریں۔'' [۱۳]

اس سے قبل ۱۸۸۱ء میں سرسید نے اپنے ایک مضمون میں انگریزی دانی کے پس منظر میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ بھی بوجوہ فاضل مضمون نگار نے قارئین کی نگاہ سے مخفی رکھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''ہم گورنمنٹ کی اس تجویز کو کہ تمام اعلیٰ عہدے بجز لائق انگریزی دانوں کے کسی کو نہ دئے جائیں، نہایت پسند کرتے ہیں اور جہاں تک اس میں سختی ہوتی جائے ملک کا اور قوم کا اور گورنمنٹ کا سب کا فائدہ سمجھتے ہیں۔'' [۱۴]

مندرجہ بالا حوالہ جات پر دوبارہ غور فرمائیں۔کہاں ۱۸۶۲ء اور کہاں ۱۸۹۶ء! کیا یہ جائز ہے کہ کسی شخص کے تیس پینتیس سال قبل کے متروک خیالات پر اس کی شخصیت تعمیر کی جائے؟

مولوی عبدالحق نے تحقیق کا ایک اور ''زبردست کارنامہ'' سرانجام دیا ہے۔وہ فرماتے ہیں:

"پاکستان بنانے کے بہت مدعی ہیں لیکن پاکستان کو نہ علما نے بنایا، نہ مسلم لیگ نے اور نہ کسی اور نے۔ یہ بھی اردو ہی کی برکت ہے۔" [۱۵]

محض اردو کی مخالفت کی وجہ سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قوم ہو گئے اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پڑی جو پاکستان کی بنا کا باعث ہوا۔ اور اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ تعمیرِ پاکستان کی بنیاد میں پہلی اینٹ اسی پیر مرد (سرسید) کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور وہ اینٹ اردو زبان تھی۔" [۱۶]

انہوں نے تین مختلف موقعوں پر یہ بیان کیا کہ:

"قصرِ پاکستان کی تعمیر میں سب سے پہلی اینٹ جس نے رکھی وہ اردو زبان ہے۔" [۱۷]

یہ نرالی منطق پڑھ کر ہماری آنکھوں کے سامنے سے کنوئیں کے مینڈک کا ماحول پھر گیا جس کی کل دنیا ایک خاص محدود دائرے کے گرد گھومتی ہے اور ہمارا ذہن حقہ پینے والے اس محقق کی جانب منتقل ہو گیا جس نے دعویٰ کیا کہ پاکستان کا قیام "حقہ" کا مرہونِ منت ہے۔ اس نے اس کا پس منظر یوں بیان کیا کہ: "مغلِ اعظم اکبر کے عہد میں کچھ انگریز سیاح ہندوستان میں آئے تو ایک نئی پیداوار تمبا کو ساتھ لائے جس سے ہندوستان کے لوگ ناواقف تھے۔ انہوں نے بادشاہ کی خدمت میں یہ تحفہ پیش کیا اور اس کا مصرف بتایا۔ بادشاہ کو تمبا کو نوشی کا مشغلہ اتنا بھلا لگا کہ حقہ اس کے دربار کی زینت بن گیا۔ اس نے خوش ہو کر انگریزوں کو تجارتی مراعات عطا کیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کا باعث ہوئیں۔ تجارت کی آڑ میں اس کمپنی نے آہستہ آہستہ اپنے مخصوص منصوبوں پر کام کرتے ہوئے پورے ملک میں پاؤں پھیلا دئے اور مغل حکمرانوں کو اس قدر بے بس کر دیا کہ ان کے تمام انتظامی اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور پھر ملک پر قبضہ کر لیا جو بعد میں کمپنی کی سرپرست حکومت برطانیہ کے تحت آ گیا۔ ایک عرصہ بیت جانے پر انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھیں تو انہوں نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا فارمولہ اپنایا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں دشمنی کے بیج بوئے اور اپنا کام چلاتے رہے۔ پھوٹ کے باوجود غیر ملکی

حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنا دونوں قوموں کا یکساں مطمح نظر رہا۔ بالآخر جب ان کی مشترکہ یا الگ الگ جدوجہد سے آزادی کی منزل سامنے آئی تو اس وقت صورت حال یہ تھی کہ ملک کی تقسیم ناگزیر ہو چکی تھی لہٰذا مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک پاکستان عالم وجود میں آیا۔ اگر انگریز اکبر بادشاہ کو حقے کے ''افادات'' سے آگاہ کر کے غیر معمولی طور پر خوش نہ کر پاتے تو نہ انہیں خاص مراعات ملتیں اور نہ وہ ہندوستان میں قدم جما پاتے۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہونے والا کوئی انگریز حکم نہ ہوتا۔ یوں مغل حکمرانوں کا دور فرنگیوں کی مداخلت کے بغیر جاری رہتا اور پورے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ہونے کے باعث کسی الگ مسلم ریاست کے قیام کی ضرورت نہ ہوتی۔ یوں کرۂ ارض پر پاکستان کا نام ونشان نہ ہوتا۔ یہ سب کچھ جو ہوا، محض حقے کی برکت سے ہوا، لہٰذا بلاخوف وخطر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ''حقہ'' پاکستان کی تعمیر میں خشت اول کی حیثیت رکھتا ہے''۔

مولانا صلاح الدین احمد

اسی دور کے ایک نامور ادیب مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے ''سرسید پر ایک نظر'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ وہ اس میں ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ہنٹر نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں یہ سوال کیا تھا کہ ''اے علماء محققان شرع اسلام! تمہاری اس معاملے میں کیا رائے ہے کہ اگر کوئی مسلمان بادشاہ ہندوستان پر ایسے وقت میں حملہ کرے جب کہ وہ انگریزوں کے قبضے میں ہو تو اس ملک کے مسلمانوں کو انگریزوں کی امان ترک کرنی اور اس غنیم کی مدد کرنی جائز ہے یا نہیں؟'' اس سوال کے جواب میں سرسید نے پہلے اصولی بحث کی ہے اور پھر آخر میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ''کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ کسی بڑے ملکی ہنگامے میں کل قوم کا کیا حال ہوگا؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں مسلمان وہی کریں گے جو اُن کی پولیٹیکل حالت ان سے

> کروائے گی''۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ جواب آج سے اسّی برس پہلے دیا گیا تھا، جب ہندوستان میں ملکی آزادی کا تصور بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ اسے سید کا کمالِ نظر کہیے یا خلوصِ نیت، بہرحال جو بات انہوں نے کم وبیش ایک صدی پیشتر کہی تھی وہ عین مین اسی طرح پیش آئی اور اس کا نتیجہ جو برآمد ہوا وہ خدا کے فضل سے سید مرحوم کے منشا کے عین مطابق اور ان کی روح پرفتوح کے لئے باعث صد ہزار تہنیت وتبریک ہے۔'' ۱۸

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب کے جواب میں مولانا صلاح الدین احمد نے سرسید کی جس اصولی بحث کا ذکر کیا ہے اسے تو قارئین سے دانستہ چھپا گئے مگر ان کی تحریر سے سیاق وسباق کے بغیر اپنے مطلب کا صرف ایک فقرہ چن کر اس سے من پسند نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے سرسید کے جواب سے صرف اس حصے کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے فاضل مضمون نگار نے وہ فقرہ منتخب کیا۔ سرسید لکھتے ہیں:

> ''پس میں ڈاکٹر ہنٹر صاحب کے سوال کا یہ جواب دیتا ہوں کہ انگریزوں کی امان سے علیحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا کسی حالت میں کسی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں ہے، اور اگر وہ ایسا کریں تو گناہ گار خیال کئے جائیں گے کیونکہ ان کا یہ فعل اس پاک معاہدہ کو توڑنا ہوگا جو رعایا اور حکام کے درمیان ہے اور جس کی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ البتہ میں یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ اگر آئندہ کوئی مسلمان یا اور بادشاہ ہندوستان پر حملہ کرے تو اس صورت میں باعتبار عمل درآمد کے ٹھیک ٹھیک مسلمان کیا کریں گے کیونکہ وہ شخص حقیقت میں نہایت دلیر ہے جو اپنے دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سوائے عام شخصوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دے بلکہ میری دانست میں تو شاید رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف سے بھی کچھ جواب دینا مشکل

بس میں ڈاکٹر ھنٹر صاحب کے سوال
کا یہہ جواب دیتا ہوں کہ انگریزوں کی
امان سے علحدہ ہونا اور غنیم کو مدد دینا
کسی حالت میں کسی مسلمان کا مذہبی
فرض نہیں ہی اور اگر وہ ایسا کریں
تو گنہگار خیال کیئے جاوینگے کیونکہ اُن
کا یہہ فعل اُس پاک معاہدہ کا توڑنا گاہو
جو رعایا اور حکام کے درمیان ہی اور
جسکی پابندی مرتے دم تک کرنا مسلمانوں
پر فرض ہی البتہ میں یہہ بات نہیں کہہ
سکتا کہ اگر آیندہ کوئی مسلمان یا اور
بادشاہ ھندوستان پر حملہ کرے تو اُس
صورت میں باعتبار عمل در آمد کے ٹھیک
ٹھیک مسلمان کیا کرینگے کیونکہ وہ شخص
حقیقت میں نہایت دلیر ہی جو اپنے
دلی دوستوں اور رشتہ داروں کے سواے عام
شخصوں کی طرف سے بھی کچھہ جواب دے
بلکہ میری دانست میں تو شاید رشتہ داروں

My reply to Dr. Hunter's question is, therefore, that in no case would it be the *religious* duty of any Mahomedan to renounce the Aman of the English, and render help to the invader. Should they do so, they would be regarded as sinners against their faith, as they would then break that holy covenant which binds subjects to their rulers, and which is the duty of the former to keep sacred to the last. I cannot, however, predict what the actual conduct of the Mussulmans would be in the event of an invasion of India by a Mahomedan or any other power. He would be a bold man indeed who would answer for more than his intimate friends and relations, perhaps not even for them. The civil

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر سرسید کے ریویو (مطبوعہ 1872ء) کی ایک عبارت

ہے۔ چنانچہ جو ملکی لڑائیاں انگلستان میں ہوئی ہیں ان میں باپ بیٹوں
سے اور بھائی بھائی سے لڑے تھے۔ پس کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا
کہ کسی بڑے ملکی ہنگامہ میں کل قوم کا کیا حال ہوگا۔ میں یقین کرتا ہوں
کہ ایسی صورت میں جو کچھ مسلمانوں کو اپنی ملکی حالت کے لحاظ سے
مصلحت معلوم ہوگی اس پر وہ عمل کریں گے، خواہ وہ حالت ان کے
موافق ہو یا نہ ہو۔'' ۱۹

غور فرمائیے کہ سیاق وسباق کے بغیر اور تحریف کردہ عبارت کے ذریعے مفہوم کو کس قدر تبدیل کیا گیا اور پھر اس پر خود جو بحث کی ہے اس کا غیر جانب دارانہ تجزیہ کیجیے۔ سرسید کی یہ تحریر ۱۸۷۱ء کی ہے اور فاضل مضمون نگار کا یہ ارشاد کہ اس وقت ہندوستان میں ملکی آزادی کا تصور بھی رونما نہیں ہوا تھا، ناقابلِ فہم ہے۔ حیرت ہے کہ ایک نامور ادیب اپنے ملک کے حریت پسندوں کی طویل جدوجہد کی اس تاریخ سے واقف نہ ہو جس میں دو چار آٹھ دس نہیں، ہزاروں افراد نے ملکی آزادی کے لئے اپنی جانیں تک نچھاور کر دی ہوں۔ اس تحریر سے صرف چودہ سال قبل کا وقوعہ ۱۸۵۷ء آخر کس مقصد کے تحت ظہور پذیر ہوا؟ آزادی کی راہ میں کی گئی تمام جدوجہد پر پانی پھیرنے کی جرأت سرسید کے شیدائیوں کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے! پھر سرسید کے ''کمالِ نظر'' کے ضمن میں ارشادِ سرسید کے ایک صدی بعد برآمد ہونے والے جس نتیجہ (حصولِ آزادی) کو ان کی ''منشا کے عین مطابق'' ہونا جتلایا گیا ہے وہ جھوٹی تاریخ گھڑنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں سرسید کے خیالات ڈھکے چھپے نہیں، انہوں نے بیسیوں مواقع پر ان کا اظہار عام جلسوں میں کیا ہے۔ ان کے بیشتر کاموں کے پیچھے صرف ایک ہی مقصد کارفرما تھا اور اس کے اظہار میں انہوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اپنی وفات سے محض چند ماہ قبل انہوں نے ایک تقریر میں ان خیالات کا اظہار کیا:

''ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم حضرت ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کی اطاعت دل و
جان سے کریں اور انکی دولت اور حکومت کی درازی اور قیام واستحکام کی
دعا کرتے رہیں۔'' ۲۰

بلکہ اس سے قبل وہ اپنی منشا ان الفاظ میں ظاہر کر چکے تھے:

''ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ صرف ایک زمانۂ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (ابدی) ہونی چاہیے۔'' [۲۱]

سرسید نے اس قسم کے خیالات کا اظہار ایک دو موقعوں پر نہیں کیا، بلکہ ان کی تحریروں سے اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ کیا حصولِ آزادی بقول فاضل مضمون نگار ''سرسید کی منشا کے عین مطابق'' تھا؟ اس بارے میں فاضل مضمون نگار کے تجزیے کا مقابلہ سرسید کے عظیم ترین معتقد الطاف حسین حالی کے تجزیے سے کیجیے اور ان میں زمین اور آسمان کا فرق ملاحظہ فرمائیے۔ حالی ایک مضمون میں اپنے ممدوح سرسید کی جدوجہد کا نچوڑ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''اس کوہ وقار شخص نے کبھی ہمت نہ ہاری، یہاں تک کہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا۔ اس نے ایک جماعت کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کر دی جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے، اس کو ہندوستان کے حق میں اور خاص کر مسلمانوں کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روز سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو ان کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔ وہ اپنی سلامتی، بلکہ اپنا وجود ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں۔ ان کو اپنے اسلاف کی اقبال مندی کے خواب نظر آنے موقوف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں۔ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی وفادار اور خیرخواہ رعایا بن کر رہیں۔'' [۲۲]

ایک مبینہ ''رازدار'' کی جعل سازی

شخصیت پرست افراد کا ایک بہت بڑا نولا اپنے ممدوحین کی فقط پرستش کرائے جانے سے غرض رکھتا ہے خواہ اس مقصد کے لئے انہیں جعل سازی سے ہی کیوں نہ کام لینا پڑے۔ ایسی ہی کیفیت کے تحت علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی ۱۹؍اکتوبر ۱۹۱۰ء کی اشاعت میں ''افشائے راز'' کے عنوان سے شخصیت سازی کا شوق اس طرح پورا کرنے کی کوشش کی گئی:

> ''چونکہ بحیثیت ایک رازدار کے ہوں لہٰذا اپنا نام ونشان ظاہر کرنا ضرور نہیں۔ قریب پندرہ برس کے صحبت سرسید مرحوم کی مجھ کو حاصل ہوئی۔ خلوت وجلوت میں ان کے ارشادات اور پولیٹیکل مصالح سے واقف ہوتا رہا۔ چونکہ بسبب اعزاز گورنمنٹ اور کالج کے بانی مبانی ہونے کے ایک بلوہ عام ان کی طرف خلوق کا ہوا، کوئی بہ ذریعہ حصول تعلیم اور کوئی ان کے حسن اخلاق سے اور کوئی بہ سبب اعزاز خاص کے گرویدہ ہوتا رہا۔ ایک روز صحبت خاص میں مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ہماری نیت صرف مسلمانوں کی بہبودی کی تھی، اسی واسطے قصر جہالت سے نکال کر علوم انگلشیہ کی طرف ہم نے متوجہ کیا تا کہ صورت ترقی قومی کی اس عہد سلطنت میں ہمارے واسطے بھی نکلے۔ چونکہ تشدد مولویوں کا بہ سبب دیگر خیالات کے بہت تھا، اس تشدد کے دفع کرنے کو ہم نے بہت سی تحریرات عقلی طور پر شائع کیں، صرف اسی مصلحت سے کہ'' بہ مرگش گیرتا بہ تپ راضی آید'' چنانچہ وہ مقصود اپنا حاصل ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ تفسیر کے لکھنے میں چند پڑھے لکھے لوگوں سے مدد لی اور اس میں بھی تصرفات عقلی کر کے اور قوموں کے خیالات اور سوالات کا جواب اس نہج سے لکھا کہ ان کو مقام اعتراض باقی نہ رہے اور مذہب اسلام کو موافق اپنی عقل کے صحیح جان کر گرویدہ ہوں۔ چنانچہ اس مضمون کو بھی ایک پیرایہ میں ہم لکچروں میں ظاہر کر چکے ہیں اور صاف لکھ دیا ہے کہ

جن کو خدا اور رسول پر ایمان ہے ان کے واسطے یہ تحریر نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کے واسطے ہے جو مشکوک ہیں "العاقل تکفیہ الاشارہ"۔

بالجملہ اس تمام بیان کے بعد مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ہم ایک عبارت اپنے عقیدے کے موافق لکھ کر خاص تم کو دیتے ہیں تا کہ داشتہ آید بکار۔ جب میں نہ ہوں اور فلسفہ اور سائنس کی تعلیم سے اس درجہ شیفتگی ہو کہ خود مسلمان اپنے عقائد قدیمہ سے باز آئیں اور غلبۂ دنیا کے سبب سے دین کو خلوط اور مندرس کر چلیں، تم اس وقت اگر موجود ہو (یا کوئی تمہارے دوستوں میں سے) اس وقت اس راز کو افشا کر دینا اور جو عقائد لکھ کر دیتا ہوں، بے تکلف ظاہر کرنا تا کہ ہم نے جس طرح دنیا درست کرنے کی فکر کی ہے عقبیٰ کی درستی بھی پیش نظر رہے۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ"۔

(خاص عقائد تحریری سرسید مرحوم)

"میں خدا کو حاضر ناظر جان کر گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک اور قدیم ہے ساتھ تمام اپنے اسماء وصفات کے، جیسا کہ قرآن اور حدیث اور کتب عقائد میں مذکور ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اور انبیاء ورسل اس کے فرستادہ اور برگزیدہ ہیں، جن کے سبب سے ہم کو خدا کی رضامندی اور نجات کا راستہ معلوم ہوا، اور جو کچھ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ہیں سب بجا اور درست ہیں۔ تنقیح حدیثوں کی علماء امت نے کر دی ہے اور ائمہ مجتہدین نے فروعات مسائل تحقیق کئے۔ وہ لوگ سب برحق ہیں اور ہم خلفائے راشدین کو بہ ترتیب خلافت احق جانتے ہیں اور تمام صحابہ واکابر تابعین اور اولیائے امت کو مقدس اور پیشوا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اپنے عصر کے علما اور مشائخ، جو حضرت دہلی میں رونق افروز تھے، میں نے "آثار الصنادید" میں ان کا ذکر کیا ہے اور مناقب

لکھے ہیں۔ کیا وہ سب تحریرات میں غلط سمجھتا ہوں، نعوذ باللہ؟ اور جس نے اتنا بڑا آسمان اور زمین اور تمام مادیات و مجردات بنائے، کیا اس کی قدرت بہشت و دوزخ وغیرہ تمام عُلویات بنانے میں عاجز ہے؟ کیا ہم تمام مخلوق کو بنا کر اور یہاں کی راحتیں اور مصائب دے کر عذاب وثواب آخرت میں نہیں کر سکتا؟ اور جس نے تمام حشرات الارض اور چرند و پرند لاکھوں کی طرح کے بنائے، یہاں تک کہ ہوا ایسی مخلوق بنائی کہ چھوتی ہے اور نظر نہیں آتی اور تمام لطیف و کثیف اور الطف و اکثف بنائے، کیا ملائک اور قوم جن بنا نہیں سکتا؟ علاوہ اس کے ہزاروں صنائع و بدائع ہم مخلوقات کو عقل اور صفائی ذہن اور جولانی طبع دے کر بنوا ڈالے اور باوجود کمال مجبوری ہر قسم کے بے شمار اختیارات بھی عطا کئے، کیا وہ ان عطا کردہ اختیارات سے بڑھ کر خود اختیار اعلیٰ سے اعلیٰ نہیں رکھتا؟ اور بہت سے امور مخلوقات میں اور عجائب، عجائب دنیا میں ایسے موجود ہیں کہ بیشتر مخلوق کی عقل ان کے سمجھنے سے قاصر ہے، تو کیا معاملات الٰہی اور عالم عُلویات اور عالمِ آخرت اس کوتاہ بین عقل سے ہم لوگ سمجھ سکتے ہیں؟ تو جو کچھ خدا اور رسول خدا کے فرمودہ ہیں، خواہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، سب برحق ہیں۔ یہی معجزات کا حال ہے۔ زیادہ تو ضرورت معاملات دنیا میں ہے اور اس کے تعقل اور فہم سے ترقی کی امید ضرور ہے۔ دیکھو فلسفہ اور سائنس نے دنیا کے متعلق کہاں کہاں تک رسائی کی ہے! صرف ان معاملات دُنیاوی کی طرف رجوع کرنے کو ہم نے سعی بلیغ کی، کالج مہیا کیا تعلیم کا رواج ان ممالک میں جاری کیا۔ ظاہر بین اس میں تشدد کرتے تھے، اس تشدد کو تقریر و تحریر سے دفع کرتے رہے تاکہ ہماری قوم بھی ترقی دنیاوی کرے اور "کاد الفقر ان یکون کفرا" سے محفوظ رہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔" ۴۳

تحریر بھیجنے والے ''رازدار'' نے اپنا مکمل نام راز میں رکھتے ہوئے اس کی جگہ صرف ''ش۔ن'' تحریر کیا۔ مضمون میں کچھ اس قسم کا اشارہ دیا گیا تھا کہ بعض قارئین کو اس سے ''شبلی نعمانی'' کا شبہ ہوا، چنانچہ انہیں استفسار کے متعدد خطوط موصول ہوئے اور گالیاں تک بھی ہیں۔ [۲۴] انہوں نے اس تحریر سے قطعی لاتعلقی کا اعلان کیا اور لکھنے والے کو ''شریر'' کہہ کر مخاطب کیا۔ [۲۵] باوجودیکہ یہ وعدہ کیا گیا کہ چند موانع دور ہو جانے کے بعد اصل نام بھی ظاہر کر دیا جائے گا، [۲۶] وہ نام ہنوز ایک راز ہے اگرچہ تمام معاملہ کھلی ہوئی کتاب کے مانند صاف ہے کہ یہ تحریر اول تا آخر جعلی ہے اور بددیانتی سے تصنیف کی گئی ہے۔

(سیارہ لاہور۔ فروری ۱۹۹۴ء)

حوالہ جات

۱۔ مجموعہ لکچرز و اسپیچ محسن الملک۔ نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء) ص ۳۱۶

۲۔ حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ دوم، ص ۵۲۲

۳۔ مقالات حالی (حصہ اول) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۵۵ء) ص ۲۲۵

۴۔ حیات جاوید (حصہ اول) ص ۲۳۲

۵۔ مقالات حالی (حصہ اول) ص ۵

۶۔ حیات جاوید (حصہ دوم) ص ۲۵۴

۷۔ موج کوثر (شیخ محمد اکرام) مرکنٹائل پریس لاہور (۱۹۴۰ء) ص ۵۴

۸۔ ایضاً، مطبوعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور (۱۹۷۹ء) ص ۹۲

۹۔ حیات جاوید (حصہ اول) ص ۴۳۶

۱۰۔ سفرنامہ پنجاب (مرتبہ سید اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء) ص ۲۴۸

۱۱۔ خطبات سرسید (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۷۳ء) ص ۴۹۸

۱۲۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۴۹۰

۱۳ ایضاً،ص ۵۶۵

۱۴ مقالات سرسید (جلد ہشتم) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۲ء) ص ۳۶

۱۵ خطبات عبدالحق (مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۵۲ء) ص ۳۳۸

۱۶ سرسید احمد خاں (مولوی عبدالحق) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۵ء) ص ۱۳۹

۱۷ خطبات عبدالحق۔ صفحات ۵۲۱،۴۳۹،۳۱۸

۱۸ سرسید پر ایک نظر (صلاح الدین احمد) اکادمی پنجاب لاہور (۱۹۶۰ء) ص ۲۶

۱۹ ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر (سرسید احمد خاں) ہنری ایس کنگ لندن (۱۸۷۲ء) ص ۸۷

۲۰ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید (مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۵۷۳

۲۱ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج۔ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۹۸ء) ص ۷۵

۲۲ کلیات نثر حالی (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۸ء) ص ۵۷

۲۳ باقیات شبلی (مرتبہ مشتاق حسین) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۵ء) ص ۲۰۶ تا ۲۰۸

۲۴ ایضاً،ص ۲۰۹

۲۵ ایضاً،ص ۲۰۵

۲۶ ایضاً،ص ۲۰۸

تذکرہ ہائے سرسید میں تضاد اور غلط بیانی کے چند اُور ماہر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اس دَور کے ایک نامور ادیب ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے ہم نظریہ بزرگ علامہ نیاز فتح پوری کے متعلق فخریہ انداز میں رقم طراز ہیں کہ وہ ''بیسویں صدی عیسوی میں سرسید کے صحیح جانشین تھے۔ وہ اپنے قلم کی جامعیت، فکر کی نہج اور مذہبی عقائد، سب میں سرسید کے بہت قریب تھے، اتنے قریب کہ کسی دوسرے ادیب کا نام بطور مثال بھی نہیں لیا جا سکتا''۔ [۱] اپنے بزرگ کی تقلید میں ڈاکٹر صاحب موصوف بھی سرسید کے بہت عقیدت مند دکھائی دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سرسید کی محبت میں دوسروں کی مانند ان کی تحریروں میں بھی تضادات پائے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال وقوعہ ۱۸۵۷ء کا تذکرہ ہے جسے وہ ''جنگِ آزادی'' قرار دیتے ہیں اور برطانوی اہلِ قلم کی جانب سے اسے ''غدر'' کہے جانے کو بدقسمتی بیان کرتے ہیں [۲] مگر ساتھ ہی ساتھ اسی مضمون میں اس وقوعہ کو غدر سے بھی برے ناموں سے یاد کرنے والے اس سرسید کی توصیف میں بھی مگن ہیں جس نے اپنے علاقے میں جنگِ آزادی کو ناکام کروانے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کیں اور ان خدمات کے صلے میں انعام اور ترقی کا حق دار قرار پایا۔ اگر وہ اپنے ممدوح کی مانند وقوعہ ۱۸۵۷ء کو ''ہنگامۂ مفسدی و بے ایمانی و بے رحمی'' اور نمک حرامی وغیرہ وغیرہ تسلیم کرتے، تب انہیں اس معاملے میں سرسید کی مدح سرائی کا واقعی حق پہنچتا تھا، مگر

موجودہ صورت میں وہ سر بسر تضاد بیانی کا شکار ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف بھی ڈاکٹر عبدالحق اور دیگر اہلِ قلم کی مانند، جو سرسید کو دو قومی نظریے کا بانی قرار دیتے ہیں، الجھن کا شکار ہیں۔ وہ اردو کے لئے فارسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری اختیار کرنے کا مطالبہ کرنے والے ہندوؤں کی متعصبانہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے با قاعدہ ۱۸۶۷ء کا حوالہ دے کر یہ انکشاف کرتے ہیں کہ "سرسید احمد خاں نے واشگاف الفاظ میں بیان کیا کہ ہندو اور مسلم دو جدا اور امتیازی فرق رکھنے والی قومیں ہیں اور وہ سماجی یا سیاسی مشترکہ مقاصد کے لئے کبھی ایک ساتھ کام نہ کر سکیں گی"۔ [۳] یہ امر قابلِ غور ہے کہ جب ایک بار سرسید نے ۱۸۶۷ء میں واضح الفاظ میں دو قومی نظریے کا اعلان کر دیا اور ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کی شہادت بھی دے دی (باوجودیکہ نہ سرسید کے یہ الفاظ تھے اور نہ ان کا یہ مفہوم، جدا اور امتیازی فرق رکھنے والی قومیں ہونے کا تصور اس وقت سے موجود تھا جب مسلمان اس ملک میں پہلی بار آن بسے، البتہ مشترکہ مقاصد کے لئے کام نہ کر سکنے کی بات الگ تجزیے کی متقاضی ہے) تو مضمون کے آخر میں ان پر ایک اور انکشاف ہوا کہ کانگرس کے خلاف سرسید کے ۸۸-۱۸۸۷ء کے بیانات اور تحریروں پر مشتمل کتابچے (دی پریزنٹ اسٹیٹ آف انڈین پالیٹکس) کے مندرجات کو درست طور پر "دو قومی نظریے کی پہلی شہادت اور اس کے ابتدائی نقوش" کہا جا سکتا ہے۔ [۴] موجودہ دانش وری کی بنیاد ہی غالباً یہ ہے کہ قارئین کو الفاظ کے بے ربط ہیر پھیر میں پھنسا کر اپنی تحریروں میں موجود زمانی اور واقعاتی تضادات کو چھپایا جائے۔ اگر بخر الذکر حوالہ "دو قومی نظریے کی پہلی شہادت" ہے تو بیس برس قبل کا سرسید کا مبینہ دو قومی نظریے کا "واشگاف الفاظ میں بیان" کہاں چلا گیا؟

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

ہمارے بعض قلم کار جب شخصیت پرستی کے زیرِ اثر مطالعے کے بغیر قلم اٹھاتے ہیں تو بعض اوقات تخیلاتی واقعات کو جنم دیتے ہیں اور ایسے قصے بیان کرتے ہیں جن کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تاریخ گھڑنے سے ان کا مقصد پورا ہو جائے گا حالانکہ اس طرح

خود اُن کی اپنی "قابلیت" کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹتا ہے۔ نظریاتی کشمکش میں نام پیدا کرنے کے شوقین ایک نامور اہلِ قلم" پروفیسر رفیع اللہ شہاب" کی ایک تحریر میں اسی قسم کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ آپ نے سرسید کی تفسیر القرآن کی اشاعت نو کا اہتمام کیا تو اس کے تعارف میں سرسید کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" کے متعلق لکھا:

"اس کتاب کے لکھنے پر انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن چونکہ یہ کتاب حقائق پر مبنی تھی اس لئے انگلستان کے بعض انسان دوست انگریزوں نے کوشش کر کے ان کی یہ سزا معاف کرا دی۔" [۵]

شاید موصوف کو یہ علم نہیں کہ نہ سرسید کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور نہ ان پر کسی قسم کا کوئی مقدمہ قائم ہوا، یہاں تک کہ اس سلسلے میں کبھی ان سے کوئی باز پرس بھی نہیں ہوئی، سزا معاف کروا دینے والے انگلستان کے انسان دوست انگریز اس قصے میں یونہی گھسیڑ دئے گئے۔ خدا جانے انہوں نے کس اثر کے تحت یہ حکایت تخلیق کر ڈالی؟ کتاب "اسباب بغاوت" کی اشاعت پر "زیادہ سے زیادہ" جو ردِّ عمل ہوا، وہ سرسید کے معتقد اعلیٰ الطاف حسین حالی کے درج ذیل الفاظ میں حقیقت حال کی بخوبی وضاحت کرتا ہے:

"گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی میں ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو لارڈ کینگ گورنر جنرل اور سر بارٹر فریئر نے، جو کونسل میں ممبر تھے، اس کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کیا مگر مسٹر سسل بیڈن نے، جو اس وقت فارن سیکرٹری تھے، اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے، اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے۔ لیکن چونکہ اور کوئی ممبر اُن کا ہم رائے نہ تھا اس لئے ان کی اسپیچ سے کوئی معتر نتیجہ پیدا نہیں ہوا۔" [۶]

جب وقت کا گورنر جنرل ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کے مضمون کو محض خیر خواہی پر محمول کر رہا تھا اور کونسل کا کوئی بھی رکن صرف ایک اہل کار کی ''غضب ناک تقریر'' کا ہم نوا نہ تھا تو انہیں کون نقصان پہنچا سکتا تھا؟ اس کے برعکس ہمارے پیشہ ور اہلِ قلم سرسید کے متعلق متذکرہ بے ضرر مخالف رائے کو بنیاد بنا کر اپنے مضامین میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ اس کتاب کی اشاعت پر انگریز حکمران ان کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔

آگے چل کر پروفیسر صاحب نے علمائے دین کی علمی چوریاں پکڑنے کا دعویٰ کیا ہے اور ایک چوری کا انکشاف ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''مسئلہ جبر و قدر پر مودودی صاحب کا کتابچہ ''مسئلہ جبر و قدر'' شائع ہوا تو اس کی بڑی تعریف کی گئی حالانکہ مودودی صاحب نے اسے لفظ بہ لفظ سرسید احمد خاں صاحب کی تفسیر سے نقل کیا تھا۔ بس اس میں یہ اضافہ کیا کہ کتابچے کے شروع میں اس کی تائید اور مخالفت میں پیش کی جانے والی آیات کو نقل کر دیا لیکن جب اصل مسئلہ پیش کیا گیا تو وہ لفظ بہ لفظ وہی تھا جو سرسید احمد خاں صاحب نے پیش کیا تھا۔'' [۷]

اس الزام کی حقیقت جاننے کے لئے حساس قارئین نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متذکرہ کتابچے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ دیگر قارئین بھی پروفیسر صاحب کا برآمد کردہ چوری کا مال ''لفظ بہ لفظ'' دیکھنے کے شدت سے متمنی ہیں۔ فاضل مدعی کو چاہیے تھا کہ بغیر ثبوت بات کرنے کی بجائے بطور نشان دہی اپنے دعویٰ کا کوئی ہلکا سا حوالہ پیش کر دیتے کیونکہ شہادت کے بغیر کوئی الزام ذرا بھی وقعت نہیں رکھتا بلکہ ''تہمت'' کے زمرے میں آتا ہے۔

پروفیسر صاحب موصوف نے اسی ''تعارف'' میں ایک اور انکشاف کیا کہ سرسید نے:

> ''اس وقت کے مشہور عالمِ دین شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ سے فتویٰ دلوایا کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا گناہ نہیں۔'' [۸]

جناب سلیم منصور خالد نے ایک مجلّہ میں ان کی اس تحقیق پر یہ رائے دی:

> ''پروفیسر رفیع اللہ شہاب کی اس نادرِ روزگار تحقیق پر داد نہ دینا ظلم ہے۔ سید احمد خاں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور جب وہ سات برس کے تھے تو شاہ عبدالعزیز دہلوی ابن شاہ ولی اللہ فوت ہوئے۔ انکارِ حدیث کے قلم بکف لکھاری کی چشمِ تخیل نے سات برس کے سید احمد کے ہاتھوں شاہ عبدالعزیز کو فتویٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ تحقیق، تخیل اور خواہشات کی اسارت کا یہ نمونہ خاصے کی چیز ہے۔'' [9]

درجِ بالا تبصرے کی اشاعت کے بعد متذکرہ تفسیر کی اگلی اشاعت میں فتوے سے متعلق عبارت کو ان الفاظ میں تبدیل کر دیا گیا:

> ''انہوں نے شاہ عبدالعزیز محدث کے ایک فتوے کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی کہ انگریزی کی تعلیم حاصل کرنا گناہ نہیں۔'' [10]

مزے کی بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف کے ''تعارف'' کی تحریر جو کیم اگست ۱۹۹۴ء کی لکھی ہوئی ہے اگلی اشاعت میں بھی وہی رہی مگر اس میں جو تبدیلی کی گئی، گو اس کے بعد کی ہے مگر وہ بھی اسی تاریخ کی لکھی ہوئی ظاہر کی گئی ہے۔ دیانت داری کا تقاضا تھا کہ اسے تبدیل کرتے ہوئے حاشیے میں اس امر کی وضاحت کی جاتی اور اپنی غلطی تسلیم کی جاتی۔ اس کے برعکس دیکھا جائے تو موصوف کے ممدوح اس معاملے میں نہایت عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ انکی اس صفت کی ایک مثال حاضر ہے۔ سرسید اپنی ایک علمی غلطی کا اقرار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''ابطالِ غلامی کا آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق کے متعدد پرچوں میں چھپا ہے اور جس کا نام "تبرية الاسلام عن شين الامة و الغلام" ہے، اس آرٹیکل میں ایک بڑی غلطی ہم سے ہوگئی ہے یعنی اس کے باب ہفتم میں بہ ذیل بیان ازواجِ مطہرات کے ہم نے ایک حدیث صحیح مسلم

سے، بہ نسبت حضرت جویریہ کے نقل کی ہے۔ افسوس ہے کہ جس کتاب
سے ہم نے حدیث کو نقل کیا، اس میں غلطی تھی افسوس ہے کہ ہم نے
اپنی جہالت سے اسی غلط عبارت کی پیروی کی، اسی کو نقل کیا اور اسی کو
بطور ایک اختلاف کے لکھ دیا۔ پس ہم اس خطا کا اور اپنی جہالت کا
اقرار کرتے ہیں ہم اپنے شفیق مولوی علی بخش خاں صاحب سب
آرڈینیٹ جج گورکھ پور کا شکر ادا کرتے ہیں جن کے فرمانے سے ہم
اس غلطی سے متنبہ ہوئے۔'' [11]

واضح ہو کہ مولوی علی بخش خاں سرسید کے سب سے بڑے دو مخالفین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے حرمین شریفین جا کر سرسید کے خلاف کفر کے فتوے جاری کروائے۔ یہاں سرسید نے اپنی غلطی کا اقرار جن الفاظ میں کیا، اسے پڑھ کر رشک آتا ہے۔ کاش، ان کے معتقد ایسی صورت حال میں ان کی ہلکی سی تقلید کا کوئی نمونہ پیش کر کے اپنی قابلِ احترام شخصیت کی روح کو سکون پہنچاتے!

ڈاکٹر فوق کریمی

''اسباب بغاوتِ ہند'' مطبوعہ ۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر فوق کریمی کے مقدمہ کے آخر میں درج ذیل عبارت تحریر ہے:

''۱۹۱۵ء میں جب گاندھی جی کانگرس میں شریک ہوئے تو اُن کے دل
میں مسلمانوں کے لئے بڑی وسعت تھی۔ وہ حق بات کہنے کے باعث
ہمیشہ فرقہ پرست کانگرسیوں کی نظر میں کھٹکتے رہے اور ۱۹۲۰ء میں جب
مسلمانوں کی طرف سے خلافت تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک نے
حکومت کے خلاف بدیشی مال کا بائیکاٹ اور انگریزی حکومت کی
نوکریوں سے مستعفی ہونے کا پروگرام بنایا تو مسلمانوں نے اس تحریک
میں گاندھی جی کو اپنا رہنما بنا کر مہاتما گاندھی کا لقب دیا اور گاندھی جی

اور مسلم رہنماؤں کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگرس میں ایسا اتحاد
پیدا ہو گیا اور ہندو اور مسلمان آپس میں ایسے بھائی بھائی ہوئے کہ
مسلمانوں نے مہاتما گاندھی اور شردھانند جیسے آریہ سماجی لیڈروں کو اپنے
کاندھوں پر اٹھا کر دہلی کی جامع مسجد کے ممبر پر کھڑا کر کے ان کی تقریر
بھی سنی۔ لیکن بد قسمتی سے خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کی سربراہی میں
جو ہندو مسلم اتحاد پیدا کیا تھا، وہ فرقہ پرست کانگرسیوں کی وجہ سے زیادہ
عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور انگریز کا پرچم لال
قلعہ سے اتار کر کانگرس کا سہ رنگا قومی پرچم لہرا دیا گیا جو اپنی پوری شان
وشوکت کے ساتھ ہندوستان کی عظمت و بلندی کی نشان دہی کر رہا
ہے۔ سرسید نے ''اسباب بغاوت ہند'' ۱۲۶ سال قبل لکھ کر
ہندوستانیوں کو جو آزاد پارلیمنٹ کا خواب دکھایا تھا آج اس کی جیتی
جاگتی تصویر آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ ہے۔ آج اس میں سرسید کے
بقول خود ہندوستانی قانون بناتے ہیں اور خود اس پر عمل کرتے ہیں
...... ''[۱۲]

اسی کتاب کا فوٹو سٹیٹ ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں پاکستان میں طبع ہوا تو اس میں درج بالا تحریر کو اس
طرح بدل دیا گیا:

''لیکن تقسیم سے پہلے کانگرس کے ارباب اقتدار نے آزادی کے بعد
سرسید کے جداگانہ انتخاب کے نعرہ کو باقاعدہ اپنا کر نہ صرف اسے
دستوری حیثیت دی بلکہ دستور ساز اسمبلیوں میں ریزرویشن کے ذریعہ
نمائندے بھی لے گئے اور انہیں سرکاری ملازمین میں ریزرویشن بھی دیا
گیا۔ آج ہندوستان کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے کے افراد حکومت سے اپنے
اپنے لئے جداگانہ ریزرویشن اور جداگانہ ملازمتوں کی مانگ کر رہے

اسبابِ بغاوتِ ہند ۹۸ مقدمہ

کے علاوہ کئی گائے رکھشا کے نام سے انجمنیں بنیں اور آریہ سماج کے بانی شری دیانند سرسوتی نے ایک یہ نعرہ دیا کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جنھوں نے سرسید کو کانگریس کی مخالفت پر مجبور کیا۔ لیکن کانگریس میں کچھ ایسے بھی ہندو تھے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت پر یقین رکھتے تھے اور ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمان اور ہندو کانگریس میں شانہ سے شانہ ملا کر چلیں اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہندو بھائی کریں لیکن ایسے لوگوں کی آواز آریہ سماجی ذہن کے لوگوں کے مقابلہ میں دبی ہوئی تھی اور آزادی کے بعد جب کانگریس میں فرقہ پرستی کو فروغ ملا تو کانگریس دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔

۱۹۱۵ء میں جب گاندھی جی کانگریس میں شریک ہوئے تو ان کے دل میں مسلمانوں کے لئے بڑی وسعت تھی وہ حق بات کہنے کے باعث ہمیشہ فرقہ پرست کانگریسیوں کی نظر میں کھٹکتے رہے اور ۱۹۲۰ء میں جب مسلمانوں کی طرف سے خلافت تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک نے حکومت کے خلاف بدیشی مال کا بائیکاٹ اور انگریزی حکومت کی نوکریوں سے مستعفی ہونے کا پروگرام بنایا تو مسلمانوں نے اس تحریک میں گاندھی جی کو اپنا رہنما بنا کر مہاتما گاندھی کا لقب دیا اور گاندھی جی اور مسلم رہنماؤں کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگریس میں ایسا اتحاد پیدا ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ایسے بھائی بھائی ہوئے کہ مسلمانوں نے مہاتما گاندھی اور شردھانند جیسے آریہ سماجی لیڈر کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا کر کے ان کی تقریر بھی سنی لیکن بدقسمتی سے خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کی سربراہی میں جو ہندو مسلم اتحاد پیدا کیا تھا وہ فرقہ پرست کانگریسیوں کی وجہ سے زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور انگریز کا پرچم لال قلعہ سے اتار کر کانگریس کا سہ رنگا قومی پرچم لہرا دیا گیا جو اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ ہندوستان کی عظمت و بلندی کی نشاندہی کر رہا ہے۔

سرسید نے اسبابِ بغاوتِ ہند ۱۲۶ سال قبل لکھ کر ہندوستانیوں کو جو آزاد پارلیمنٹ کا خواب دکھایا تھا آج اس کی جیتی جاگتی تصویر آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ ہے آج اس میں سرسید کے بقول خود ہندوستانی قانون بناتے ہیں اور خود اس پر عمل کرتے ہیں اگر آج ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ دیانت داری، صاف ذہن اور کشادہ دل کے ساتھ لکھی جائے تو سرسید کی کتاب اسبابِ بغاوتِ ہند آزادیٔ ہند کی راہ کا ایک سنگِ میل ثابت ہوگی اور سرسید انگریزوں کے دوست ہوتے ہوئے بھی ہمیں ہندوستان کی جنگِ آزادی کے رہنماؤں میں نمایاں نظر آئیں گے۔

فوق کریمی
۱۲/۱۰/۸۵

ڈاکٹر فوق کریمی کی مرتبہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" مطبوعہ ہندوستان میں
ان کے مقدمہ کی عبارت کا ایک صفحہ

ہیں۔ سرسید نے ''اسباب بغاوتِ ہند'' ۱۳۲ سال قبل کو رحکومت وقت سے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں نمائندگی نہیں دی جاتی اور نہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے دیئے جاتے ہیں۔ حکومت نے سرسید کی دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور سرسید نے یہ بھی پیش گوئی کی تھی کہ وقت آئے گا جب تم اس ملک کا خود قانون بناؤ گے اور خود اس پر عمل کرو گے۔ آج ہند و پاکستان میں قانون ساز مجالس سرسید کی پیش گوئی کی منہ بولتی تصویریں ہیں'' [۱۳]

چھپن صفحات کے مقدمہ میں محض چند سطروں کی عبارت میں تبدیلی کا پس منظر کیا ہے؟ کیا عبارت اول فاضل مصنف کے قومی مسلک کے مطابق نہیں تھی یا پھر انہوں نے ''گنگا گئے تو گنگا رام اور جمنا گئے تو جمنا داس'' کی ضرب المثل کی پیروی کی؟ بہرحال یہ واقعی بڑی کاریگری کی بات ہے کہ ایک مصنف اپنی پسندیدہ لیکن متنازعہ شخصیت کو تسلیم کروانے کے لئے دو قوموں کے متضاد قومی اور جذباتی ذہنوں کے مطابق جدا جدا اوزاروں سے کام لے!

اسی طرح سرسید کے نظریۂ قومیت کے بارے میں ڈاکٹر فوق کریمی کی تحریروں میں بہت بڑا تضاد ملتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۸ء میں ''اسباب بغاوتِ ہند'' کی اشاعت اوّل کا انتساب ان الفاظ میں تحریر کیا:

> ''سرسید کی روح کے نام جس نے ہندوستانیوں کو متحدہ قومیت کا درس دیا۔'' [۱۴]

لیکن ۱۹۸۵ء میں اپنے مقدمے میں ایک جگہ اس کے برعکس یوں لکھا:

> ''سرسید جو ہندو اور مسلمانوں کو اپنی ایک آنکھ اور ہندوستان کو ایک دلہن سے تشبیہ دیتے تھے، دوسرے انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بار بار بتایا لیکن جب بنارس میں کچھ ہندوؤں نے اردو کے خلاف آواز بلند کی تو اُن کے دل کو اس آواز اور تحریک سے سخت چوٹ پہنچی جس نے سرسید کے متحدہ قومیت کے نعرے کو متزلزل کردیا۔'' [۱۵]

کے علاوہ گئو کا نے رکھشا کے نام سے انجمنیں بنیں اور آریہ سماج کے بانی شری دیانند سرسوتی نے ایک یہ نعرہ دیا کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جنھوں نے سرسید کو کانگریس کی مخالفت پر مجبور کیا۔ لیکن کانگریس میں کچھ ایسے بھی ہندو تھے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت پر یقین رکھتے تھے اور ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمان اور ہندو کانگریس میں شانہ سے شانہ ملا کر جنگیں اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہندو بھائی کریں لیکن ایسے لوگوں کی آواز آریہ سماجی ذہن کے لوگوں کے مقابلہ میں دبی ہوئی تھی اور آزادی کے بعد جب کانگریس میں فرقہ پرستی کو فروغ ملا تو ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

لیکن تقسیم سے پہلے کانگریس کے اربابِ اقتدار نے آزادی کے بعد سرسید کے جداگانہ انتخاب کے نعرہ کو باقاعدہ اپنا کر نہ صرف اسے دستوری حیثیت دی بلکہ دستور ساز اسمبلیوں میں ریزرویشن کے ذریعہ نمائندے بھی لے گئے اور انہیں سرکاری ملازمین میں ریزرویشن بھی دیا گیا۔ آج ہندوستان کے اعلیٰ اعداد نا طبقے کے افراد حکومت سے اپنے اپنے لئے جداگانہ ریزرویشن اور جداگانہ ملازمتوں کی مانگ کر رہے ہیں۔

سرسید نے اسبابِ بغاوتِ ہند ۱۳۲ سال قبل لکھ کر حکومت وقت سے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں نمائندگی نہیں دی جاتی اور نہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے دیئے جاتے ہیں۔ حکومت نے سرسید کی دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور سرسید نے یہ بھی پیشگوئی کی تھی کہ وقت آئیگا جب تم اس ملک کا خود قانون بناؤ گے اور خود اس پر عمل کرو گے۔

آج ہند و پاکستان میں قانون ساز مجالس سرسید کی پیش گوئی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ آزادی برصغیر ہند و پاک کی تاریخ اگر دیانتدارانہ اور صاف ذہن سے لکھی جائے تو ہمیں سرسید انگریزوں کے دوست ہوتے ہوئے بھی آزادی کے رہنماؤں میں نمایاں نظر آئیں گے۔۔

فوق کریمی

ڈاکٹر فوق کریمی کی مرتبہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" مطبوعہ پاکستان میں ان کے مقدمہ کی عبارت میں رد و بدل

یہ لکھتے ہوئے موصوف بھول گئے کہ انہوں نے ایڈیشن اول کے مقدمہ میں متحدہ قومیت کے حق میں کئی صفحات پر مشتمل سرسید کی جن تقریروں کے اقتباسات پیش کئے تھے، وہ انہوں نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے سفر کے موقع پر کی تھیں۔ بنارس کا واقعہ ۱۸۶۷ء کی بات ہے۔ لہٰذا اس سے سترہ سال بعد کے متحدہ قومیت کے حق میں نعرے سترہ سال قبل کیسے حرزِلب ہو گئے؟ تضاد سے پُر اس فلسفہ پر سرسید کے شیدائی ہی کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں!

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ

سرسید کے ایک نہایت عقیدت مند خان بہادر ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ ''سرسید کا مذہب'' کے عنوان سے اُن کے خلاف علما کے جاری کردہ فتووں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند سے علما نے کہا کہ سرسید کے خلاف کفر کے فتوے پر آپ بھی دستخط کر دیجیے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تحقیقات کرلوں کہ آیا وہ کافر ہیں بھی یا نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نے تین سوالات لکھ کر سرسید کے پاس بھیجے:
>
> ۱۔سوال: خدا پر آپ کا کیا عقیدہ ہے؟
>
> جواب: خداوند تعالیٰ ازلی ابدی مالک وصانع تمام کائنات ہے۔
>
> ۲۔سوال: محمد ﷺ کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟
>
> جواب: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔
>
> ۳۔سوال: قیامت کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟
>
> جواب: قیامت برحق ہے۔
>
> اس کے بعد مولانا محمد قاسم نے ان لوگوں سے کہا کہ تم اس شخص کے خلاف دستخط کرانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے؟'' [۱۶]

خان بہادر موصوف کو حیاتِ سرسید کے آخری سالوں میں مدرسۃ العلوم کے طالب علم کی حیثیت میں ان سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی جبکہ سرسید کے خلاف کفر کے فتووں کی مہم مدرسہ

کے علاوہ گئو کشی کے خلاف گئو رکھشا کے نام سے انجمنیں بنیں اور آریہ سماج کے بانی شری دیانند سرسوتی نے ایک یہ نعرہ دیا کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے۔ یہ ساری باتیں ایسی تھیں جنھوں نے سرسید کو کانگریس کی مخالفت پر مجبور کیا۔ لیکن کانگریس میں کچھ ایسے بھی ہندو تھے جو ہندوستان کی متحدہ قومیت پر یقین رکھتے تھے اور ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ مسلمان اور ہندو کانگریس میں شانہ سے شانہ ملا کر چلیں اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہندو بھائی کریں لیکن ایسے لوگوں کی آواز آریہ سماجی ذہن کے لوگوں کے مقابلہ میں دبی ہوئی تھی اور آزادی کے بعد جب کانگریس میں فرقہ پرستی کو فروغ ملا تو کانگریس کئی دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔

لیکن تقسیم سے پہلے کانگریس کے ارباب اقتدار نے آزادی کے بعد سرسید کے جداگانہ انتخاب کے نعرہ کو باقاعدہ اپنا کر نہ صرف اسے دستوری حیثیت دی بلکہ دستور ساز اسمبلیوں میں رزرویشن کے ذریعہ نمائندے بھی لے گئے اور انہیں سرکاری ملازمین میں ریزرویشن بھی دیا گیا۔ آج ہندوستان کے اعلیٰ اسماء نا طبقے کے افراد حکومت سے اپنے اپنے لئے جداگانہ ریزرویشن اور جداگانہ ملازمتوں کی مانگ کر رہے ہیں۔

سرسید نے اسباب بغاوت ہند ۱۳۲ سال قبل لکھ کر حکومت وقت سے یہ شکایت کی تھی کہ ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں نمائندگی نہیں دی جاتی اور نہ انہیں سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدے دیے جاتے ہیں حکومت نے سرسید کی دونوں باتوں کو تسلیم کیا اور سرسید نے یہ بھی پیشگوئی کی تھی کہ وقت آئیگا جب تم اس ملک کا خود قانون بناؤ گے اور خود اس پر عمل کرو گے۔

آج ہند و پاکستان میں قانون ساز مجالس سرسید کی پیش گوئی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ آزادی برصغیر ہند و پاک کی تاریخ اگر دیانتدارانہ اور صاف ذہن سے لکھی جائے تو ہمیں سرسید انگریزوں کے دوست ہوتے ہوئے بھی آزادی کے رہنماؤں میں نمایاں نظر آئیں گے۔۔

فوق کریمی

ڈاکٹر فوق کریمی کی مرتبہ "اسباب بغاوت ہند" مطبوعہ پاکستان میں

ان کے مقدمہ کی عبارت میں رد و بدل

یہ لکھتے ہوئے موصوف بھول گئے کہ انہوں نے ایڈیشن اول کے مقدمہ میں متحدہ قومیت کے حق میں کئی صفحات پر مشتمل سرسید کی جن تقریروں کے اقتباسات پیش کئے تھے، وہ انہوں نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے سفر کے موقع پر کی تھیں۔ بنارس کا واقعہ ۱۸۶۷ء کی بات ہے۔ لہٰذا اس سے سترہ سال بعد کے متحدہ قومیت کے حق میں نعرے سترہ سال قبل کیسے متزلزل ہو گئے؟ تضاد سے پُر اس فلسفہ پر سرسید کے شیدائی ہی کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں!

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ

سرسید کے ایک نہایت عقیدت مند خان بہادر ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ ''سرسید کا مذہب'' کے عنوان سے اُن کے خلاف علما کے جاری کردہ فتووں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد قاسم بانی مدرسہ دیو بند سے علما نے کہا کہ سرسید کے خلاف کفر کے فتوے پر آپ بھی دستخط کر دیجیے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تحقیقات کرلوں کہ آیا وہ کافر ہیں بھی یا نہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم نے تین سوالات لکھ کر سرسید کے پاس بھیجے:

۱۔سوال: خدا پر آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب: خداوند تعالیٰ ازلی ابدی مالک وصانع تمام کائنات ہے۔

۲۔سوال: محمد ﷺ کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

۳۔سوال: قیامت کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے؟

جواب: قیامت برحق ہے۔

اس کے بعد مولانا محمد قاسم نے ان لوگوں سے کہا کہ تم اس شخص کے خلاف دستخط کرانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے؟'' [۱۶]

خان بہادر موصوف کو حیاتِ سرسید کے آخری سالوں میں مدرسۃ العلوم کے طالب علم کی حیثیت میں ان سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی جبکہ سرسید کے خلاف کفر کے فتووں کی مہم

العلوم کے قیام (۱۸۷۵ء) کے دنوں میں جاری ہوئی اور اس وقت تک خان بہادر دنیا میں بھی تشریف نہیں لائے ہوں گے۔ مولانا قاسم نانوتوی کا انتقال ۱۸۸۰ء میں ہو گیا تھا اور وہ اس وقت پنگھوڑے میں تھے۔ متذکرہ واقعہ کی تفصیلات انہیں کس نے مہیا کیں یا اس کا ماخذ کیا ہے، موصوف کی تحریر اس امر پر خاموش ہے۔ اس قدر اہمیت کے واقعے کا ذکر اس سے قبل مطبوعہ سرسید کے کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔ لہٰذا جب تک کوئی مصدقہ حوالہ یا ثبوت پیش نہ کیا جائے، اسے خان بہادر کے شوقِ عقیدت مندی کی تخلیق ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس بے سند حوالے کی اشاعت ترقی پذیر ہے۔ یہ مجلّہ ''صدقِ جدید'' لکھنؤ والوں کے مطالعہ میں آیا۔ انہیں بھلا لگا تو فوراً اسے اچک لیا اور اضافی فقرات اور پُر فریب کیفیت کے ساتھ خوب نمک مرچ لگا کر ۷/اکتوبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں پیش کر دیا۔ پھر شیخ اسماعیل پانی پتی نے اسے متذکرہ مجلّہ کی مصالحہ دار عبارت میں مقالاتِ سرسید کی تیرھویں جلد میں نقل کیا اور اس کے بعد چل چلا چل، شخصیت پرست دانشور اس مبینہ واقعے کی اشاعت میں جٹ گئے حالانکہ محض ''صدقِ جدید'' میں اس کا شائع ہو جانا اس کی صداقت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد خان بہادر نے سرسید کی وفات کے موقع کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:

> ''جب ان کا وصال ہوا تو جنازے کی نماز میں کالج کے طلبہ اور علی گڑھ شہر کے بہت سے لوگ آ کر شریک ہوئے۔ ایک شخص جلدی سے ہمارے ایک عالم مولوی الطاف علی کے پاس آئے (مولوی الطاف علی صاحب ہمارے سکول میں معلم تھے) اور ان سے دریافت کیا کہ ''سرسید پر کفر کا فتویٰ لگا ہوا ہے، ان کے جنازے کی نماز حرام ہے۔ آپ نماز میں شریک ہوں گے یا نہیں اور مجھے کیا رائے دیتے ہیں؟'' مولوی الطاف علی صاحب نے فرمایا کہ ''سرسید نہایت پکے مسلمان تھے اور شاہ غلام علی دہلوی کے مرید تھے۔ ان کے جنازے کی نماز پڑھنا ہر

مسلمان پر واجب ہے''۔ جس شخص نے سوال کیا تھا، اس نے کہا کہ
''اگر سرسید شاہ غلام علی دہلوی کے مرید تھے تو میں ضرور نماز میں شریک
ہوں گا''، اور وہ فوراً صف میں کھڑا ہو گیا اور نمازِ جنازہ ادا کی۔''

ان الفاظ پر ڈاکٹر شیخ عبداللہ کی تحریر ختم ہو جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بیان سے انہوں نے ایک تیسرے شخص کی زبانی قارئین کے ذہن میں یہ بات جمانا چاہی ہے کہ سرسید شاہ غلام علی کے مرید تھے۔ اس سے غالباً ان کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح سرسید سے عوامی عقیدت کی راہ ہموار ہوگی۔ حیرت ہوتی ہے کہ سرسید سے براہِ راست مراسم رکھنے والا شخص، جو متذکرہ مضمون کے شروع میں مطبوعہ اپنے خط میں ان کی ایک اہم رائے کا امین ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، ان کے معاملے میں صحیح صورتِ حال سے اس قدر بے خبر بھی ہو سکتا ہے! سرسید نے خود اپنی تاریخ پیدائش ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ بتائی ہے [۱۷] جب کہ شاہ غلام علی کی تاریخ وفات ۲۲ صفر ۱۲۴۰ھ بیان کی ہے، [۱۸] یعنی اس وقت سرسید کی عمر صرف سات برس تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں انہیں ایک نامور شیخ کا مرید ظاہر کرنے کا اعزاز عطا کرنا سرسید کے عقیدت مندوں کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مرید ہونا تو ایک طرف رہا، سرسید خود شاہ غلام علی سے اس عقیدت سے بھی انکار کرتے ہیں جو ایک مرید کو مرشد کے ساتھ ہوتی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

''سرسید نے ایک دفعہ شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے سامنے
یہ کہا تھا کہ ''گو اُس قسم کی عقیدت جیسی مریدوں کو اپنے شیخ کے ساتھ
ہوتی ہے، مجھ کو نہیں ہے لیکن نہایت قوی تعلق اور رابطۂ اخلاص میرے
دل میں شاہ صاحب کے ساتھ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میری لائف
میں اس بات کی تصریح کی جائے۔'' [۱۹]

اور حالی نے ان کی یہ آرزو ان کی سوانح میں پوری کر دی مگر ان سے قریبی تعلق رکھنے والے بعض شیدائی اس سے آگاہ نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر اے۔ایچ۔کوثر

سرسید پرست قلم کار سرسید کے بعض فقرات کے نت نئے مفہوم وضع کرنے میں خاصا ملکہ رکھتے ہیں۔ان کا ایک طریقۂ واردات یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں تحقیقی تاثر پیدا کرنے کے لئے بعض بے ضرر حوالے صحیح طور پر بھی نقل کرتے ہیں، مگر جہاں ان کے ممدوح کی سوچ صریحاً منفی ثابت ہوتی ہو وہاں سیاق وسباق کی کانٹ چھانٹ کرنے کے علاوہ الفاظ کو تبدیل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ایسے مواقع پر وہ حوالوں کی صحیح نشان دہی نہیں کرتے بلکہ صرف کتاب کا نام لکھ کر اپنی دانشوری کا بھرم قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔جوزیادہ ''دیدہ دلیر'' ہوتے ہیں وہ تصوراتی پروازوں کے ذریعے سرسید کے منہ سے وہ کچھ اگلواتے ہیں جو انہوں نے کبھی نہیں کہا ہوتا بلکہ ان کی فکر سے بالکل متضاد ہوتا ہے۔اس کارروائی سے ان کا مقصود محض اپنے ہیرو کی پرستش کروانا ہوتا ہے۔ڈاکٹر اے۔ایچ کوثر نے اپنے ایک مقالے میں اس ''فن'' سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔وہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' کے حوالے سے سرسید کی ''مبینہ'' جرأت مندی کے خودساختہ انکشافات منظر عام پر لائی ہیں۔بات اپنی ہوتی ہے مگر یوں بیان کرتی ہیں جیسے کہ یہ سب کچھ سرسید نے کہا ہو۔قاری کو یہ تاثر دیتی ہیں کہ ان کی بیان کردہ توضیح دراصل سرسید کی سوچ اور انہی کے الفاظ ہیں۔ملاحظہ فرمایئے:

> ''سرسید احمد خاں نے سرکشی کا مفہوم واضح کیا کہ سرکشی کسے کہتے ہیں؟ اپنی حکومت کی اطاعت نہ کرنا، اس سے مقابلہ کرنا اور گورنمنٹ کے اصول وقواعد کے خلاف عمل کرنا سرکشی ہے لیکن یہ حکومت ہندوستانیوں کی اپنی نہ تھی بلکہ دھوکے اور فریب سے ان کے ملک پر قبضہ کیا گیا تھا لہٰذا آزادی کے حصول کی جدوجہد کو سرکشی نہیں کہا جا سکتا۔گورنمنٹ کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ملک اور ہندوستانی عوام کو ہر لحاظ سے کمزور تر کرنا ان کا مقصد نظر آتا تھا۔رعایا میں علمی روشنی عام کرنے کی بجائے جہالت کی تاریکی کو اپنی حکومت کے حق میں

بہتر سمجھتے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہ تعلیم عام کرنے سے ہندوستانیوں میں سیاسی شعور پیدا نہ ہو جائے جو اُن کی حکومت کی پائیداری کے لئے خطرہ کا باعث ہو۔ انگریز ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے تھے، ان کی توہین کا کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ سپاہیوں سے یہ کہنا کہ تم کانوں میں بالیاں نہ پہنو، ڈاڑھی منڈاؤ، پگڑی کی بجائے وردی کی ٹوپی پہنو، پھر چربی والے کارتوسوں کا واقعہ جن کے متعلق ان کو یقین ہو چکا تھا کہ اس میں ہندو مسلم دونوں کے مذہبی نقطۂ نظر کے خلاف گائے اور سؤر کی چربی استعمال کی گئی ہے، ان کارتوسوں کے استعمال پر بزور طاقت اصرار کیا گیا لہٰذا کسی غاصب حاکم کے خلاف احتجاج کرنا سرکشی میں داخل نہیں جو زبردستی ان پر مسلط ہو گیا ہو۔''

''انہوں نے بتایا کہ ملازمتوں کے سلسلے میں مسلمانوں کو سراسر نظر انداز کیا گیا جس سے ان میں بے چینی و بے اطمینانی کا پھیلنا یقینی تھا۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کا بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دینا ان کے اس شبہ کو تقویت دیتا تھا کہ مسلمان بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ بنا کر انگریزوں کو اس ملک سے نکال کر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سید احمد خاں نے واضح کیا کہ اگر بادشاہ کے دل میں بادشاہت کی خواہش دوبارہ پیدا بھی ہوئی اور اسی نظریہ کے تحت انہوں نے حریت پسندوں کا ساتھ دیا ہو، تو بھی اسے بغاوت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ملک ان کا تھا، حکومت ان کی تھی۔ انگریزوں نے طاقت کے بل بوتے پر قبضہ جما رکھا تھا اور ہندوستانیوں کے ساتھ کبھی ہمدردی وانصاف کا برتاؤ نہ کیا تھا، کبھی ان کی بہتری و ترقی کو مدِ نظر نہ رکھا تھا بلکہ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھا۔ ان کے اوپر قوانین بھی ایسے مسلط کر دئے گئے تھے جو اُن

کے مزاج، رسم ورواج اوران کے مذہب وآئین کے خلاف تھے۔" [۳۰]

درج بالا باتیں یاان کا ہلکا سامفہوم بھی سرسید کی "اسباب بغاوت ہند" میں کہیں موجود نہیں۔ یہ سراسر ڈاکٹر صاحبہ کی ذہنی اختراع ہے جو ممکن ہے کہ ان کے مقالے کے مشہور و معروف معاونین (جن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری سرفہرست ہیں) کے مشوروں سے وجود میں آئی ہو۔ اس کے برعکس جب ہم اس تحریر کا سرسید کی فکر سے موازنہ کرتے ہیں تو سرسید کے درج ذیل بیانات محترمہ کی طرف سے ان پرڈالی گئی "گرد" کوصاف کرنے کے لئے کافی ہیں:

"گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکروفریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کوکسی حاکم کی اس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سو اسی ضرورت نے ہندوستان کواُن کامحکوم بنادیا۔" [۳۱]

"وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، ایک ایسازمانہ تھا کہ بےچاری انڈیا بیوہ ہوچکی تھی۔ اس کوایک شوہر کی ضرورت تھی، اس نے خود انگلش نیشن کواپناشوہر بنانا پسند کیا تھا ......انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگرمثل ایک دوست کے، نہ بطورایک دشمن کے۔" [۳۲]

"حق یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت شائستگی اورنرمی اور بحفاظت مذاہب مختلفہ حکومت کی۔ اس کی حکومت میں بجز اس کے اور کچھ کہانہیں جاسکتا کہ بادشاہانہ حکومت نہ تھی اورجس کی بڑی ضرورت تھی کہ ہندوستان میں ہو۔" [۳۳]

"اس ہنگامہ (۱۸۵۷ء) میں کوئی بات مسلمانوں کے مذہب کے موافق نہیں ہوئی۔" [۳۴]

دو قومی نظریے کی ابتدا سے متعلق ڈاکٹر صاحبہ مکتبہ فکر علی گڑھ کے مروجہ ''معکوس'' فلسفے کی ترجمانی کرتے ہوئے بیان کرتی ہیں کہ سرسید ''ایک مدت تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم کہتے رہے''۔ اس کی تائید میں وہ پہلے سرسید کے ''آخری مضامین'' سے ان کے انتقال سے چند ماہ پیشتر جون ۱۸۹۷ء میں شائع ہونے والے مضمون سے ایک حوالہ پیش کرتی ہیں، پھر تیرہ سال پیچھے ہٹتے ہوئے ان کی ۱۸۸۴ء کی ایک تقریر کا اقتباس نقل کرتی ہیں۔ اس کے فوراً بعد مزید سترہ سال پیچھے جا کر بیان کرتی ہیں کہ:

> ''لیکن ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے اردو فارسی رسم الخط کی جگہ ہندی دیوناگری رسم الخط کو جاری کرنے کا مطالبہ کر کے ہندوستانی قوم میں پھوٹ ڈال دی جس سے ''پہلی دفعہ'' ان کو یہ اندازہ ہوا کہ اب ہندو مسلم کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ اس لسانی تنازعہ نے نہ صرف فرقہ وارانہ منافرت و تفریق کو ہوا دی بلکہ ہندوستان کی سیاسی سطح پر تفریق کا پہلا پتھر نصب کر دیا۔ یہیں سے دو قومی نظریہ کا آغاز ہوتا ہے۔'' [۲۵]

متذکرہ معکوس فلسفے کا گمراہ کن انداز ''ایجاد'' کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا سہرا در اصل علی گڑھ کے فکری ترجمان مولوی عبدالحق کے سر رکھا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے ''بے مغز دانشور'' پیروکار اس فلسفہ کے غیر حقیقی پہلو کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے یا پھر وہ اپنے بزرگ کی تقلید میں جان بوجھ کر قوم کو گمراہ کرنے کا ''فریضہ'' انجام دے رہے ہیں۔ ان کے تتبع میں بہت سے غیر فکری، شوقیہ اور نصابی وغیر نصابی پیشہ ور قلم کار بھی شخصیت پرستی کے زیر اثر دانستگی یا نادانستگی میں اس غیر حقیقی توجیح کو بنیاد بنا کر سرسید کو دو قومی نظریے کا خالق قرار دیے جا رہے ہیں جس سے یہ فلسفہ حیرت انگیز طور پر پوری قوم میں زہر کی طرح سرایت کر رہا ہے۔

موصوفہ کی تحریروں میں متعدد جگہ تضاد کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ وہ سرسید کی ملی خدمات اجاگر کرنے کی غرض سے تحریر کرتی ہیں:

''۱۸۸۸ء میں ... انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر علی گڑھ میں یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوی ایشن قائم کی۔'' [۲٦]

پھر ایک اور جگہ ان کے قلم سے نادانستگی میں سچی بات بھی نکل جاتی ہے:

''سرسید نے ایک جماعت یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوی ایشن ۱۸۸۸ء میں (انجمن محبان وطن کے نام سے) بنائی جس میں ہندو مسلم دونوں شریک تھے۔'' [۲۷]

جب حقائق کا علم بھی ہو تو کیا حوالہ اول کا بیان بددیانتی پر مبنی نہیں؟ کیا یقین کیا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر اس ایسوی ایشن میں شرکت کی؟

رئیس احمد جعفری

تضاد کی ایک واضح مثال رئیس احمد جعفری کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔وہ ''حیات محمد علی جناح'' میں ''غدر کے بعد پہلی آواز'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کے عالم آشوب غدر کے بعد مسلمانوں کی حالت حد درجہ یاس انگیز اور مایوس کن ہو گئی تھی، سہام انتقام کا ہدف انہی کا سینہ بنایا جا رہا تھا، ہندو اور انگریز دونوں ان سے جلے ہوئے تھے اور اپنے پچھلے فرضی اور واقعی قرضے چکا رہے تھے۔ یہ حالت بیسویں صدی کے آغاز تک رہی۔اس زمانہ میں نواب محسن الملک کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد شملہ پہنچا اور وائسرائے ہند کے سامنے اس نے ایک مفصل عرضداشت پیش کی... وفد نے سب سے زیادہ زور جس چیز پر دیا تھا، وہ یہ تھا کہ قومی حیثیت سے مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہے جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے۔ یہ ''غدر کے بعد مسلمانوں کی پہلی آواز'' تھی جو ایک قوم کی حیثیت سے بلند ہوئی تھی اور اس میں صاف صاف قومی انفرادیت پر زور دیا گیا تھا۔'' [۲۸]

یہ اقتباس مصنف کی کتاب کے باب بعنوان ''دو قومی نظریہ'' سے نقل کیا گیا ہے۔کتاب

۱۹۴۶ء میں تصنیف ہوئی۔ پورے باب میں سرسید کا کہیں ذکر نہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب علیگ طبقے نے تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے شعبوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے دوقومی نظریے کو سرسید سے منسوب کرنے کی فکر کی ترویج کی تو مصنف موصوف بھی اس پراپیگنڈے کے زیر اثر آ گئے اور اپنی پچھلی تحریر کو فراموش کرتے ہوئے اپنی مرتب کردہ کتاب ''خطباتِ قائداعظم'' میں یوں پلٹا کھایا:

> ''دوقومی نظریہ کے اصل خالق سرسید احمد خاں تھے۔ انہوں نے بار بار اپنی تقریروں اور بیانات میں اعلان کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں۔ درحقیقت پاکستان کی خشتِ اول یہی تھی۔'' [۲۹]

دونوں تحریروں کا موازنہ کیجیے کہ موصوف کس طرح خود بیان کردہ بیسویں صدی کے آغاز میں ''غدر کے بعد مسلمانوں کی پہلی آواز'' کا گلا گھونٹ کر انیسویں صدی میں جا پہنچے اور سرسید کے بیانات کو جداگانہ قومیت یا قومی انفرادیت کی بنیاد قرار دے دیا۔ دراصل پروپیگنڈہ بڑی طاقتور شے ہے جو بڑے بڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

غلام احمد پرویز

ایک فریق سے بے محابا اندھی عقیدت اور دوسرے سے نفرت اور دشمنی کی انتہا کا جذبہ بعض افراد کے ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ اس کیفیت میں سچ قبول کرنا ان کے بس میں نہیں رہتا۔ حقائق ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں یا پھر وہ انہیں ارادتاً جاننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معلومات کا حدود دار بعہ مضحکہ خیز حد تک کم ہو جاتا ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو دوسروں کے الفاظ کو اپنے جذبات کی شدت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا عکس سرسید کے بیشتر دینی عقائد کے علمبردار غلام احمد پرویز کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''جوں جوں سرسید اپنے مشن میں کامیاب ہوتا جاتا تھا، مولوی صاحبان کی مخالفت شدید سے شدید تر ہوتی جاتی تھی۔ جب ان کے کفر

> کے فتوے اور جھوٹا پروپیگنڈہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اس کے خلاف ایک منظم عملی قدم اٹھایا اور علی گڑھ کے بالمقابل ایک دارالعلوم (دیوبند) قائم کر دیا۔" [۴۰]

محض "مولوی صاحبان" سے اپنی نظریاتی چپقلش کے زیرِ اثر موصوف نے کم علمی کا ثبوت دیا یا انہیں یاد نہ رہا کہ دارالعلوم دیوبند علی گڑھ کالج کے قیام سے قبل ہی موجود تھا۔ ان کے اپنے ممدوح سرسید کے بقول علی گڑھ میں "۲۴ مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ .... مدرسہ کھولا گیا" [۴۱] جبکہ دیوبند کا مدرسہ ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا تھا۔ [۴۲] جولائی ۱۸۶۷ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں سرسید نے خود اس کی پہلی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ تحریر کیا۔ [۴۳] پھر جولائی ۱۸۷۳ء میں اس کی ایک اور سالانہ رپورٹ پر ان کا ایک طویل تبصرہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا جس میں انہوں نے علما کو جی بھر کر لتاڑا اور اسلامی مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم پر کڑے الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ [۴۴]

ردِّ عمل کے طور پر سرسید کے خلاف جو استفتا شائع ہوا، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے ارشاد کے برعکس علی گڑھ کالج مدرسہ دیوبند وغیرہ کے "بالمقابل" قائم کیا گیا۔ اس کی متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

> "کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ ان دنوں ایک شخص ان مدرسوں کو، جن میں علومِ دینی اور ان علوم کی جو دین کی تائید میں ہیں تعلیم ہوتے ہیں، جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کان پور، اُن کو برا کہتا ہے اور اُن کی ضد میں ایک مدرسہ اپنے طور تجویز کرنا چاہتا ہے .... مسلمانوں کو ایسے مدرسے میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں؟" [۴۵]

موصوف غلط حوالے کے ساتھ کسی اور موقع پر کہے گئے سرسید کے الفاظ کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ "سرسید نے ۱۸۶۵ء میں کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی، مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بستی ہیں" [۴۶] حالانکہ اس انداز میں

انہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے علاوہ ایک تحریر میں وقوعہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک سنی سنائی بات دہراتے ہیں کہ ''مسلمانوں کے علمائے کرام نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ انگریزی کا پڑھنا حرام ہے''۔[۳۷] حوالے کے بغیر اس الزام میں بھی ''مولوی صاحبان'' سے محض دشمنی کا رنگ جھلکتا ہے۔ موصوف کے پیروکاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے دینی رہنما کے ان بیانات کی تائید میں مستند حوالے پیش کر کے مرحوم کی روح کو سکون پہنچائیں اور ثواب دارین حاصل کریں۔

ڈاکٹر بیگم ممتاز معین الحق

سرسید کے متعلق ایک مضمون میں ڈاکٹر بیگم ممتاز معین الحق تحریر کرتی ہیں کہ انہوں نے ''واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں جو کسی صورت میں ہندو اکثریت میں ضم نہیں ہو سکتی۔ مذہبی اعتقادات اور عبادات کے طریقے، سماجی رسوم، تہوار اور رہن سہن کا انداز، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں قوموں میں بنیادی اختلاف پائے جاتے ہیں۔''[۳۸]

محترمہ موصوفہ نے اس بیان میں بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کی ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کی تقریر کے الفاظ و معانی کو سرسید سے زبردستی منسوب کر دیا ہے حالانکہ سرسید کی عمر بھر کی تقریروں یا تحریروں میں اس سے برعکس مفہوم پایا جاتا ہے۔ سرسید کی وفات سے چند ماہ قبل ۱۲ جون ۱۸۹۷ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہونے والے ان کے مضمون سے ان کی فکر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بابت یہ تحریر کرتے ہیں:

> ''بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے، بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں، ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں، پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں

کے فتوے اور جھوٹا پروپیگنڈہ کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے اس کے خلاف ایک منظم عملی قدم اٹھایا اور علی گڑھ کے بالمقابل ایک دارالعلوم (دیوبند) قائم کر دیا۔'' [۴۰]

محض ''مولوی صاحبان'' سے اپنی نظریاتی چپقلش کے زیرِ اثر موصوف نے کم علمی کا ثبوت دیا یا انہیں یاد نہ رہا کہ دارالعلوم دیوبند علی گڑھ کالج کے قیام سے قبل ہی موجود تھا۔ ان کے اپنے ممدوح سرسید کے بقول علی گڑھ میں ''۲۴ مئی ۱۸۷۵ء روز سالگرہ ملکہ معظمہ ...... مدرسہ کھولا گیا'' [۴۱] جبکہ دیوبند کا مدرسہ ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا تھا۔ [۴۲] جولائی ۱۸۶۷ء کے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں سرسید نے خود اس کی پہلی سالانہ رپورٹ پر تبصرہ تحریر کیا۔ [۴۳] پھر جولائی ۱۸۷۳ء میں اس کی ایک اور سالانہ رپورٹ پر ان کا ایک طویل تبصرہ تہذیب الاخلاق میں شائع ہوا جس میں انہوں نے علما کو جی بھر کر نشانہ بنایا اور اسلامی مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم پر کڑے الفاظ میں نکتہ چینی کی۔ [۴۴]

ردِعمل کے طور پر سرسید کے خلاف جو استفتا شائع ہوا، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کے ارشاد کے برعکس علی گڑھ کالج مدرسہ دیوبند وغیرہ کے ''بالمقابل'' قائم کیا گیا۔ اس کی متعلقہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

> ''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ ان دنوں ایک شخص ان مدرسوں کو، جن میں علومِ دینی اور ان علوم کی جو دین کی تائید میں ہیں تعلیم ہوتے ہیں، جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کان پور، اُن کو برا کہتا ہے اور اُن کی ضد میں ایک مدرسہ اپنے طور تجویز کرنا چاہتا ہے ...... مسلمانوں کو ایسے مدرسے میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں؟'' [۴۵]

موصوف غلط حوالے کے ساتھ کسی اور موقع پر کہے گئے سرسید کے الفاظ کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ ''سرسید نے ۱۸۶۵ء میں کہا تھا کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی، مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں بستی ہیں'' [۴۶] حالانکہ اس انداز میں

انہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے علاوہ ایک تحریر میں وقوعہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک سنی سنائی بات دہراتے ہیں کہ "مسلمانوں کے علمائے کرام نے فتویٰ دے رکھا تھا کہ انگریزی کا پڑھنا حرام ہے۔"[۳۷] حوالے کے بغیر اس الزام میں بھی "مولوی صاحبان" سے محض دشمنی کا رنگ جھلکتا ہے۔ موصوف کے پیروکاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے دینی رہنما کے ان بیانات کی تائید میں مستند حوالے پیش کر کے مرحوم کی روح کو سکون پہنچائیں اور ثواب دارین حاصل کریں۔

ڈاکٹر بیگم ممتاز معین الحق

سرسید کے متعلق ایک مضمون میں ڈاکٹر بیگم ممتاز معین الحق تحریر کرتی ہیں کہ انہوں نے "واضح الفاظ میں اس امر کا اعلان کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں جو کسی صورت میں ہندو اکثریت میں ضم نہیں ہو سکتی۔ مذہبی اعتقادات اور عبادات کے طریقے، سماجی رسوم، تہوار اور رہن سہن کا انداز، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں دونوں قوموں میں بنیادی اختلاف پائے جاتے ہیں۔"[۳۸]

محترمہ موصوفہ نے اس بیان میں بانئ پاکستان محمد علی جناح کی ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کی تقریر کے الفاظ و معانی کو سرسید سے زبردستی منسوب کر دیا ہے حالانکہ سرسید کی عمر بھر کی تقریروں یا تحریروں میں اس سے برعکس مفہوم پایا جاتا ہے۔ سرسید کی وفات سے چند ماہ قبل ۱۲ جون ۱۸۹۷ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہونے والے ان کے مضمون سے ان کی فکر کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بابت یہ تحریر کرتے ہیں:

> "بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے، بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریہ کہلائے جا سکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں، ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں، پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں

کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی ہندو یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جا سکتے ہیں۔ ہم نے متعدد دفعہ کہا ہے کہ ہندوستان ایک خوبصورت دلہن ہے اور ہندو اور مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں۔ اس کی خوبصورتی اس میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں سلامت و برابر رہیں۔ اگر ان میں سے ایک برابر نہ رہی تو وہ خوبصورت دلہن بھینگی ہو جائے گی، اور اگر ایک آنکھ جاتی رہی تو کانی ہو جائے گی۔ ہم دونوں کی سوشل حالت قریب قریب ایک ہی سی ہے بلکہ بہت سی عادتیں اور رسمیں ہم مسلمانوں میں ہندوؤں کی آ گئی ہیں۔ پس جس قدر ان دونوں قوموں میں زیادہ تر محبت، زیادہ تر اخلاص، زیادہ تر ایک دوسرے کی امداد بڑھتی جائے اور ایک دوسرے کو مثل ایک بھائی کے سمجھیں، کیونکہ ہم وطن بھائی ہونے میں تو کچھ شبہ نہیں، اسی قدر ہم کو خوشی ہوتی ہے۔ ''ہم نے سنا ہے کہ بریلی میں ہندو مسلمانوں نے نہایت خوبی سے ایک دوسرے کی محبت کا ثبوت دیا ہے، یعنی بقرعید کے روز مسلمانوں نے گائے کی قربانی نہیں کی ... ہماری بھی مدت سے یہی رائے ہے کہ اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو اور مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا، اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔'' ۳۹

ڈاکٹر سید معین الحق

ہمارے بعض قلم کاروں کا یہ المیہ ہے کہ وہ جہاں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ذکر میں قومی جذبات کے مطابق غلط یا صحیح کی درست نشان دہی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، وہاں جب سرسید کا معاملہ ہو تو موصوف کے عوام دشمن نظریات و اقدامات سے اختلاف کرتے ہوئے

بھی ان کے حق میں جوازات تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ وہ اس مقصد کے لئے غلط بیانی سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دوسرے الفاظ میں قومی جذبات کی ترجمانی کا لہجہ صرف اور صرف اس لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ قارئین کو اچھا تاثر دے کر انہیں نفسیاتی طور پر سرسید کے دفاع کے حق میں تیار کیا جائے۔ یہ طریقہ واردات سرسید کے شیدائی قلم کاروں کا محبوب مشغلہ ہے جس کا ایک عکس ڈاکٹر معین الحق کی مندرجہ ذیل تحریر میں بخوبی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> ''انقلاب کے وقت سید احمد خاں کی عمر چالیس سال تھی اور ان کی حیثیت ایک سرکاری ملازم سے زیادہ نہ تھی۔ اس وقت ان کے سامنے اصلاحی پروگرام کا بھی کوئی منصوبہ نہ تھا، اس لئے یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ سید احمد خاں کسی سیاسی مصلحت یا منصوبہ کے تحت نہیں بلکہ حقیقتاً یہ سمجھتے تھے کہ انقلاب دراصل انقلاب نہیں بلکہ ''بغاوت'' ہے۔ انقلابیوں کی شکست اور اس کے بعد مسلمانوں کی تباہی و بربادی نے ان کو اس عقیدہ میں اور بھی پختہ کر دیا۔ چنانچہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، ان کا یہ عقیدہ پختہ تر ہوتا گیا کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب ''بغاوت'' اور ''غدر'' سے زیادہ کچھ نہ تھا۔''
>
> ''اس میں شک نہیں کہ آج ہماری رائے میں سید احمد خاں کا یہ عقیدہ اور اس کی بنا پر انہوں نے جو رویہ اختیار کیا، یقیناً غلط ہے، لیکن بحیثیت ایک مؤرخ کے ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی یہ غلطی اجتہادی تھی، اس کے پیچھے کوئی ذاتی غرض یا مقصد نہ تھا۔ سید احمد خاں کا جذبۂ ایثار بے مثال تھا۔ جنگِ آزادی کے اختتام پر حکومت نے ان کی وفاداری کے سلسلہ میں ان کو پنشن کے علاوہ ایک جاگیر بھی عطا کرنے کا ارادہ کیا لیکن انہوں نے پنشن تو قبول کر لی مگر جاگیر نہیں لی، اس وجہ

سے کہ یہ جاگیر ایک باعزت مسلم خاندان کی ضبط شدہ جائداد تھی۔ سید احمد خاں کے اس ایثار کا مؤرخ تذکرہ تو کرتے ہیں، لیکن اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے اس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی وفاداری کا رویہ کسی غرض یا فائدہ کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ ان کی یہ ایمان داری کی رائے تھی، اگر چہ غلط تھی۔ بہر حال سید احمد خاں اس انقلاب کو بغاوت ہی سمجھتے تھے اور ہمیشہ ان کا یہی خیال رہا، اس رائے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ سید احمد خاں کے خیال میں جن مسلمانوں نے اس انقلاب میں حصہ لیا انہوں نے سخت غلطی کی۔ وہ ان کی قربانیوں کو قدر کی نہیں بلکہ افسوس کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو مسلمانوں کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان پر نہایت سخت اور بعض اوقات ناروا الفاظ میں تنقید کرتے ہیں، مثلاً محمود خاں کو جو بجنور کے انقلابی رہنما تھے وہ "نامحمود" کہتے ہیں، اسی طرح بہادر شاہ ظفر کا ذکر انہوں نے بہت بُرے الفاظ میں کیا ہے۔" [۳۶]

صاحب تحریر کا یہ بیان کہ "حکومت نے ان کی وفاداری کے سلسلہ میں ان کو پنشن کے علاوہ ایک جاگیر بھی عطا کرنے کا ارادہ کیا لیکن انہوں نے پنشن تو قبول کر لی مگر جاگیر نہیں لی" سرسید کو اس امر میں قوم کا خیر خواہ ظاہر کرنے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اول تو جاگیر "عطا کرنے" کے الفاظ بالواسطہ طور پر فرنگی اقدامات کی تکریم میں قلم کار کے ذہن کی عکاسی کرتے ہیں جب کہ پنشن کے علاوہ جاگیر پیش کرنے کے ارادے کا ذکر قطعی غلط ہے۔ سرسید کا قد کاٹھ بلند کرنے کی اس "کہانی" کو انہوں نے اگلے صفحات میں یوں بیان کیا ہے:

"جنگ آزادی کے دوران سید احمد خاں نے حکومت کی جو خدمات انجام دی تھیں ان کے صلہ میں پنشن کے علاوہ شیکسپیئر یہ چاہتے تھے کہ

چاند پور کے علاقے میں ایک جاگیر کے لئے بھی سفارش کریں لیکن یہ
احمد خاں نے منع کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں
ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ایک مسلمان بھائی کی ضبط
شدہ جائداد میں سے انعامی جاگیر قبول کریں۔ مصلحتاً انہوں نے یہ
بہانہ کر دیا کہ وہ ہندوستان میں قیام کرنا نہیں چاہتے۔'' [۴۱]

حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے مصلحتاً کوئی بہانہ نہیں کیا۔ سرسید کے خود اپنے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ جاگیر کی پیشکش کے جواب میں وہ اپنے ردِ عمل کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میں نے اس کے لینے سے انکار کیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان
میں رہنے کا نہیں ہے، اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔'' [۴۲]

لطف کی بات یہ ہے کہ خود صاحبِ مضمون سرسید کو ایک دوسرے پہلو سے بلند قامت بنانے کے لئے اپنے ہی بیان کے برعکس اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''مسلمانوں کی تباہی سید احمد اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کا
اثر اُن کے دل پر اس قدر زیادہ ہوا کہ ایک موقع پر جلا وطنی اختیار کرنے
کا ارادہ کر لیا تھا لیکن بعد میں اس ارادہ کو ترک کر کے قوم کو تباہی سے
بچانے کی کوشش کرنے کی طرف توجہ کی۔'' [۴۳]

یعنی محض سرسید کو ہر لحاظ سے عظیم بتانے کے لئے دو متضاد پہلوؤں میں تعریف و توصیف کی گنجائش نکال لی گئی۔ یہ فنِ شخصیت پرستی کی خالص پیداوار ہے۔

جہاں تک پنشن کا تعلق ہے تو دراصل سرسید کے ارادہ ترکِ وطن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جاگیر کی پیشکش قبول نہ کرنے کے عوض اس کی معقول مقدار متعین کی گئی۔ کلکٹر و مجسٹریٹ بجنور کی سرکاری رپورٹ سے اس کی توضیح یوں ہوتی ہے:

''مناسب ہے کہ پنشن دوسو روپیہ ماہواری، خواہ دائمی ہو خواہ حینِ
حیات، ان کے اور ان کے بڑے بیٹے کے سرکار سے عنایت ہو۔ اور یہ
تجویز اس نظر سے ہے کہ ہم کو معلوم ہے کہ سید احمد خاں کا ارادہ ہے کہ

> بعد چند سال کے سیر اقالیم کی کریں، اس سبب سے زمینداری لینا منظور نہیں۔'' ۴۴

اس سے صاف ظاہر ہے کہ دونسلوں تک دوسو روپے ماہواری پنشن کی مقدار، جو اپنے زمانے میں بلاشبہ ایک ''جاگیردارانہ پنشن'' تھی، سرسید کو جاگیر وصول نہ کرنے کے عوض منظور کی گئی لہٰذا ''باعزت مسلم خاندان کی ضبط شدہ جائداد'' کی پیشکش کو قوم کی غم خواری میں ٹھکرا دینے کے افسانے قارئین کو محض گمراہ کرنے کی سازشیں ہیں۔

متذکرہ بالا بحث میں ہم نے ملاحظہ کیا کہ اوّل سرسید کی مبینہ ''خدمات'' کو بے غرض ظاہر کرنے کے لئے ان سے ''معلّیٰ ترک وطن کے بہانے'' کی آڑ میں جاگیر ٹھکرائی گئی جبکہ صورت دوم میں ''قوم کو تباہی سے بچانے کی خاطر'' ان سے جلاوطنی کے ارادے کو ترک کروانا پڑا۔ شاید دانشوری اسی کا نام ہے کہ اپنی دانش کے زور سے سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دکھایا جائے۔

(الحق اکوڑہ خٹک۔ ستمبر ۲۰۰۰ء)

حوالہ جات

۱۔ نگار کراچی (نومبر دسمبر ۱۹۷۰ء) ص ۵

۲۔ دی پریزنٹ اسٹیٹ آف انڈین پالیٹکس (مرتبہ تھیوڈور بیک) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور (۱۹۸۲ء) پیش لفظ ص ۵

۳۔ ایضاً ص ۷

۴۔ ایضاً ص ۱۳

۵۔ تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) دوست ایسوسی ایٹس لاہور (۱۹۹۴ء) تعارف صفحہ اول

۶۔ حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کانپور (۱۹۰۱ء) حصہ اول ص ۸۹

۷۔ تفسیر القرآن (محولہ بالا) تعارف صفحہ دوم

۸۔ ایضاً صفحہ اول

۹۔ نقطۂ نظر اسلام آباد (اپریل تا ستمبر ۱۹۹۷ء) ص ۳۰۔۳۱

۱۰۔ تفسیر القرآن (محولہ بالا مطبوعہ ۱۹۹۸ء) تعارف صفحہ اول

۱۱۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ (جمادی الاول ۱۲۸۹ھ) ص ۲۰۲

۱۲۔ اسباب بغاوت ہند (سرسید احمد خاں) انجمن ترقی اردو ہند دہلی (۱۹۸۵ء) ص ۲۸

۱۳۔ ایضاً مطبوعہ تہذیب الاخلاق ٹرسٹ لاہور (۱۹۹۱ء) ص ۶۸

۱۴۔ ایضاً مطبوعہ یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ (۱۹۵۸ء) ص ۳

۱۵۔ ایضاً (مطبوعہ دہلی) ص ۶۷

۱۶۔ مقالات یوم شبلی (مرتبہ خان عبید اللہ خان) اردو مرکز لاہور (۱۹۶۱ء) ص ۶۸۔۶۹

۱۷۔ خطبات احمدیہ (سرسید احمد خاں) مسلم پرنٹنگ پریس لاہور (ب۔ت) ص ۳۵۲

۱۸۔ تذکرہ اہل دہلی (مرتبہ قاضی احمد میاں اختر) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۶۵ء) ص ۳۰

۱۹۔ حیات جاوید (ضمیمہ جات) ص ۱۳

۲۰۔ اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقا کا حصہ (ڈاکٹر اے ایچ کوثر) لائبریری پروموشن بیورو کراچی (۱۹۸۴ء) ص ۶۳

۲۱۔ حیات جاوید (حصہ دوم) ص ۳۳۰

۲۲۔ ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج، ص ۷۵

۲۳۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید، ص ۲۴

۲۴۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۱۴۱

۲۵۔ اردو کی علمی ترقی میں سرسید...... ص ۷۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۷۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۲۸۔ حیات محمد علی جناح (رئیس احمد جعفری) تاج آفس بمبئی ([illegible]ء) ص [illegible]

۲۹۔ خطبات قائد اعظم (مرتبہ رئیس احمد جعفری) شعاع ادب لاہور ([illegible]ء) ص [illegible]

۳۰۔ تہذیب کراچی (نومبر ۱۹۹۸ء) ص ۲۰

۳۱۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید، ص ۲۰۵

۳۲۔ تاریخ دار العلوم دیوبند (سید محبوب رضوی) جید پریس دہلی (۱۹۷۷ء)

۳۳۔ تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان (ڈاکٹر ایچ بی خان) الحمد اکادمی کراچی (۱۹۹۸ء)

۳۴۔ مقالات سرسید (جلد ہفتم) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۲ء) ص ۱۷۸

۳۵۔ سرسید احمد خاں۔ سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)

۳۶۔ قائداعظم کا تصور پاکستان (غلام احمد پرویز) ادارہ طلوع اسلام لاہور (ب۔ت) ص ۱۹

۳۷۔ تہذیب کراچی (نومبر ۱۹۹۸ء) ص ۱۷

۳۸۔ سرسید علیہ الرحمہ (مرتبہ جلیل قدوائی) راس مسعود سوسائٹی کراچی (۱۹۸۵ء) ص ۷۵

۳۹۔ آخری مضامین سرسید (مرتبہ امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۵۵

۴۰۔ سرکشی ضلع بجنور (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) سلمان اکیڈمی کراچی (۱۹۶۱ء) ص ۲۱ تا ۲۳

۴۱۔ ایضاً ص ۳۵

۴۲۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز سرسید ص ۳۹۹

۴۳۔ سرکشی ضلع بجنور (مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق) ص ۱۰۵

۴۴۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) حصہ اول ص ۵۵

باب سوم

سرسید کے ساتھ چند انٹرویوز

جب سرسید کے بعض مخصوص نظریات کے اقتباسات، جو ہمارے لئے حیران کن ہوں، ہماری نظروں سے گزرتے ہیں تو حیرانی کی کیفیت میں ایک قسم کی تشنگی محسوس کرتے ہوئے ہم ان کے ارشادات کی مزید وضاحت چاہتے ہیں۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں۔ اگر چہ ان کے جوابات سرسید کی تالیفات، رسائل اور خطبات کے مجموعوں میں متعدد مقامات پر موجود ہوتے ہیں مگر ان میں سے اکثر ماخذ آسانی کے ساتھ دستیاب نہیں۔ اس کے علاوہ ان جوابات تک رسائی بغیر عمیق مطالعہ اور تحقیق کے ممکن نہیں اور اس کے لئے اچھا بھلا وقت درکار ہوتا ہے۔ "ماہرینِ سرسید" سے رجوع کیا جائے تو وہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق مختلف توضیحات کرتے ہیں جن سے دل مطمئن نہیں ہوتا۔ ایسے میں جی چاہتا ہے کہ اگر سرسید حیات ہوتے تو ان سے وضاحت حاصل کرتے۔ مختلف موضوعات پر سرسید کے ساتھ انٹرویوز کا یہ سلسلہ اسی خواہش کو پیشِ نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر چہ ان مضامین میں سوالاً جواباً انٹرویو کی کیفیت تصوراتی ہے مگر جوابات حقیقی ہیں۔ ایک ایک لفظ سرسید کا اپنا ہے۔ ہر حوالے کے ماخذ کی تفصیل متعلقہ موضوع کے آخر میں درج ہے۔

ضیاء الدین لاہوری

پہلا انٹرویو

وقوعہ ۱۸۵۷ء

وقوعہ کے محرکات

سوال: وقوعہ ۱۸۵۷ء کے بارے میں آپ کا مختصر اور جامع تبصرہ کیا ہے؟

سرسید: یہ ہنگامۂ فساد جو پیش آیا، صرف ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال تھا۔ [1]

سوال: آپ کی رائے میں اس وقوعہ کی بنیاد کیسے پڑی؟

سرسید: یہ تمام بغاوت جو ہوئی، بنا اس کی کارتوس تھے۔ [2]

ہندوستانی فوج کو بے انتہا غرور تھا۔ وہ اپنے سوا کسی کو نہیں دیکھتے تھے، فوج انگلشیہ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے تھے، تمام ہندوستان کی فتوحات صرف اپنی تلوار کے زور سے جانتے تھے۔ ان کا یہ قول تھا کہ برما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کر دیا ہے۔ علی الخصوص پنجاب کی فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اب ان کے غرور نے یہاں تک نوبت پہنچائی تھی کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر تکرار کرنے پر مستعد تھے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ فوج کے غرور اور تکبر کی یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ کچھ عجب نہ تھا کہ وہ کوچ اور مقام پر بھی تکرار کرنے لگتی۔ ایسے وقت میں کہ جب فوج کا یہ حال تھا اور ان کے سر غرور و تکبر سے بھرے ہوئے تھے اور دل میں یہ جانتے تھے کہ جس بات پر ہم اڑیں گے اور تکرار کریں گے، خواہ نخواہ سرکار کو ماننا پڑے گا، ان کو نئے کارتوس دیئے گئے جس میں وہ یقین سمجھتے تھے کہ چربی کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا، انہوں نے اس کے

پہلا وقت وہ تھا جب دفعتہً ۲۹ نمبر کی کمپنی سہارن پور سے بجنور میں آ گئی۔ میں اس وقت صاحب ممدوح کے پاس نہ تھا۔ دفعتہً میں نے سنا کہ فوج باغی آ گئی اور صاحب کے بنگلہ پر چڑھ گئی۔ میں نے یقین جان لیا کہ سب صاحبوں کا کام تمام ہو گیا، مگر میں نے نہایت بری بات سمجھی کہ میں اس حادثہ سے الگ رہوں۔ میں ہتھیار سنبھال کر روانہ ہوا...... اس آفت سے ہم بھی اور ہمارے حکام بھی سب محفوظ رہے مگر مجھ کو ان کے ساتھ اپنی جان دینے میں کچھ دریغ نہ تھا۔ دوسرا زمانہ وہ ہے کہ جب جون کی آٹھویں رات کو باغیوں نے حکام یورپین کے قتل کا ارادہ کیا ...... وہ رات جس مصیبت سے گزری ہم سے اس کا بیان نہیں ہوسکتا۔ [۱۲]

خفیہ کمیٹی اور پرچہ نویسی

سوال: بجنور سے انگریزوں کے چلے جانے کے بعد آپ نے نواب محمود خاں کی ملازمت میں خفیہ طور پر جو عدم تعاون کمیٹی بنائی، اس کے مقاصد کیا تھے؟

سرسید: میں نے اور سید تراب علی تحصیل دار اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر نے باہم مشورہ کیا اور آپس کی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے، جب تک کہ باہم کمیٹی کے اس کی صلاح نہ ہو لے۔ چنانچہ اسی وقت کام کرنے کے باب میں یہ رائے ٹھہری کہ میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور جو ضروری حکم نواب کا پہنچے اس کو لاچار تعمیل کریں اور باقی احکام سب ملتوی پڑے رہنے دیں۔ اور باقی مال گزاری بجز اس قدر روپیہ کے جس سے تنخواہ عملہ تحصیل و تھانہ تقسیم ہو جائے اور کچھ وصول نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بخشی رام تحویلدار کی معرفت، کہ وہ بھی خیر خواہ سرکار اور ہمارا ہم راز تھا، جو مالگزار آیا، اس کو فہمائش کی گئی کہ روپیہ مت دے۔ [۱۳]

سوال: کہا جاتا ہے کہ آپ کو انگریزی حکام سے سازش اور خفیہ خط و کتابت کے الزام میں قتل کی دھمکی ملی، کیا یہ الزام درست تھا؟

سرسید: منیر خاں نامی ساکن گنج پورہ نگینہ سے جہادی بن کر مع جمعیت چار سو آدمی کے

بجنور میں داخل ہوا...... منیر خاں جہادی نے بجنور میں بہت غلغلہ مچایا اور مجھ صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے انگریزوں کی رفاقت کی ہے اور ان کو زندہ بجنور سے جانے دیا ہے، اور اب بھی انگریزوں سے سازش اور خط و کتابت رکھتے ہیں اس لئے ان کا قتل واجب ہے۔ اور درحقیقت ہماری خفیہ خط و کتابت جناب مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر سے جاری تھی۔ [۱۴]

انتظامِ ضلع سرسید اور ڈپٹی کلکٹر کے ہاتھ میں

سوال: جب کچھ دنوں بعد ہندو چودھریوں نے لڑ کر نواب سے ضلع چھین لیا تو سرکاری ردِّ عمل کیا ہوا؟

سرسید: دفعتہً ہمارے نام حکم آیا کہ سرکار کی طرف سے ضلع بجنور کا انتظام کرو۔ اس وقت بھی ہم اپنی جان کا بچنا باغیوں کے ہاتھ سے ہرگز نہیں جانتے تھے مگر ہم نے انتظامِ ضلع کا اٹھایا اور سرکار کے نام سے تمام ضلع میں منادی کی اور اشتہارات سرکار کے نام سے جاری کئے اور انتظام ضلع کا سرکار کی طرف سے کیا اور ضلع بجنور کے زمینداروں کو اپنے ساتھ لے کر باغیوں کا مقابلہ کیا۔ [۱۵]

سوال: آپ کے بطور منتظم ضلع بجنور مقرر ہونے کا جو سرکاری حکم آیا، اس کے الفاظ کیا تھے؟

سرسید: "...... بہ سبب ظلم اور زیادتی نواب کے، جو چودھریان ضلع بجنور پر اس نے کی، چودھریوں اور نواب میں مقابلہ ہوا اور نواب شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اور اب انتظامِ ضلع کا ضرور ہے، اس لئے تم دونوں کو لکھا جاتا ہے کہ تم دونوں اہل کار سرکاری اپنے تئیں تمام ضلع کا جانب سرکار سے منتظم سمجھ کر بالاتفاق انتظامِ ضلع کا کرو، اور جملہ چودھریان ضلع بھی یہی درخواست رکھتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ میں انتظام ضلع کا رہے"۔ [۱۶]

ہندو مسلم لڑائیاں اور بجنور سے فرار

سوال: اس دوران میں ہندو مسلم جھڑپوں میں آپ کے ہندو چودھریوں نے نگینہ کے

مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

سرسید: نگینہ میں مشہور ہوا کہ چودھری بدھ سنگھ ہزاروں آدمی اور توپ لے کر نگینہ پر چڑھ آئے۔ اس وقت رات میں مسلمانانِ نگینہ نے بھاگنا چاہا اور پیادہ پا عورتوں اور بچوں کو لے کر چلے اور راستہ میں لٹے اور عورتیں زخمی ہوئیں اور اچھے اچھے اشرافوں کی بڑی بے عزتی ہوئی..... سید تراب علی تحصیلدار ہم سے کہتے تھے کہ اس وقت جو معیبت ان کے اور مولوی محمد علی اور بھلے مانس مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں پر گزری تھی اور جو جو بے عزتیاں بھلے مانسوں کی ہوئی ہیں، کہنے کے لائق نہیں ہیں۔ [۱۷]

سوال: بجنور میں خود کو غیر محفوظ جان کر آپ ایک روز راتوں رات ہلدور جا پہنچے۔ وہاں آپ کی موجودگی میں مسلمانوں پر کیا بپتا پڑی؟

سرسید: چودھری صاحبوں نے تمام رستہ ہلدور کے گھیر لئے اور جس قدر مسلمان حلوائی اور چھیپی اور کبھار وغیرہ ہلدور میں دستیاب ہوئے، سب کو برابر قتل کر دیا اور بہت سی عورتیں گرفتار ہو کر کوٹھے میں قید کی گئیں اور کچھ عورتیں بھی "اتفاقیہ" ماری گئیں اور کچھ مرد اور کچھ عورتیں اور بچے زخمی بھاگ بھاگ کر چاند پور پہنچے.....غرض کہ شام تک ان لوگوں کا برابر قتل رہا اور جس قدر گھر مسلمانوں کے وہاں تھے، وہ سب جلا دئے گئے اور ان کے ساتھ ہندوؤں کے بھی بہت سے گھر، جو بیچ میں آ گئے، جل گئے اور ہلدور کا یہ حال ہو گیا کہ بجز دو کچی حویلیوں کے کوئی گھر جلنے اور خراب ہونے اور لٹنے سے باقی نہیں رہا۔ پھونس کا نام ہلدور میں سے جاتا رہا، یہاں تک کہ اگر کوئی چڑیا ایک پھونس کا تنکا اپنا گھونسلہ بنانے کو قرض مانگتی تو بھی نہ ملتا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں سے اس قدر عداوت ہو گئی کہ چند آدمی، جو اتفاقیہ ہلدور میں وارد تھے، وہ بھی مارے گئے۔ گنوار بخوبی پکار پکار کر ہم لوگوں اور ڈپٹی صاحب کی نسبت صاف صاف کہتے تھے کہ گو یہ لوگ چودھریوں سے ملے ہوئے ہیں مگر مسلمان ہیں، ان کو بھی مار ڈالنا چاہیے مگر چودھری رندھیر سنگھ نے ہماری بہت حفاظت کی۔ [۱۸]

سوال: اس کے بعد آپ پر کیا بیتی؟

سرسید: جب یہ حال ہوا تو پھر ہم نے اپنا قیام ہلدور میں بھی مناسب نہ جانا اور تمام ضلع میں کوئی اور ایسی جگہ بھی نہ تھی جہاں ہم رہ سکتے۔ اس مجبوری سے ضلع کا چھوڑنا ضرور پڑا جب ہم قریب دروازہ چاند پور کے پہنچے اور ''بدمعاشان مسلمانان چاند پور'' کو ہمارے آنے کی خبر ہوئی، دفعتہً محلہ بتیاپارہ میں ڈھول ہوا اور صدہا آدمی تلوار اور گنڈاسہ اور طمنچہ اور بندوق لے کر ہم پر چڑھ آئے۔ [۱۹]

سوال: ان ''بدمعاشان مسلمانانِ چاند پور'' کے آپ پر حملے کے کیا اسباب تھے؟

سرسید: چاند پور میں جو ہم پر آفت پڑی، گو اصلی منشا اس کا یہی تھا کہ ہم سرکار کے خیرخواہ اور طرفدار تھے اور اعلانیہ سرکار کی طرفداری کر کے انتظام ضلع کا اٹھالیا تھا لیکن اس قدر عام بلوے کے ہمارے پر ہونے کا یہ سبب تھا اور سب بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے کہ چودھریوں سے سازش کر کے نگینہ میں مسلمانوں کو مروا دیا اور لوگوں کی جورو بیٹی کی بےعزتی کروائی اور ہلدور میں اپنے سامنے مسلمانوں کو ذبح کروایا، اب ہم زندہ نہ چھوڑیں گے۔ چنانچہ یہ سب باتیں ہم اپنے کان سے سنتے تھے ـــــ اور ہلدور سے حلوائیان اور جھمپیوں کے زخمی مرد اور عورت اور بچے، جو بچ کر بھاگے تھے، وہ تھوڑی دیر پہلے ہم سے چاند پور میں پہنچ چکے تھے۔ ان کا حال دیکھ کر زیادہ تر لوگ ناراض ہو رہے تھے کہ ہم بےگناہ دفعتہً وہاں جا پہنچے۔ [۲۰]

سوال: پھر آپ وہاں سے کیسے بچے؟

سرسید: ہمارے مارے جانے میں کچھ شبہ باقی نہ تھا مگر فی الفور میر صادق علی رئیس چاند پور ہماری مدد کو پہنچے اور اپنے رشتہ داروں اور ملازمان کو ساتھ لے کر ان مفسدوں کو روکا۔ اس عرصہ میں اور بہت سے آدمی شہر کے ہماری اعانت کو آئے اور ان بدذاتوں کے ہاتھ سے ہم کو بچایا۔ اور میر صادق علی ہم کو اپنے مکان پر لے گئے اور وہاں امن دیا۔ دوسرے روز خود ساتھ ہو کر موضع پچولہ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے ہم پھر اوس گئے اور وہاں سے عرضی مفصل سرگزشت کی ''بحضور حکام'' لکھی اور پھر

روز بہ سبب بیماری کے مقام کر کے ڈپٹی صاحب براستہ خورجہ، بعد پہنچانے اپنے اہل و عیال کے، اور میں صدر امین سیدھا بمقام میرٹھ" بحضور حکام عالی مقام" حاضر ہوئے۔ [۴۱]

سرسید کی عزت افزائی اور صلہ فرمانبرداری و نمک حلالی و جاں نثاری

سوال: میرٹھ میں آپ کے انگریز آقاؤں نے آپ کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا، کیا آپ اپنے محسوسات کے ساتھ اس کا ذکر اپنی ایک متعلقہ تحریر کے الفاظ میں بیان کرنا پسند فرمائیں گے؟

سرسید: میں نہایت متامل ہوتا ہوں اس اگلی بات بیان کرنے سے کہ میں اپنی نسبت آپ لکھتا ہوں اور پھر مجھ کو اس لکھنے پر اس لئے دلیری ہوتی ہے کہ درحقیقت میں خودنہیں لکھتا بلکہ اپنے آقا کی بات بیان کرتا ہوں اور پھر مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے کہ گو میرے آقا نے میری نسبت بات کہی ہو، میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کے اپنا فخر کرنا نوکر کا کام ہے۔ یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہٗ صاحب جج اور اسپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ" تم ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ تم نے اس نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا اور باوجودیکہ بجنور کے ضلع میں ہندو اور مسلمان میں کمال عداوت تھی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کی حکومت کو مقابلہ کر کے اٹھایا تھا اور جب ہم نے تم کو اور محمد رحمت خاں صاحب بہادر ڈپٹی کلکٹر کو ضلع سپرد کرنا چاہا تو تمہاری نیک خصلت اور اچھے چلن اور نہایت طرفداری سرکار کے سبب تمام ہندوؤں نے جو بڑے رئیس اور ضلع میں نامی چودھری تھے، سب نے کمال خوشی اور نہایت آرزو سے تم مسلمانوں کا اپنے پر حاکم بنا قبول کیا بلکہ درخواست کی کہ تم ہی سب ہندوؤں پر ضلع میں حاکم بنائے جاؤ اور سرکار نے بھی ایسے نازک وقت میں تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال

اعتماد سے سارے ضلع کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اسی طرح وفادار اور نمک حلال نوکر سرکار کے رہے۔ اس کے صلہ میں اگر تمہاری ایک تصویر بنا کر پشت ہا پشت کی یادگاری اور تمہاری اولاد کی عزت اور فخر کو رکھی جائے تو بھی کم ہے'۔ میں اپنے آقا کا کمال شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر ایسی مہربانی کی اور میری قدر دانی کی۔ خدا اُن کو سلامت رکھے۔ آمین۔ [۲۲]

سوال: آپ کو اس تمام وفاداری اور جاں نثاری کا کیا صلہ ملا؟

سرسید: اس کے عوض میں سرکار نے میری بڑی قدر دانی کی، عہدۂ صدر الصدوری پر ترقی کی اور علاوہ اس کے دوسو روپیہ ماہواری پنشن مجھ کو اور میرے بڑے بیٹے کو عنایت فرمائے اور خلعت پانچ پارچہ اور تین رقم جواہر، ایک شمشیر عمدہ قیمتی ہزار روپیہ کا اور ہزار روپیہ نقد واسطے مدِ خرچ کے مرحمت فرمایا۔ [۲۳]

حرفِ آخر

سوال: اس وقوعہ میں علما کی شرکت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

سرسید: اس ہنگامہ میں نہایت بدمعاش اور جاہل بے علم، جو مولوی کے نام سے مشہور تھے، نہ اس سبب سے کہ وہ خود پڑھے لکھے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے باپ دادوں میں کوئی مولوی تھا وہ بھی مولوی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے، ان کو تمام اخباروں میں اس طرح پر چھاپا گیا جیسے کہ کوئی سچ مچ کا مولوی اور مسلمانوں کا بڑا عالم اور بڑا خدا پرست ہے۔ کسی کو ایک بڑا فقیر کر کے لکھا گیا اور فلاں شاہ اور ڈھمک شاہ اس کا نام چھاپا۔ ہمارے حکام جب ان ناموں کو دیکھتے ہوں گے تو خیال کرتے ہوں گے کہ اوہو، بڑے بڑے مولویوں اور خدا پرستوں نے فساد کیا ہے حالانکہ وہ لوگ محض جاہل اور بے علم اور بدمعاش اور واہی آدمی [illegible] مسلمان ان کو اچھا نہیں جانتا تھا اور ان میں سے کوئی شخص مسلمانوں میں [illegible] ہاتوں میں مقتدا اور پیشوا اور مولوی نہ تھا۔ جس قدر کہ اچھے اور خدا پرست [illegible] کے مولوی اور درویش تھے، ان میں سے کوئی شخص اس فساد میں شریک [illegible]

مفسدوں کو برا اور اس فساد کو بے جا جانتے تھے۔ [۲۴]

سوال: آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں وقوعہ ۱۸۵۷ء کو کن کن ناموں سے یاد کیا ہے؟

سرسید: ہنگامۂ غدر۔ [۲۵] ہنگامۂ قتل و غارت۔ [۲۶] ہنگامۂ مفسدی و بے ایمانی و بے رحمی۔ [۲۷] سرکشی۔ [۲۸] نمک حرامی۔ [۲۹]

سوال: مسلمان حُریت پسندوں کو آپ نے کیا کیا خطابات دئے؟

سرسید: مفسد۔ [۳۰] نمک حرام۔ [۳۱] غادر۔ [۳۲] کافر۔ [۳۳] بے ایمان۔ [۳۴] پاجی۔ [۳۵] وغیرہ وغیرہ

سوال: متذکرہ صفات کے علاوہ آپ نے مسلمان حُریت پسند قائدین کے نام لے لے کر انہیں کن کن القابات سے نوازا؟

سرسید: بدذات۔ [۳۶] بدنیتی اور فساد کا پتلا۔ [۳۷] بدمعاش۔ [۳۸] قدیمی بدمعاش۔ [۳۹] پکا بدمعاش۔ [۴۰] بدمعاشوں کا سرکردہ۔ [۴۱] بدمعاشوں کا سردار۔ [۴۲] حرام زادہ۔ [۴۳] مشہور حرام زادہ۔ [۴۴]

حوالہ جات

١۔ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۱۳۱

٢۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) حصہ دوم: ص ۳۲

٣۔ اسبابِ سرکشی ہندوستان (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۹ء) ص ۴۳

٤۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ دوم) ص ۳۲

٥۔ مکتوباتِ سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (جلد اول ۱۹۸۵ء) ص ۳۰۹

٦۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز (سرسید احمد خاں) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۳۹۹

٧۔ (سرسید احمد خاں کا) سفرنامہ پنجاب (مرتبہ سید اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء) ص ۲۹۱۔۲۹۲

۸ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ اول) ص ۱۳
۹ سرکشی ضلع بجنور۔ص ۵
۱۰ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ اول) ص ۱۳۔۱۴
۱۱ سرکشی ضلع بجنور۔ص ۱۳
۱۲ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ اول) ص ۱۴۔۱۵
۱۳ سرکشی ضلع بجنور۔ص ۳۲
۱۴ ایضاً، ص ۳۷
۱۵ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ اول) ص ۱۶
۱۶ سرکشی ضلع بجنور۔ص ۲۶
۱۷ ایضاً، ص ۹۶
۱۸ ایضاً، ص ۱۰۲۔۱۰۳
۱۹ ایضاً، ص ۱۰۳۔۱۰۴
۲۰ ایضاً، ص ۱۰۶
۲۱ ایضاً، ص ۱۰۴
۲۲ ایضاً، ص ۶۷۔۶۸
۲۳ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ اول) ص ۱۷
۲۴ ایضاً (حصہ دوم) ص ۱۰۔۱۱
۲۵ اسباب سرکشی ہندوستان۔ص ۷
۲۶ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ دوم) ص ۱۵
۲۷ ایضاً، ص ۱۳
۲۸ سرکشی ضلع بجنور (عنوان)
۲۹ ایضاً، ص ۵
۳۰ ایضاً، ص ۱۰۳
۳۱ ایضاً، ص ۱۳
۳۲ لائل محمڈنز آف انڈیا (حصہ دوم) ص ۲۷
۳۳ ایضاً، ص ۳۰

۳۴ ایضاً
۳۵ اسباب سرکشی ہندوستان۔ص۲
۳۶ سرکشی ضلع بجنور۔ص۱۶،۲۳
۳۷ ایضاً،ص۴۱
۳۸ ایضاً،ص۳۹،۴۱
۳۹ ایضاً،ص۳۹
۴۰ ایضاً،ص۴۱
۴۱ لائل محمڈنز آف انڈیا(حصہ سوم،۱۸۶۱)ص۱۳
۴۲ ایضاً
۴۳ سرکشی ضلع بجنور۔ص۱۱۵،۱۳۶
۴۴ ایضاً،ص۱۳۸

دوسرا انٹرویو

انگریزی حکومت ہندوستان میں

ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ

سوال: کیا آپ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر مکاری سے قبضہ کیا؟

سرسید: گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکر وفریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اس کے اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سو اسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔ [1]

وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، ایک ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی، اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا تھا۔ [2]

خدا کی یہ مرضی ہوئی کہ ہندوستان ایک دانش مند قوم کی حکومت میں دیا جائے جس کا طرزِ حکومت زیادہ تر قانونِ عقلی کا پابند ہو۔ بے شک اس میں بڑی حکمت خدا تعالیٰ کی تھی۔ [3]

سوال: خدا تعالیٰ نے کہاں ارشاد فرمایا ہے کہ انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ اس کی مرضی سے ہوا؟

سرسید: خدا تعالیٰ کا کوئی حکم تحریری نہیں آتا مگر زمانے کے حالات سے پایا جاتا ہے

اس زمانے میں ہم کو خدا کی یہ مرضی معلوم ہوتی ہے کہ انگلش نیشن ہندوستان میں حکومت کرے۔ ۴

سوال: کیا ہندوستان پر برطانوی قبضہ یہاں کی مسلمان رعایا کے لئے سیاسی بے چینی کا باعث نہیں ہوا؟

سرسید: مسلمان رعایا نہ تو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے قیام کی مخالف تھی اور نہ برٹش گورنمنٹ کے قیام نے ان لوگوں میں کوئی سیاسی بے چینی پیدا کی۔ طوائف الملوکی اور ظلم و تشدد کے اس دور میں، جب کہ ملک کو مختار کامل حکومت کی ضرورت تھی، ساری مقامی آبادی نے برٹش اقتدار اعلیٰ کا پُر جوش خیر مقدم کیا اور مسلمانوں نے اس سیاسی تبدیلی پر اطمینان کے جذبات کا اظہار کیا۔ ۵

سوال: تو کیا آپ یہاں انگریزوں کی حکومت جاری وساری دیکھنا چاہتے ہیں؟

سرسید: جب یہ امر طے ہو گیا کہ ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کی حکومت ضرور ہے تو ہندوستان کے لئے یہی مفید ہے کہ اس کی حکومت نہایت استحکام سے ہندوستان میں قائم رہے۔ ۶

عقل مند شخص، جو خدا پر یقین رکھتا ہے، اس کی یہی خواہش ہوگی کہ اس طریقے پر چلیں جو خدا کی مرضی ہے۔ ۷

خدا نے ان کو ہم پر حاکم کیا ہے۔ پس ہم ان سے دوستی کریں اور وہ طریقے اختیار کریں جس میں ان کی حکومت کو استقلال اور استحکام رہے۔ ۸

انگریزی حکومت اور ہندوستانی مسلمان:

سوال: انگریزی حکومت کا خاص وصف کیا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کو کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے؟

سرسید: یقین جانو کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی، جس کے

سایۂ عاطفت میں ہم امن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔ [۹]

ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم گورنمنٹ انگریزی کے خیرخواہ اور وفادار رہیں اور کوئی بات قولاً و فعلاً ایسی نہ کریں جو گورنمنٹ انگریزی کی خیرخواہی اور وفاداری کے برخلاف ہو۔ [۱۰]

سوال: انگریزی حکومت کی اطاعت اور فرمانبرداری کے بارے میں آپ نے یہ رائے کب اختیار کی؟

سرسید: میری یہ رائے آج کی نہیں ہے بلکہ پچاس ساٹھ برس سے میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں۔ [۱۱]

جو میری آرا اور خیالات برٹش گورنمنٹ کی نسبت ہیں، ان کے اصول میرے بیٹے سید محمود کی پیدائش سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے۔ [۱۲]

سوال: سید محمود کا سنہ پیدائش کیا ہے؟

سرسید: ۱۸۵۰ء [۱۳]

سوال: اگر انگریزی حکومت ہندوستان کے مسلمانوں پر ظلم کرے تو کیا وہ اس کے خلاف جدوجہد کا حق رکھتے ہیں؟

سرسید: حدیث کی کتابوں میں متعدد حدیثیں اس مضمون کی موجود ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مسلمانوں کو نہایت تاکید سے نصیحت کی ہے اور فرمایا ہے کہ تم اپنے امیروں اور حاکموں کی ہر حالت میں اطاعت کرو، خواہ تمہارے ساتھ ظلم و ستم سے [illegible] یا وہ انصاف اور مروت سے پیش آتے ہوں۔ ان حدیثوں میں حاکم یا امیر کے ساتھ کوئی شرط یا قید نہیں ہے جس سے یہ بات معلوم ہو کہ حاکم یا امیر کس [illegible] ہو۔ پس تمام مسلمانوں کو ان حدیثوں کا ماننا اور اس پر عمل کرنا لازم [illegible] حدیثوں سے لازم آتا ہے کہ تمام مسلمان، جو ہندوستان میں برٹش گور[illegible]

سایۂ حکومت میں زندگی بسر کرتے ہیں، نہایت وفاداری اور نمک حلالی کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کی اطاعت کریں۔ [۱۴]

کیا ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں یہ بہتر ہے کہ انگریزوں سے دشمنی کریں؟ دریا میں رہیں اور مگر مچھ سے بیر؟ اور کیا درحقیقت مذہب اسلام کا یہ حکم ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ مذہب کی رُو سے ہمارا فرض ہے کہ ہم بادشاہِ وقت کی، گو وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، دل سے اطاعت کریں۔ [۱۵]

سوال: تو کیا وہ ہمیشہ کے لئے ظلم کی چکی میں پستے رہیں؟ آخر کیا کریں؟ کیا اسلام ظلم کے خلاف جدوجہد سے منع کرتا ہے؟

سرسید: جو لوگ اس ملک میں، جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں یا امن کا اعلانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور گو صرف بوجۂ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ [۱٦]

اگرچہ ہماری گورنمنٹ کسی کے دین و مذہب میں مداخلت نہیں کرتی اور نہ کرے گی۔ ... لیکن بالفرض اگر کرے تو بھی مسلمان غدر اور بغاوت نہیں کر سکتے۔ ہاں، ہجرت کر جانے کے مختار ہیں۔ [۱۷]

مسلمانانِ ہند کو اپنے حکام پر جہاد کرنا حلال نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی بغاوت ہے اور جو کوتاہ اندیش اس میں شریک ہوں، وہ اپنے مذہب کے بموجب سزائے قتل کے سزاوار ہیں۔ اور اگر ایسے لوگوں کی نسبت مجھ سے کوئی رائے دریافت کرے تو ثبوت جرم کے بعد بموجب شرع محمد یہ کے میں بھی یہی حکم دوں۔ [۱۸]

انگریزی حکومت کا استحکام اور اس کا مستقبل

سوال: آپ کس بنیاد پر انگریزی حکومت کا استحکام چاہتے ہیں؟ آپ کو انگریزوں سے کیا توقعات وابستہ ہیں؟

سرسید: میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور ان کی ہوا خواہی کی نظر سے نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لئے چاہتا ہوں ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں ۔ [۱۹]

ہم کو جو کچھ اپنی بھلائی کی توقع ہے، وہ انگریزوں سے ہے قرآن مجید بھی انہی سے دوستی کی ہدایت کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان کے دوست اور وفادار نہ ہوں ۔ [۲۰]

سوال: انگریزوں میں کیا خصوصیت ہے کہ آپ ان سے بھلائی کی توقع رکھتے ہیں؟

سرسید: انگریزوں کی قوم ایک ایسی قوم ہے جس کے دل میں انسان کی بھلائی اور بہتری چاہنے کا ایک قدرتی جوش ہے ۔ [۲۱]

میری رائے میں جس قدر گورنمنٹ انگریزی کی عملداری پر طمانیت اور اس کو ہندوستان میں استقلال ہوتا جائے گا اور جس قدر ارتباط بڑھے گا، اسی قدر ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بھلائی اور بہبودی اور ہر قسم کی ترقی کا باعث ہو گا ۔ [۲۲]

سوال: اگر آپ کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کر دیا جائے تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟

سرسید: اگر میری قسمت میں ہو کہ میں وائسرائے ہو جاؤں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اسی طرح بلکہ نہایت مضبوط وائسرائے کے طور پر ملکہ معظمہ کی حکومت ہندوستان میں قائم رکھوں ۔ [۲۳]

سوال: آپ کی بصیرت اور دُور بیں نگاہیں ہندوستان میں انگریزی حکومت کا اقتدار کتنے عرصہ تک دیکھتی ہیں؟

سرسید: حکام انگریزی کی عمل داری کبھی نہیں جائے گی ۔ اگر فرض کرو کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو بھی حکام انگریزی کے سوا کوئی عملداری ہندوستان میں نہ کر

سکے گا۔ [۲۴]

ہندوستان کے امن کے لئے اور ملک میں ہر چیز کی ترقی کے لئے انگلش گورنمنٹ کا بہت دنوں تک بلکہ ہمیشہ کے لئے رہنا ضرور ہے۔ [۲۵]

ہماری خواہش ہے کہ ہندوستان میں انگلش حکومت صرف ایک زمانہ دراز تک ہی نہیں بلکہ اٹرنل (Eternal) ہونی چاہیے۔ ہماری یہ خواہش انگلش قوم کے لئے نہیں بلکہ اپنے ملک کے لئے ہے۔ ہماری یہ آرزو انگریزوں کی بھلائی یا ان کی خوشامد کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے ملک کی بھلائی و بہتری کے لئے ہے۔ [۲۶]

حرفِ آخر:

سوال: آپ نے ۱۸۹۷ء کے آخر میں انگریزوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، کیا ان کے خاص نکات بیان فرمائیں گے؟

سرسید: ہر مسلمان کو اس شائستہ اور عادل اور فیض رساں حکومت کا شکرگزار ہونا واجب ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم پر جو حاکم ہو، خواہ وہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، ہم اس کی دل سے اطاعت کریں۔ حضرت ملکہ معظمہ تو اہلِ کتاب ہیں اور ان کی حکومت میں جو آزادی اور آسائش مسلمانوں کو حاصل ہے، وہ دنیا کی کسی حکومت میں نہیں ہے۔ پس ہمارا مذہبی فرض ہے کہ ہم ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کی اطاعت دل و جان سے کریں اور ان کی دولت اور حکومت کی درازی اور قیام و استحکام کی دعا کرتے رہیں۔ [۲۷]

حوالہ جات

۱۔ حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کان پور (۱۹۰۱ء) حصہ دوم، ص ۳۳۰

۲۔ ایڈریس اور اسپیچس متعلق ایم۔ اے۔ او کالج (مرتبہ نواب محسن الملک) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۹۸ء) ص ۷۵

۳۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز (سرسید احمد خاں) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۴۳

۴۔ (سید احمد خاں کا) سفرنامہ پنجاب (مرتبہ سید اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء) ص ۱۱۴

۵۔ The Life and Work of Syed Ahmed Khan (G.F.I. Graham) Hedder & Stoughton, London (1909) P.220

۶۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۳۷۰

۷۔ سفرنامہ پنجاب۔ ص ۱۲۳

۸۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۳۷۴

۹۔ روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۵ء) ص ۱۶۹

۱۰۔ آخری مضامین سرسید (مرتبہ امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۱۰۱

۱۱۔ روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) ص ۱۶۹

۱۲۔ مکتوبات سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۵۹ء) ص ۲۳۱

۱۳۔ خطبات احمدیہ (سرسید احمد خاں) مسلم پرنٹنگ پریس لاہور (ب۔ت) ص ۳۵۴

۱۴۔ آخری مضامین۔ ص ۱۱۳

۱۵۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۱۳۴

۱۶۔ تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (جلد اول ۱۸۸۰ء) ص ۴۳۹

۱۷۔ لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مطبع سلائٹ پریس میرٹھ (۱۸۶۰ء) حصہ دوم ص ۱۶-۱۸

۱۸۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۳ اپریل ۱۸۷۸ء) ص ۴۵۹

۱۹۔ حیات جاوید (حصہ دوم) ص ۳۳۰

۲۰۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۴۷۴

۲۱۔ ایضاً ص ۷۸۔

۲۲ ایضاً، ص ۲۶

۲۳ ایضاً، ص ۳۳۸

۲۴ سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء) ص ۳۵

۲۵ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۳۶۷

۲۶ ایڈریس اور اسپیچیں۔ ص ۷۵

۲۷ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۵۷۳

تیسرا انٹرویو

برطانوی ہندوستان میں جمہوریت کا مسئلہ

جمہوریت اور اُس کا نفاذ ہندوستان میں

سوال: جمہوریت میں عوام کی اکثریت کی رائے شامل ہوتی ہے لہٰذا تمام ملکوں میں جمہوری حکومتیں قائم ہونی چاہئیں۔ کیا آپ اس نظریے سے اتفاق کرتے ہیں؟

سرسید: میں اس خیال کو وہم سے کم نہیں سمجھتا کہ جمہوری طریقہ کل اقوام اور مذاہب اور ممالک اور ازمنہ کے لئے یکساں موزوں ہے۔ میری رائے میں یہ طریقہ عقلاً بھی ناکمل ہے کیونکہ یہ ضروری بات ہے کہ ایسے طریقے میں کثرت رائے سے انتظام ہو اور اس لئے یہ مان لیا جاتا ہے کہ انسان کی میجارٹی (Majority) اس قابل ہیں کہ یہ فیصلہ کرسکیں کہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ نارضامند مینارٹی (Minority) پر بھی کیونکر حکومت کی جائے، حالانکہ حقیقی امر یہ ہے کہ جیسا کہ مسٹر کارلائل مرحوم نے، جن سے مجھے ذاتی واقفیت رکھنے کی عزت حاصل تھی، کہیں کہا ہے کہ "کثرت انسان عقل مندی سے بہت دور ہیں"۔ یہ خیال فیاض نہ ہو مگر بدقسمتی سے ٹھیک ہے۔ [۱]

سوال: آپ کے نہ چاہنے کے باوجود دنیا میں جمہوریت رائج ہوتی جارہی ہے اور ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگرس اس امر پر زور دے رہی ہے۔ آپ کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

سرسید: لازمی امر ایسے طریقۂ حکومت کے لئے، جس کا انتظام صرف کثرت رائے پر

چلتا ہو۔ یہ ہے کہ ووٹرز میں ہم جنسیت ہو بلحاظ قوم کے اور مذہب کے اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی ملکی روایات کے۔ یعنی ریپریزنٹیٹو (Representative) طریقہ سے رائے دینے میں یہ مسلّم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امور بالا میں ہو۔ اور جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقۂ حکومت عمل میں آ سکتا ہے یا مفید ہو سکتا ہے۔ جہاں یہ امور موجود نہ ہوں یا ان کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں، جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں، سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ ؏

کل دنیا کے ممالک میں سے ہندوستان، جہاں مختلف الجنس اقوام ہیں، ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے لئے موزوں ہے اور میں اس تجربہ کو، جو انڈین نیشنل کانگرس اپنی کوشش سے کرنا چاہتی ہے، ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا ہے کل اقوامِ ہند کے لئے اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے۔ ؏

سوال: خصوصاً مسلمانوں کے لئے؟ کس بنیاد پر؟ اور دوسری قوموں کو کیا نقصان ہوگا؟

سرسید: سب سے پہلے یہ فرض کیجیے کہ وائسرائے کی کونسل اس قاعدہ سے، جس کی خواہش ہے، یعنی اس میں رعایا کے انتخابات سے ممبر مقرر ہوں اور انتخاب کی صورت یوں فرض کیجیے کہ تمام مسلمان ایک ممبر کے مسلمان ہونے کے لئے ووٹ دیں اور ایک ہندو کے لئے کل ہندو ووٹ دیں اور گنئے کہ مسلمان کے کتنے ووٹ ہوئے اور ہندو ممبر کے لئے کتنے۔ یقینی ہندو ممبر کے چوگنے ووٹ ہوں گے کیونکہ وہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں۔ پس Mathematics کے ثبوت سے ایک ووٹ مسلمان ممبر کے لئے ہوگا اور چار ووٹ ہندو ممبر کے لئے۔ پس مسلمانوں کا ٹھکانہ ہندوؤں کے مقابل کہاں رہے گا؟ ؏

کوئی طریقہ بھی الیکشن کا اختیار کرو، ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے چوگنی ہو

گی اور جو ان کی خواہشیں ہوں گی، وہ کامیاب ہوں گی اور کل ملک کی قانونی حکومت بنگالیوں کے ہاتھ میں یا ہندو بنگالی نما کے ہاتھ میں ہوگی اور مسلمان نہایت ذلت کی حالت میں پڑ جائیں گے۔ ۵

اس سے صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ بہار کے ہندوؤں، پارسیوں، دیسی عیسائیوں اور اینگلو انڈین کو بھی اپنی قلیل تعداد کی وجہ سے یقیناً نقصان پہنچے گا۔ ۶

سوال: ہندوستان میں نمائندہ حکومت سے فرار کی کوئی اور وجہ؟

سرسید: آیا کوئی ایسی نظیر دنیا میں ہے کہ ایک غیر قوم نے غیر قوموں کو فتح کر کے ان پر حکومت کی ہو اور اس مفتوح قوم نے اس بات کا دعویٰ کیا ہو کہ ان کو ریپر یزنٹیٹو گورنمنٹ ملنے کا حق ہے؟ ریپر یزنٹیٹو گورنمنٹ کا پہلا اصول یہ ہے کہ قومی سلطنت ہو اور وہی قوم اپنی قوم پر اور اپنے ملک پر حکومت کرتی ہو۔ تم دنیا کی کسی تاریخ میں بتا سکتے ہو کہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک غیر قوم کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد اس ملک پر حکومت کرتی ہو اور مفتوح ملک والوں کو ریپر یزنٹیٹو گورنمنٹ دی گئی ہو؟ کبھی ایسا نہیں ہوا بلکہ جس نے ہم کو فتح کیا ہے، اس کو ہم پر اپنی حکومت کا قائم رکھنا ضرور ہے۔ ہاں، جب حاکم اور محکوم ایک قوم ہوں تو ریپر یزنٹیٹو گورنمنٹ قائم ہو سکتی ہے ...... ایسے ملک میں جہاں دوسری قوم حکومت کرتی ہے، یہ خیال کرنا کہ وہاں بھی ریپر یزنٹیٹو گورنمنٹ قائم ہو، خیال محال ہے اور نہ آج تک دنیا کے کسی ملک کی تاریخ میں اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ ۷

انڈین نیشنل کانگرس کی سرگرمیاں:

سوال: کانگرس کے طریق کار میں آپ کیا باتیں عوامی مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں؟

سرسید: جس طرح کہ نیشنل کانگرس کی کارروائی ہوتی ہے اور پولیٹیکل مباحثوں کے لئے جابجا مجلسیں کی جاتی ہیں اور عام لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ رعایا کے واجبی حقوق ادا نہیں کرتی، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نالائق اور جاہل آدمیوں کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت ظالم یا کم از کم نا منصف ہے۔ ۸

نتیجہ ان ناشدنی اور ناممکن درخواستوں کا بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایک بیہودہ بات سے تمام لوگوں کے دلوں کو گورنمنٹ سے ناراض کریں اور تمام لوگوں کو یقین دلائیں کہ گورنمنٹ ہم پر ظالمانہ حکومت کرتی ہے اور ہم جو کچھ گورنمنٹ سے مانگتے ہیں، نہیں دیتی اور اس سے لوگوں میں ناراضی اور جوش پھیلائیں اور ملک میں بدامنی ہو۔ ۹

سوال: تو پھر ارشاد فرمائیں کہ گورنمنٹ سے مانگا کیسے جائے؟ ملتانہ ملنا الگ بات ہے مگر کیا ایک غلام قوم کو اپنے حقوق کی بھیک مانگنے کی بھی آزادی میسر نہیں؟

سرسید: جو کچھ مانگو، اس طرح پر نہیں کہ گورنمنٹ کے تمام کاموں کو ظالمانہ قرار دو اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے داروں کو دُشنام دہی سے یاد کرو اور جس قدر سخت اور ناملائم الفاظ تم کو ملیں، وہ لارڈ لٹن اور لارڈ ڈفرن کے حق میں ادا کرو اور تمام انگریزوں کو ظالم بتاؤ اور اسی مضمون سے اخباروں کے کالم کے کالم سیاہ کرو۔ اس باتوں سے کچھ نہیں مل سکتا۔ ۱۰

ہم لوگوں نے آزادی کے معنی سمجھنے میں بڑی غلطی کی ہے۔ ہم نے آزادی کے معنی یہ سمجھ رکھے ہیں کہ گورنمنٹ کی نسبت، حکام ضلع کی نسبت، کسی فرقہ کی نسبت یا کسی شخص خاص کی نسبت جو دل میں آیا، اچھا یا برا، سخت یا سست، ملائم یا ناملائم، سب کچھ لکھ دیا، یہاں تک کہ شخص خاص کے ذاتی امور کو بھی ہم نے اسی آزادی میں داخل سمجھا ہے۔ اگر آزادی کے معنی درحقیقت یہی ہوں تو بلاشبہ وہ قائم رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ ۱۱

اگر بالفرض ہندوستان کے تمام ہندو اور مسلمان نیشنل کانگرس کے ساتھ ایجی ٹیشن میں شریک ہو جائیں اور تمام اخبار، ہندو اور مسلمانوں کے، مضامین خلاف واقعہ اور برخلاف گورنمنٹ لکھنے پر متفق ہو جائیں تو بھی گورنمنٹ کا کچھ نقصان نہیں ہونے کا۔ ہاں، بمجبوری گورنمنٹ کو دائرہ آزادی کو، جو اس وقت ہے، تنگ کرنا پڑے گا اور بمجبوری اس کو ہندوستانی اخباروں کی آزادی چھین لینے پر قانون بنانا

ہوگا۔ اور یہ گورنمنٹ کا کچھ قصور نہیں ہوگا، جو کچھ گورنمنٹ کرے گی وہ ہندوستانیوں ہی کی بداعمالی کی سزا ہوگی۔ [۱۲]

مسلمانوں کی آئندہ بہبودی اور ترقی کے لئے بحیثیت ملکہ معظمہ انگلستان اور قیصرۂ ہند کی با امن اور تابع اور وفادار رعایا ہونے کے، میں بوجہ ہونے سبجیکٹ (Subject) اور وفادار سٹیزن (Citizen) کے، اور اپنے ہم وطنوں کا عموماً اور اپنے ہم مذہب مسلمانوں کا خصوصاً سچا خیر خواہ ہونے کے، بہت زیادہ مخالف ہوں کل ایسی جمہوری تحریکوں کا جو برٹش رول (Rule) کے خلاف شکایتیں اور رنجشیں بھڑکاتی ہیں اور اس ملک میں جہاں مختلف اقوام اور مذاہب آباد ہیں، اس کی اعلیٰ قوت اور اختیار کو تزلزل میں ڈالتی ہیں۔ [۱۳]

حرفِ آخر:

سوال: نمائندہ حکومت کی تجویز سے دستبرداری کے علاوہ آپ انگریزوں کے بارے میں قوم کو مزید کیا ہدایات دیں گے؟

سرسید: قرآن شریف ہماری ہدایت کے لئے موجود ہے جس نے ہم کو ان کا اور ان کو ہمارا دوست بنایا ہے۔ اب خدا نے ان کو ہم پر حاکم کیا ہے۔ پس ہم ان سے دوستی کریں اور وہ طریقے اختیار کریں جس میں ان کی حکومت کو ہندوستان میں استقلال اور استحکام رہے اور بنگالیوں کے ہاتھ میں نہ جائے۔ یہی ہماری دوستی ہمارے عیسائی حاکموں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ ہم کو گڑھے میں دھکیلنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ شریک نہ ہوں...... ہم کو جو کچھ اپنی بھلائی کی توقع ہے وہ انگریزوں سے ہے، بنگالی ہماری قوم کے لئے کچھ بھلائی نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید بھی انہی سے دوستی کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان کے دوست اور وفادار نہ ہوں بلکہ ہم کو لازم ہے کہ جو کچھ خدا نے کہا، ہم اس کی تعمیل کریں۔ اس کے علاوہ خدا نے ان کو ہم پر حاکم کیا ہے۔ ہمارے پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر تم پر حبشی غلام حاکم ہو تو اس کی بھی اطاعت کرو وہ تو کالے نہیں،

بہت گورے ہیں۔ تو ہم ان گورے منہ والوں کی، جن کو خدا نے ہم پر حاکم کیا ہے، کیوں نہ اطاعت اور وفاداری کریں اور خدا کا حکم بجا لائیں۔ [۱۴]

ان کو خدا نے حاکم کر دیا۔ یہ خدا کی مرضی ہے۔ ہمیں خدا کی مرضی پر شاکر رہنا اور خدا کے حکم کی اطاعت کر کے ان کا دوست اور وفادار رہنا چاہیے، نہ یہ کہ ان پر بے جا الزامات لگائیں اور دشمنی پیدا کریں۔ یہ نہ عقل مندی کا کام ہے اور نہ ہمارے پاک مذہب کی ہدایت ہے۔ پس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولیٹیکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں۔ [۱۵]

حوالہ جات

۱۔ مکتوبات سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۵۹ء) ص ۶۲۷

۲۔ ایضاً، ص ۶۳۳

۳۔ ایضاً، ص ۶۲۸

۴۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز (سرسید احمد خاں) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۳۵۳

۵۔ دی پریزنٹ سٹیٹ آف انڈین پالیٹکس (مرتبہ: تھیوڈور بیک) پائونیرز پریس الہ آباد (۱۸۸۸ء) ص ۶۱

۶۔ (بحوالہ) سرسید کے سیاسی افکار (ڈاکٹر فوق کریمی) ایشیا بک سنٹر لاہور (۱۹۹۰ء) ص ۲۳۱

۷۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۳۶۷

۸۔ دی پریزنٹ سٹیٹ آف انڈین پالیٹکس۔ ص ۶۲

۹۔ مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز۔ ص ۳۵۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۷۵

۱۱۔ مقالات سرسید (مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (حصہ ۹، ۱۹۶۲ء) ص ۱۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۳۔ مکتوبات سرسید۔ ص ۶۲۷

۱۴۔ مکمل مجموعہ لکچرز۔ ص ۳۷۴

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۷۵

چوتھا انٹرویو

نظریۂ قومیت

لفظ ''قوم'' کا اطلاق

سوال: آپ نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں جابجا ''قوم'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آپ اس لفظ کے مفہوم کی کیا حدود متعین کرتے ہیں؟

سرسید: پرانی تاریخوں میں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ ''قوم'' کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں، یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو اُن میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے ''قوم'' کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔[1]

تمام انسان بالکل شخص واحد ہیں اور میں ''قوم'' کی خصوصیت کے واسطے مذہب اور فرقہ اور گروہ نہیں پسند کرتا۔[2]

سوال: ہندوستان میں دینِ اسلام اور ہندومت کے پیرو بالترتیب مسلمان اور ہندو کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے متضاد خیالات اور تصورات کے حامل ہیں اور دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں۔ آپ کس اعتبار سے دونوں کو ایک ہی قوم کہہ سکتے ہیں؟

سرسید: ہندوستان میں دو مشہور قومیں آباد ہیں جو ہندو اور مسلمان کے نام سے مشہور

ہیں۔ جس طرح کہ انسان میں بعض اعضائے رئیسہ ہیں، اسی طرح ہندوستان کے لئے وہی دونوں قومیں بمنزلہ اعضائے رئیسہ کے ہیں۔ ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں، ہے جس طرح ہندوؤں کی شریف قومیں اس ملک میں آئیں، اسی طرح ہم بھی اس ملک میں آئے۔ ہندو اپنا ملک بھول گئے، اپنے دیس سے پردیس ہونے کا زمانہ ان کو یاد نہیں رہا اور ہندوستان ہی کو انہوں نے اپنا وطن جانا ہم نے بھی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور اپنے سے پیش قدموں کی طرح ہم بھی اس ملک میں رہ پڑے۔ پس اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں رہتے رہتے دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں، ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں۔ یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک نئی زبان اردو پیدا کر لی جو نہ ہماری زبان تھی، نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس حصہ سے، جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے، قطع نظر کریں تو درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔ [1]

ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ [2]

لفظ ''قوم'' سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ ''نیشن'' کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے کیونکہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ

سکتے۔ لیکن جو بات کہ ہم دیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان،
ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں، ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں، ہم سب کے
فائدہ کے مخرج ایک ہی ہیں، ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں۔
یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد
ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ "ہندو" یعنی ہندوستان میں رہنے والی قوم۔ [۵]

سوال: "ہندو" تو ہندومت کے پیرو ہوتے ہیں اور آپ ماشاء اللہ مسلمان ہیں۔ پھر
خود کو "ہندو" کیونکر تعبیر کر سکتے ہیں؟

سرسید: ہندو میری رائے میں کسی مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا
رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھ کو،
باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے۔ [۶]
ہندو اور مسلمان دونوں قومیں "ہندو" یعنی اہل ہند کے خطاب کی مستحق ہیں
......وہ زمانہ اب نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ایک ملک کے باشندے دو
قومیں سمجھے جائیں۔ [۷]

حرف آخر

سوال: کیا آپ اپنے اس ارشاد کا اقتباس پیش کرنا پسند فرمائیں گے جو آپ نے اس
موضوع پر جون ۱۸۹۷ء میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں بیان فرمایا؟

سرسید: ہندوؤں کی آریا قومیں بھی خاص ہندوستان کی رہنے والی نہیں ہیں، دوسرے
ملک سے آ کر ہندوستان میں فتح مندی کے ساتھ آباد ہوئی ہیں۔ ان کے
ہندوستان میں آباد ہونے کو زمانہ کثیر گزر گیا جس کے سبب وہ ہندوستان کے
متوطن اور ہندوستان کے رہنے والے ہندو کہلائے۔ مسلمانوں کو بھی ہندوستان
میں آئے ہوئے کچھ کم زمانہ نہیں ہوا۔ ان کی بھی متعدد پشتیں ہندوستان ہی کی زمین
پر گزری ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن میں آریاؤں کے خون کا میل ہے

بہت سے ایسے ہیں جو خالص آریا کہلائے جاسکتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں کہ ہم دونوں ایک ہی زمین پر رہتے ہیں، ایک ہی زمین کی پیداوار کھاتے ہیں، ایک ہی زمین کا یا دریا کا پانی پیتے ہیں، ایک ہی ملک کی ہوا کھا کر جیتے ہیں۔ پس مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ مغائرت نہیں ہے۔ جس طرح آریا قوم کے لوگ ہندو کہلائے جاتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی "ہندو" یعنی ہندوستان کے رہنے والے کہلائے جاسکتے ہیں ..... ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ..... ہم دونوں قوموں میں نہایت محبت و اخلاص سے گورنمنٹ انگلشیہ کے سایۂ عاطفت میں اپنی زندگی نہایت وفاداری سے بسر کریں اور ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصرۂ انڈیا کی سلامتی اور درازیٔ سلطنت کی دعا کرتے رہیں جس کی بے نظیر سلطنت کے ساٹھویں سال جلوس کا عنقریب جشن ہونے والا ہے۔ [۸]

حوالہ جات

۱۔ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز (سرسید احمد خاں) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۲۴۷
۲۔ ایضاً، ص ۱۳۷
۳۔ ایضاً، ص ۲۱۷
۴۔ ایضاً، ص ۲۴۷
۵۔ ایضاً، ص ۲۷۰
۶۔ سفرنامہ پنجاب (مرتبہ: سید اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء) ص ۱۳۹
۷۔ ایضاً، ص ۱۴۳
۸۔ آخری مضامین سرسید (مرتبہ: امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۵۵-۵۸

پانچواں انٹرویو

تعلیمی کاوشوں کا پس منظر

ادنیٰ اور اعلیٰ تعلیم میں امتیاز

سوال: آپ کی بنیادی شناخت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دینے والے رہنما کے طور پر ہے۔ ماہرینِ تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ابتدائی بنیادی تعلیم پر توجہ دے کر اور اس کی اشاعت عام کر کے ہی اعلیٰ تعلیم کے لئے بہترین جوہر تلاش کئے جا سکتے ہیں مگر آپ نے اعلیٰ تعلیم ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھا۔ وجہ؟

سرسید: تعلیم کے متعلق صرف دو قسم کے خیالات ہیں۔ ایک اشاعت کرنا اعلیٰ درجے کی تعلیم کا، جو بلاشبہ ایک محدود گروہ کو یا قلیل گروہ کو نصیب ہوگی۔ دوسرے، اشاعت کرنا عام تعلیم کا جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ اور غریب گروہیں اور غریبوں کے لڑکے اس سے فائدہ اٹھائیں اور گروہ کے گروہ اور غول کے غول ایسے پیدا ہو جائیں جو شُدبُد سے واقف ہوں۔ جہاں تک مجھ کو اپنی قوم کے بزرگوں سے موقع ملا ہے، مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے خیالات اس پچھلی تعلیم کی طرف زیادہ مائل ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی سے تعلیم کا ایسا طریقہ چاہتے ہیں جس سے غریب آدمی بھی فائدہ اٹھا سکیں۔[1]

وہ لوگ نیک نیتی اور قومی ہمدردی میں یہ سمجھتے ہیں کہ غریب لوگوں اور

بے مقدوروں کے بچوں کو فائدہ پہنچے اور عام تعلیم سے لوگ فائدہ اٹھائیں مگر اس میں دو طرح کی غلطی ہے۔ اوّل یہ کہ، جب تک اعلیٰ قوموں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہوتی، ادنیٰ قوموں اور غریب لوگوں میں ہرگز تعلیم نہیں پھیل سکتی۔ دوم یہ کہ، جب تک اعلیٰ درجہ کی تعلیم ملک میں موجود نہیں ہوتی، ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا پھیلنا ناممکن ہے جو لوگ اپنی کوششیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پر متوجہ نہیں کرتے اور ادنیٰ درجہ پر صرف کرتے ہیں، وہ الٹی گنگا بہاتے ہیں۔ [۲]

بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان چھوٹے سکولوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم دے کر لوگوں کو تیار کرتے ہیں تاکہ وہ کسی سکول یا کالج میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانے کے لئے داخل ہو سکیں...... انہوں نے ایسا کرنے سے اس مقدم امر سے، جس کو میں نے مقدم قرار دیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی سے بالکل غفلت کی ہے۔ [۳]

عام تعلیم کا عام لوگوں میں، بغیر موجود ہونے اعلیٰ تعلیم کے، پھیلنا ناممکن ہے اور تمام دنیا کی تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ پس بلاشبہ مجھ کو افسوس ہے کہ نیک بخت کوششیں، جو قبل از وقت ہماری قوم کے بزرگ دوسری قسم کے خیالات سے کرتے ہیں، یا وہ سب ضائع ہونے والی ہیں یا قوم کے عروج کے لئے سب بے سود ہیں۔ [۴]

سوال: کم حیثیت غریب گروہوں کے "غول کے غول" لڑکوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے؟

سرسید: ان کو اُسی قدیم طریقہ عام تعلیم میں مشغول رکھنا ان کے حق میں اور ملک کے حق میں اور قوم کے حق میں زیادہ تر مفید ہے...... ان لڑکوں کو کچھ لکھنا پڑھنا اور ضروری کارروائی کے موافق حساب کتاب آ جائے اور ایسے چھوٹے چھوٹے رسالے ان کو پڑھائے جائیں جن سے نماز روزہ کے ضروری ضروری مسائل، جو روز مرہ پیش آتے ہیں اور مسلمانی مذہب کے سیدھے سادے عقائد ان کو معلوم ہو جائیں۔ [۵]

سوال: دیہات میں تعلیم کی حدود کیا ہونی چاہئیں؟

سرسید: دہقانوں کے گروہوں کو، جو دیہات وغیرہ میں رہتے ہیں، دیہی زبانوں میں بدرجۂ اعتدال تعلیم کی جائے اور لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا جائے۔ یہ لوگ جو بہت محنت اور مشقت اور سختی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے ان کی جسمی تربیت کے واسطے یہ طریق زندگی ہی کافی وافی ہے، اور کچھ سکھانے سمجھانے کی حاجت نہیں۔ [۶]

تعلیم نسواں کی حدود

سوال: آپ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ آپ عورتوں کی تعلیم کے مخالف ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

سرسید: باوجودیکہ بہت سی باتوں میں میری طرف نئے خیالات منسوب ہوتے ہیں لیکن عورات کی تعلیم کی نسبت میرے وہی خیالات ہیں جو ہمارے قدیم بزرگوں کے تھے۔ [۷]

میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے، اس طریقۂ تعلیم سے ہے جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مائل ہیں۔ [۸]

سوال: آپ کو عورتوں کی تعلیم کے کس پہلو سے اختلاف ہے؟

سرسید: عورتوں کو جس قسم کے علوم پڑھائے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے، اس کو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ نہ وہ ہماری حالت کے مناسب ہیں اور نہ سینکڑوں برس تک ہماری عورتوں کو ان کی ضرورت ہے۔ [۹]

وہ علوم...... جن کو اس زمانہ میں یورپ کی تقلید سے لڑکیوں کی تعلیم میں لوگ داخل کرنا چاہتے ہیں، یورپ اور امریکہ کی حالتِ معاشرت کے خیال سے شاید وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضرور ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹرز اور

ٹیلی گراف ماسٹرز یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکیں لیکن ہندوستان میں نہ وہ زمانہ ہے، نہ سینکڑوں برس بعد بھی آنے والا ہے۔..... میں نہیں سمجھتا کہ عورتوں کو افریقہ اور امریکہ کا جغرافیہ سکھانے اور الجبرا اور ٹرگنا میٹری کے قواعد بتانے اور احمد شاہ اور محمد شاہ اور مرہٹوں اور دہلیوں کی لڑائیوں کے قصے پڑھانے سے کیا نتیجہ ہے؟ [۱۰]

کوئی شریف خاندان کا شخص یہ نہیں خیال کر سکتا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی تعلیم دے کہ ٹیلی گراف آفس میں سگنلر ہونے کا کام دے یا پوسٹ آفس میں چٹھیوں پر مہر لگایا کرے۔ [۱۱]

اس وقت ہم تمام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہو جاتے ہیں، عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں، عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے ہیں، اسی کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ [۱۲]

سوال: تو آپ کے خیال میں حالتِ موجودہ میں لڑکیوں کی تعلیم کیسی ہونی چاہیے؟

سرسید: میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ اشراف لوگ جمع ہو کر اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا ایسا انتظام کریں جو نظیر ہو پچھلی تعلیم کی، جو کسی زمانے میں ہوتی تھی۔ [۱۳]

پس جو علوم کہ اُس زمانہ میں عورتوں کے لئے مفید تھے، وہی اِس زمانہ میں بھی مفید ہیں۔ اور وہ علوم صرف دینیات اور اخلاق کے لئے تھے۔ [۱۴]

عورتوں کی تعلیم نیک اخلاق، نیک خصلت، خانہ داری کے امور، بزرگوں کا ادب، خاوند کی محبت، بچوں کی پرورش، مذہبی عقائد کا جاننا ہونی چاہیے۔ اس کا میں حامی ہوں، اس کے سوا اور کسی تعلیم سے بیزار ہوں۔ [۱۵]

بغیر معنی سمجھائے قرآن مجید پڑھانا، جس کو ایک حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، میری دانست میں کوئی ذریعہ اس سے زیادہ روحانی تربیت، روحانی نیکی اور

توجہ ذات باری کے لئے نہیں ہوسکتا۔ [۱۶]

علی گڑھ کالج: مقاصد اور نتائج

سوال: آپ نے کس مقصد کے تحت علی گڑھ کالج قائم کیا؟

سرسید: اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں مگر باعتبار مذاق اور رائے و فہم کے انگریز ہوں۔ [۱۷]

سوال: کالج کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے وائسرائے کو جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، اس میں ''بانیانِ کالج کی نگاہ میں نمایاں مقصد'' کی وضاحت کن الفاظ میں کی گئی؟

سرسید: ''ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کی لائق و کارآمد رعایا بنانا اور ان کی طبیعتوں میں اس قسم کی خیرخواہی پیدا کرنا جو ایک غیر سلطنت کی غلامانہ اطاعت سے نہیں بلکہ عمدہ گورنمنٹ کی برکتوں کی اصل قدرشناسی سے پیدا ہوتی ہے۔'' [۱۸]

سوال: کیا کالج صرف مسلمان قوم کی تعلیمی ترقی کے لئے قائم کیا گیا؟

سرسید: مدرسۃ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے۔ یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لئے اور جو افسوسناک محرومی ان کو یورپین سائنسز اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی، اس کے رفع کرنے کو قائم کیا گیا مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں۔ [۱۹]

مجھ کو افسوس ہوگا، اگر کوئی شخص یہ خیال کرے گا کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ میں اس بات کے بیان کرنے سے خوش ہوں کہ اس کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اُس شخص کے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا

ہے، بلا کسی قید کے اُس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اس کو حاصل کرے۔ اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر کے یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ [۴۰]

جدید تعلیم کے منفی پہلو

سوال: عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جدید مغربی تعلیم مذہبی بداعتقادی پیدا کرتی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

سرسید: اب تو گویا بالاتفاق تمام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علومِ جدیدہ کے سیکھنے سے مسلمان اپنے عقائدِ مذہبی میں سست ہو جاتے ہیں، بلکہ اُن کو لغو سمجھنے لگتے ہیں اور لامذہب ہو جاتے ہیں، اور اِسی سبب سے مسلمان اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھانا نہیں چاہتے۔ مسلمانوں پر کیا موقوف ہے، انگریز بھی ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے اپنی کتاب میں...... یہ فقرہ مندرج فرمایا ہے:

> ''کوئی نوجوان، خواہ ہندو خواہ مسلمان، ایسا نہیں ہے جو ہمارے انگریزی مدرسوں میں تعلیم پائے اور اپنے بزرگوں کے مذہب سے بداعتقاد ہونا نہ سیکھے۔ ایشیا کے شاداب اور تروتازہ مذہب جب مغربی (یعنی انگریزی) علوم کی سچائی کے قریب آتے ہیں، جو مثل برف کے ہے، تو سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں۔''

آمنا وصدقنا، یہ قول ڈاکٹر ہنٹر صاحب کا بالکل سچ اور بتمامہٖ سچ ہے۔ [۴۱]

سوال: اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ انگریزی پڑھنے والے مسلمان نوجوان اسلام اور بزرگوں کا ادب ترک کر دیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

سرسید: تمام اخلاق اور صفاتِ انسانی کا مجموعہ اور تمام لُبِ لُباب خدا کی مخلوق کے پیدا ہونے کے مقصد کا ان پانچ حرفوں میں ہے، جس کو ہم "اسلام" کہتے ہیں۔ ہم کو اس نام کا ادب کرنا اور جہاں تک ہو سکے، اپنے آپ کو اس نام کا مصداق بنانا لازم ہے۔ مجھے نہایت افسوس اور رنج ہوتا ہے جبکہ میں یہ دیکھتا یا سنتا ہوں کہ ہماری قوم کے بعض لڑکے.... جو انگریزی پڑھنا شروع کرتے ہیں، اس کا پورا پورا ادب نہیں کرتے۔ جو سوشل اور اخلاقی صفات یورپین میں ہیں، وہ بھی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہیں۔ اگر ہم صدیوں تک کوشش کریں تو شاید وہاں تک پہنچیں مگر افسوس یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اُن کی خوبیوں کا تو دھیان تک نہیں کرتے اور اُن میں جو عیب ہیں، ان کو اختیار کر لیتے ہیں.... بزرگوں سے بے پروائی سے پیش آنے لگے، ماں باپ کا ادب جیسا چاہیے اس قدر بجالانا چھوڑ دیا۔ اپنے سے عمر میں جو بڑا ہے، اس کا اور اپنے بزرگوں کے دوستوں کا لحاظ ترک کر دیا۔ یہ تمام باتیں نہایت رنج دہ ہیں اور جس قومی ترقی کا میں خواہش مند ہوں، اس کو روکنے والی اور برباد کرنے والی ہیں۔ [۲۲]

لارڈ میکالے کی خدمات

سوال: ہمارے تعلیمی حلقوں میں لارڈ میکالے پر اس کی تعلیمی تجاویز کے حوالے سے سخت تنقید کی جاتی ہے۔ لارڈ میکالے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

سرسید: میری دانست میں کوئی گورنر جنرل، کوئی وائسرائے، کوئی ملک کا خیرخواہ ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہندوستان پر اور ہندوستانیوں پر احسان کیا ہو۔ [۲۳]

لارڈ میکالے میرے خیال میں وہ شخص ہے جس نے ہندوستان میں بھلائی کے درخت کا، یا یوں کہو کہ علم کے درخت کا، بیج بویا۔ کوئی گورنر جنرل اور کوئی وائسرائے ہندوستان میں ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالے سے زیادہ ہم پر

ہندوستان کو بھلائی پہنچائی ہو۔ [۲۴]

سوال: ایک عرصہ قبل آپ خود دیسی زبانوں کی وساطت سے مغربی علوم کی تحصیل کے حامی رہے جبکہ لارڈ میکالے اس کے برعکس خیالات کا حامل تھا۔ اس قدر تبدیلی اور حسن ظن کی وجہ؟

سرسید: میں اقرار کرتا ہوں کہ میں وہی شخص ہوں جس نے سب سے پہلے اس بات کا گمان کیا تھا کہ یورپین علوم کا ورنیکلر زبان کے ذریعہ سے تحصیل کرنا ملک کے حق میں زیادہ سودمند ہوگا۔ میں وہی شخص ہوں جس نے لارڈ میکالے کے منٹ (Minute) ۱۸۳۵ء پر نکتہ چینی کی تھی کہ انہوں نے مشرقی تعلیم کے نقص کو ظاہر کیا اور مغربی علوم کی تعلیم پر توجہ دلائی، اور اس بات کے خیال کرنے سے قاصر رہا تھا کہ دیسی زبانوں کی وساطت سے یورپین علوم کی اشاعت اہل ہند کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے یا نہیں۔ میں نے اپنی رائے کو صرف بیان ہی پر محدود نہیں کیا بلکہ اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ بہت سے مباحثے مختلف جلسوں میں کئے، اس مضمون پر متعدد رسالے اور مضامین لکھے، لوکل اور سپریم گورنمنٹوں کو عرضداشتیں بھیجیں اور اسی غرض سے ایک سوسائٹی موسوم بہ سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ قائم کی گئی جس نے کئی علمی اور تاریخی کتابوں کا انگریزی سے ورنیکلر زبان میں ترجمہ کیا مگر انجام کار میں اپنی رائے کی غلطی کے اعتراف سے باز نہ رہ سکا۔ [۲۵]

لوگوں کا خیال ہے کہ لارڈ میکالے ایک مذہبی شخص تھا۔ وہ ایشیا کی تواریخ کو، ایشیا کی الہیات کو، ایشیا کی طبابت کو، ایشیا کے مذہب کو نامعقول سمجھتا تھا اور اس لئے مذہبی خیال سے اس قدیم طریقۂ تعلیم کا تبدیل ہونا چاہتا تھا۔ فرض کیا جائے کہ وہ ایسا ہی تھا مگر جو عزت اس کو اپنی سچی رائے ظاہر کرنے سے، اور جس کو وہ دھوکا سمجھتا تھا اس کو دلیری سے دھوکا کہہ دینے سے، حاصل ہوئی ہے وہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ [۲۶]

ہم لارڈ میکالے کو دعا دیتے ہیں کہ خدا اس کو بہشت نصیب کرے کہ اس نے اس ڈھکو سلے کی ٹٹی کو اٹھا دیا تھا۔ ۲۷

حرف آخر

سوال: آپ قوم کی ترقی کا جامع حل کیا تجویز کرتے ہیں؟

سرسید: ہمارے ملک کو، ہماری قوم کو اگر درحقیقت ترقی کرنی اور فی الواقع ہماری ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کا سچا خیر خواہ اور وفادار رعیت بننا ہے تو اس کے لئے بجز اس کے اور کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ علوم مغربی و زبانِ مغربی میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرے۔ ۲۸

اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کر دیں، ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے، یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم دن رات ہمارے دست مال ہوں، ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں۔ ہم اپنی قدر، اپنی عزت کی قدر خود آپ کرنی سیکھیں۔ ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اس کو اپنا محسن اور مربی سمجھیں۔ ۲۹

حوالہ جات

۱ مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز (سرسید احمد خاں) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء) ص ۳۳۷
۲ ایضاً ص ۳۳۵
۳ ایضاً، ۳۳۶
۴ ایضاً، ۳۳۸
۵ ایضاً، ۱۸۵۔۱۸۶
۶ ایضاً، ۳۶۔۳۷
۷ ایضاً، ۳۸۱
۸ ایضاً، ۲۵۰

اور نہ دکھائی دے سکتے ہیں..... جن فرشتوں کا قرآن میں ذکر ہے، ان کا کوئی اصلی وجود نہیں ہو سکتا بلکہ خدا کی بے انتہا قوتوں کے ظہور کو اور اُن قویٰ کو جو خدا نے اپنی تمام مخلوق میں مختلف قسم کے پیدا کئے ہیں، ملک یا ملائکہ کہا ہے۔ [۳]

سوال: قرآن مجید میں تو فرشتوں کے نام بھی آتے ہیں، اگر وہ مجسم نہیں تو کیا ہیں؟

سرسید: قرآن مجید میں صرف دو فرشتوں یعنی جبرائیل و میکائیل کا نام آیا ہے۔ وہ دونوں فرشتے یہودیوں کے ہاں بھی اسی نام سے مشہور ہیں۔ [۴]

ان دونوں کے نام قرآن مجید میں آنے سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ درحقیقت اس نام کے دو فرشتے مع تشخصہا علیحدہ علیحدہ ایسی ہی مخلوق ہیں جیسے کہ زید و عمر ..... کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ باوجودیکہ خدا کے پاس ان دو فرشتوں کے سوا اور بھی بہت سے فرشتے ہیں مگر بجز دو فرشتوں کے اور سب بے نام ہیں کیونکہ کسی اور کا نام قرآن میں نہیں آیا! حضرت عزرائیل بھی بڑے مشہور فرشتے ہیں جو سب کے پاس آئیں گے اور کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ اگر چہ ان کا ذکر بلفظ ''ملک الموت'' قرآن میں آیا ہے مگر ان کا کچھ نام نہیں بیان ہوا ہے۔ ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودیوں کے مقرر کئے ہوئے ہیں جو مختلف قویٰ کی تعبیر کرنے کو انہوں نے رکھ لئے تھے۔ [۵]

سوال: اگر فرشتوں کا کوئی وجود نہیں اور جبریل ایک فرضی نام ہے تو انبیاء کرام پر وحی کا ذریعہ کیا تھا؟

سرسید: خدا اور پیغمبر میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ خود خدا ہی پیغمبر کے دل میں وحی جمع کرتا ہے، وہی پڑھتا ہے، وہی مطلب بتاتا ہے، اور یہ سب کام اسی فطری قوت نبوت کے ہیں جو خدا تعالیٰ نے مثل دیگر قوائے انسانی کے انبیا میں بمقتضائے اُن کی فطرت کے پیدا کی ہے اور وہی قوت ناموسِ اکبر ہے اور وہی قوت جبرائیل پیغامبر۔ [۶]

جنوں کی مخلوق اور شیطان کا خارجی وجود

سوال: جنّوں کی مخلوق کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

سرسید: تمام علمائے اسلام نے جنّوں کی جداگانہ ایسی ہی مخلوق قرار دی ہے جیسے کہ انسان کی، مگر قرآن مجید سے جنّوں کی ایسی مخلوق ہونے کا ثبوت نہیں عام مسلمان خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک ہوائی آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں مرد اور عورت دونوں ہیں۔ وہ لڑکے اور لڑکیاں جنتے جناتے ہیں، طرح طرح کی شکلوں میں بن جاتے ہیں، انسانوں کے سروں پر آتے ہیں، ان کو تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کو اٹھالے جاتے ہیں، ان کو مار ڈالتے ہیں، انسانوں پر عاشق ہو جاتے ہیں، ان کو تازہ بہ تازہ میوے لا کر دیتے ہیں، اور دکھائی نہیں دیتے مگر جب چاہیں اور جس شکل میں چاہیں، اپنے تئیں دکھلا دیتے ہیں یعنی اپنے جسم میں دفعۃً ایسا مادہ پیدا کر لیتے ہیں کہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ آدمی کی صورت بن کر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، عامل ان کو آدمی بنا کر اپنے گھوڑے کا سائیس کر لیتے ہیں مگر اس میں سے ایک بات بھی قرآن مجید سے ثابت نہیں۔ [۷]

کتب احادیث و سیر میں جو قصے جنّوں کے لکھے ہیں، وہ تو ایسے ہیں جیسے کہ اس زمانہ میں مشہور ہوتے ہیں اور جن کی کچھ اصلیت نہیں ہوتی۔ [۸]

قرآن مجید میں بھی کہیں استعارۃً جن کا اطلاق شیطان معنوی للانسان پر ہوا ہے اور کہیں وحشی اور شریر انسانوں پر اور کہیں بطور الزام وخطابیات اُسی وجود خیالی پر جس کا مشرکین یقین کرتے تھے۔ [۹]

جہاں جن کے لفظ کا فی الواقع ایک مخلوق مستقل پر اطلاق ہوا ہے، اس سے جنگلی اور وحشی انسان مراد ہیں جو پوری پوری تمدنی حالت میں نہیں ہیں۔ [۱۰]

سوال: کیا آپ ابلیس یا شیطان کے وجود کے قائل ہیں؟

سرسید: میں شیطان کے وجود کا قائل ہوں مگر انسان ہی میں وہ موجود ہے، خارج عن الانسان نہیں۔ [۱۱]

مفسّروں کو بڑی دقت پڑی ہے کیونکہ وہ شیطان کو ایک جداگانہ مخلوق خارج از انسان اور خدا تعالیٰ کا مخالف اور لوگوں کو بدی و نافرمانی پر رغبت دینے والا اور بہکانے والا، کفر و شرک میں ڈالنے والا قرار دیتے ہیں۔ [۱۲]

قرآن مجید میں شیطان کا لفظ اُنہی قویٰ پر جو بمقابلہ قویٰ ملکوتیہ کے انسانوں میں بمقتضائے فطرت و خلقت انسانی کے ہیں، اطلاق ہوا ہے نہ کہ کسی ایسے وجود خارجی پر جو خدا کے مقابل اور اس کا ندِّ مخالف ہو۔ [۱۳]

ان صفات شیطان کا، جو ہمارے پاک خدا اور سچے پیغمبر نے بتلائی ہیں، ہم اپنے میں اثر تو پاتے ہیں مگر کسی وجود خارجی کو نہیں پاتے۔ دن رات ہم کو شیطان بہکاتا ہے اور گناہوں میں پھنساتا ہے مگر کوئی وجود خارجی محسوس نہیں ہوتا بلکہ ہم بالیقین پاتے ہیں کہ خود ہم ہی میں ایک قوت ہے جو ہم کو سیدھے راستے پر سے پھیرتی ہے، ہم کو بے انتہا ترغیبوں سے بہکاتی ہے۔ شیطان سمجھ کر اس کی ڈاڑھی پکڑ لیتے ہیں اور زور سے طمانچہ مارتے ہیں مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو اپنی ہی سفید ڈاڑھی اپنے ہاتھ میں اور اپنا ہی گال لال دیکھتے ہیں۔ [۱۴]

لفظ شیطان سے اگر کوئی وجود خارج من الانسان مراد لی جائے تو ضرور قرآن مجید کو نعوذ باللہ غلط یا خلاف واقعہ ماننا پڑے گا کیونکہ حقیقت میں کوئی وجود خارجی مغوی للانسان موجود نہیں ہے ...... جو لوگ اس کے قائل ہوئے ہیں، انہوں نے خود اپنی ہی صورت آئینہ میں دیکھی ہے۔ [۱۵]

انبیاءِ کرام کے معجزات

سوال: کیا آپ معجزات پر یقین رکھتے ہیں؟

سرسید: انسان کے دین اور دنیا اور تمدن و معاشرت بلکہ زندگی کی حالت کو کرامت اور معجزہ پر یقین یا اعتقاد رکھنے سے زیادہ خراب کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ [۱۶]

کوئی مذہب جو سچا ہے اور سچا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس میں کبھی ایسے

عجائبات نہیں ہوتے جو فطرت کے خلاف ہوں، عقلِ انسانی کے خلاف ہوں اور کوئی سمجھ دار آدمی اُن کو تسلیم نہ کرے بلکہ اصلی اور سچا مذہب ایسے عجائبات خلافِ فطرت اور خلافِ عقل سے بالکل پاک اور خالی ہوتا ہے۔ [۱۷]

مذہب اسلام اس امر کا، جس کو لوگ معجزہ و کرامت کہتے ہیں، سخت مخالف ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے معجزوں کا ذکر ہے مگر وہ کیا ہیں؟ انسان کا پیدا کرنا، مینہ کا برسانا، اناج کا میووں کا اگانا، سورج چاند ستاروں کا پیدا کرنا، اور یہی درحقیقت معجزے ہیں۔ [۱۸]

سوال: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش کی آپ کیا تعبیر کریں گے؟

سرسید: میرے نزدیک قرآن مجید سے ان کا بے باپ ہونا ثابت نہیں ہے۔ [۱۹]

قانونِ فطرت نے یہ بتایا ہے کہ جوڑے سے یعنی زن و مرد سے اور نطفہ کے ایک مدت معین تک مقرر جگہ میں رہنے سے انسان پیدا ہوتا ہے، پس اس قانونِ فطرت کے برخلاف اُسی طرح نہیں ہو سکتا جس طرح کہ قولی وعدہ کے برخلاف نہیں ہو سکتا۔ [۲۰]

حضرت مریم......حسبِ قانونِ فطرتِ انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں۔ [۲۱]

سوال: نمرود کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنا اور ان کا محفوظ رہنا، اس کی بابت آپ کیا کہتے ہیں؟

سرسید: قرآن مجید کی کسی آیت میں اس بات پر نص نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم درحقیقت آگ میں ڈالے گئے تھے۔ بے شک ان کے لئے آگ دہکائی گئی تھی اور ڈرایا گیا تھا کہ ان کو آگ میں ڈال کر جلا دیں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ آگ میں ڈالے گئے، قرآن مجید سے ثابت نہیں ہے۔ [۲۲]

خدا نے ہم کو قانونِ فطرت یہ بتایا ہے کہ آگ جلا دینے والی ہے۔ پس جب

تک یہ قانونِ فطرت قائم ہے، اس کے برخلاف ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کہ قولی وعدہ کے برخلاف ہونا ناممکن ہے۔ [۲۳]

سوال: آنحضرت ﷺ کے واقعۂ معراج اور معجزہ شق قمر ہونے کے بارے میں آپ کی تحقیق کیا ہے؟

سرسید: قرآن مجید میں کہیں بیان نہیں ہوا ہے کہ اسرا یا معراج بجسدہ و حالتِ بیداری میں ہوئی تھی۔ [۲۴]

تمام واقعات معراج سونے کی حالت یعنی خواب میں رسول خدا ﷺ نے دیکھے تھے۔ [۲۵]

معراج کے متعلق جس قدر حدیثیں ہیں ان میں آنحضرت ﷺ کا بجسدہ جبریل کا ہاتھ پکڑ کر، خواہ براق پر سوار ہو کر یا پرند جانور کے گھونسلے میں بیٹھ کر جو درخت میں لٹکا ہوا تھا، بیت المقدس تک جانا اور وہاں سے بجسدہ آسمان پر تشریف لے جانا یا بذریعہ ایک سیڑھی کے، جو آسمان تک لگی ہوئی تھی، چڑھ جانا خلاف قانونِ فطرت ہے۔ [۲۶]

شق قمر کا ہونا محض غلط ہے اور بانی اسلام نے کہیں اس کا دعویٰ نہیں کیا۔ [۲۷]

ہم کو اور اسلام کو تو فخر اس بات پر ہے کہ ہمارے برحق پیغمبر خدا محمد ﷺ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس تو کوئی معجزہ و عجزہ نہیں ہے، اگر ہو گا تو خدا کے پاس ہو گا...... ہم کو اور اسلام کو تو اس سچے ہادی پر فخر ہے جس نے نہ لکڑی کو سانپ کر دکھایا اور نہ اپنے دستِ مبارک کو چمکایا، نہ کچی بات پر کچھ پردہ ڈالا، نہ خدا کی قدرت کے قانون کو توڑنے کا دعویٰ کیا۔ [۲۸]

آنحضرت ﷺ کے پاس، جو افضل الانبیاء والرسل ہیں، معجزہ نہ ہونے کے بیان سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے سابقین علیہم السلام کے پاس بھی کوئی معجزہ نہیں تھا۔ اور جن واقعات کو لوگ معجزہ (متعارف معنوں میں) سمجھتے تھے،

درحقیقت وہ معجزات نہ تھے بلکہ وہ واقعات تھے جو مطابق قانونِ قدرت کے واقع ہوئے تھے۔ [۲۹]

حرفِ آخر

سوال: اسلام کی زد سے کون لوگ آخر کو نجات پائیں گے؟

سرسید: جو لوگ کہ پیغمبروں کی راہ پر ہیں وہ ضرور نجات پائیں گے خواہ وہ پیغمبر چین کا ہو یا ماچین کا، عرب کا ہو یا فلسطین کا، امریکہ کا ہو یا افریقہ کا، ہندوستان کا ہو یا فارستان کا، مہذب لوگوں کا ہو یا وحشیوں کا۔ [۳۰]

موحدین نجات پاتے ہیں اور مشرکین ہمیشہ دوزخ میں رہتے ہیں اور یہ کہ یہ بہت بڑی بحث ہے کہ موحدین کا اطلاق کن کے اوپر ہوتا ہے جو آخر کو نجات پاتے ہیں۔ [۳۱]

اسلام کے اصلی اصولوں کے موافق، نہ ان اصولوں کے جن کو علما نے قرار دیا ہے، وہ شخص جو نہ کسی نبی کو مانتا ہو نہ کسی اوتار کو، نہ کسی کتابِ الہامی کو اور نہ کسی حکم کو جو مذاہب میں فرض و واجب سے تعبیر کئے گئے ہیں، اور صرف خدائے واحد پر یقین رکھتا ہو، کون ہے؟ ہندو ہے؟ نہیں۔ زرتشی ہے؟ نہیں۔ موسائی ہے؟ نہیں۔ عیسائی ہے؟ نہیں۔ محمدی ہے؟ نہیں۔ پھر کون ہے؟ مسلمان۔ گو ہم نے ایسے شخص کے محمدی ہونے سے انکار کیا مگر اس کا محمدی ہونا ایسا ہی لازم ہے جیسے کہ اس کا مسلمان ہونا کیونکہ انہی کی بدولت وہ مسلمان کہلایا ہے۔ پس وہ بھی درحقیقت محمدی ہے، پر ناشکرا محمدی جیسے کہ ہمارے زمانے میں بعض فرقے ہیں جو غائبانہ توحیدِ ذات باری پر بکمال یقین رکھتے ہیں، اگر کہو کہ وہ کافر ہیں تو غلط ہے کیونکہ کافر تو نجات نہیں پانے کا مگر موحد سے تو خدا نے نجات کا وعدہ کیا ہے۔ [۳۲]

سوال: کیا اس طرح آپ لامذہبی کو بھی اسلام کے کھاتے میں نہیں ڈال رہے؟

سرسید: اسلام ایک سیدھا سادا بے کھسر وسیع مذہب ہے کہ لامذہبی بھی، جو لوگوں نے اپنے خیال میں سمجھ رکھی ہے، درحقیقت اسلام ہی کا ایک نام ہے۔ عدم محض کا تو

وجود نہیں ہے، پس لامذہب بھی کوئی مذہب رکھتا ہوگا اور وہی اسلام ہے۔ ۳۳

سوال: تو جو لوگ خدا کی ہستی سے بھی انکاری ہیں، کیا آپ انہیں بھی مسلمان کہیں گے؟

سرسید: جن لوگوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ خدا کے وجود کے بھی قائل نہیں ہیں، میں تو ان کو بھی مسلمان جانتا ہوں۔ اوّل تو یہ کہنا کہ وہ خدا کے وجود کے قائل نہیں ہیں، غلط محض ہے۔ خدا کے وجود پر یقین کرنا انسان کا امرِ طبعی ہے، کوئی دل اس سے خالی نہیں۔ دوسرے یہ کہ خدا کے وجود کا انکار اُن پر تہمت ہے۔ ان کا قول یہ نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی دلیل اس کے ثبوت کی نہیں ہے۔ پس یہ انکار انکارِ وجود نہیں ہے بلکہ انکارِ علم دلیل سے ہے، اور بلحاظ امرِ طبعی ان کا دل وجودِ باری کا مصدق ہے اور شرک سے بری ہیں۔ پھر اہلِ جنت ہونے میں کیا باقی رہا؟ ۳۴

حوالہ جات

۱۔ خطباتِ احمدیہ (سرسید احمد خاں) مسلم پرنٹنگ ورکس لاہور (ب ـ ت) ص ۲۶۳
۲۔ تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (جلد سوم ـ ۱۸۸۵ء) ص ۴۷
۳۔ ایضاً (جلد اول ـ ۱۸۸۰ء) ص ۳۹
۴۔ ایضاً ص ۱۳۰
۵۔ ایضاً ص ۱۵۳ ـ ۱۵۴
۶۔ ایضاً ص ۳۰
۷۔ ایضاً (جلد سوم) ص ۸۰ ـ ۸۱
۸۔ تفسیر الجن والجان علیٰ مافی القرآن (سرسید احمد خاں) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۲ء) ص ۳۳
۹۔ تفسیر القرآن (جلد سوم) ص ۸۱
۱۰۔ ایضاً (جلد پنجم ـ ۱۸۹۲ء) ص ۱۹۵
۱۱۔ تہذیب الاخلاق (جلد دوم) مرتبہ منشی فضل الدین مصطفائی پریس لاہور (۱۸۹۵ء) ص ۳۳۱
۱۲۔ تفسیر القرآن (جلد سوم) ص ۳۸۸
۱۳۔ ایضاً ص ۳۸۹

۱۴ تہذیب الاخلاق (جلد دوم) ص ۲۱۰

۱۵ ایضاً، ص ۲۱۱

۱۶ مقالات سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (حصہ اول۔۱۹۶۲ء) ص ۴۳

۱۷ آخری مضامین سرسید (مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء) ص ۴۳

۱۸ مقالات سرسید (حصہ اول) ص ۱۲۷

۱۹ مکتوبات سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (جلد دوم۔۱۹۸۵ء) ص ۱۱۶

۲۰ تحریر فی اصول التفسیر (سرسید احمد خاں) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۲ء) ص ۳۹

۲۱ تفسیر القرآن (جلد دوم۔۱۸۸۲ء) ص ۳۶

۲۲ تفسیر القرآن سرسید (جلد ہشتم) فیروز پرنٹنگ پریس لاہور (۱۹۲۱ء) ص ۲۰۸

۲۳ تحریر فی اصول التفسیر، ص ۳۰

۲۴ تفسیر القرآن (جلد ششم۔۱۸۹۵ء) ص ۸۰

۲۵ ایضاً، ص ۹۲

۲۶ ایضاً، ص ۱۳۰

۲۷ تصانیف احمدیہ (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (حصہ اول، جلد اول۔۱۸۸۳ء) ص ۲۱

۲۸ تفسیر القرآن (جلد سوم) ص ۲۲۰۔۲۲۱

۲۹ ایضاً، ص ۲۹

۳۰ مقالات سرسید (حصہ چہارم۔۱۹۶۲ء) ص ۲۷۰

۳۱ ایضاً (حصہ اول) ص ۲۱۳

۳۲ ایضاً (حصہ سوم۔۱۹۶۱ء) ص ۱۷

۳۳ ایضاً

۳۴ ایضاً، ص ۱۸

بکھرے موتی

مطالعۂ سرسید میں پیش نظر رکھے جانے والے چند رہنما اصول

پروپیگنڈہ کے زور پر بننے والے ''مصدقہ حوالے'' (پروفیسر مرزا محمد منور)

پروپیگنڈے میں بڑی طاقت ہے۔ انسانی ذہانت نے ابلیسی کمال کے ساتھ سازباز کر کے بددیانتی اور بے ایمانی کے جن فنون میں بے پناہ ترقی حاصل کی ہے، ان میں سے ایک فن پروپیگنڈہ ہے۔ پروپیگنڈے کا اصل مفہوم کچھ بھی ہو، آج اس کلمے کا مروج بمعنی جھوٹ کی اشاعت ہے۔ جب ہم کسی خبر کو رد کرنا چاہیں تو کہتے ہیں: ''چھوڑیے صاحب، یہ محض پروپیگنڈہ ہے'' لیکن وہی خبر جب مسلسل سنائی جاتی رہے تو آہستہ آہستہ اثر کرنے لگتی ہے، حتیٰ کہ خود سنانے والے کو یہ یاد نہیں رہتا کہ اس نے یہ خبر گھڑی تھی یا یہ کہ اس میں صداقت کی مقدار کے مقابل دروغ کا حصہ بہت زیادہ تھا...... رفتہ رفتہ جب وہی پروپیگنڈہ کتابوں میں داخل ہو کر ''مصدقہ حوالہ'' بن جائے تو پھر صداقت اللہ کے حوالے۔

(بحوالہ کنز الایمان لاہور، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۳)

مبالغہ، اخفا، تحریف اور مفروضہ و تراشیدہ واقعات (محمد امین زبیری)

اگر حکایت واقعات کسی خاص نظریے سے مبالغہ و اخفا اور تحریف و تلمیح کے ساتھ کی

جائے یا واقعات مفروضہ و تراشیدہ ہوں تو وہ ایسی گمراہی اور ضلالت ہے جس سے آئندہ نسلوں کا نجات پانا تقریباً ناممکن ہے، اور وہ جو کچھ فیصلہ کرتی رہیں گی وہ ایک ابدی گمراہی و ضلالت و بناء الفاسد علی الفاسد ہوگی۔ (ذکرِ شبلی، ص:۶)

ایشیائی شخص پرستی اور خیانت و خدائی (شبلی نعمانی)

ہمارے زمانے میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان میں باوجود دعویٰ آزادی کے تنقید اور جرح سے بالکل کام نہیں لیا گیا اور اس کا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں، لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کر رہے ہیں۔ جس چیز نے انہیں اظہارِ حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخص پرستی ہے جس کا اثر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس کا احساس نہیں ہوتا۔ اس غلامانہ شخص پرستی سے ایک بڑا ضرر یہ ہے کہ جو لوگ ان اکابر کی تقلید کرتے ہیں اُن میں ہزاروں ایسے ہوتے ہیں جن کو خود نیک و بد کی تمیز نہیں ہوتی اس لئے وہ اچھی باتوں کے ساتھ اکابر کی غلطیوں کی بھی تقلید کرنے لگتے ہیں اور سلسلہ در سلسلہ تمام قوم میں اس کا اثر پھیل جاتا ہے۔ (موازنہ انیس و دبیر، ص ۲۲۵)

آج کل کی سوانح نگاری کا انداز یہ ہے کہ حقیقت نگاری ظاہر کرنے کے لئے "ہیرو" پر نکتہ چینی کی جاتی ہے لیکن اس طرح کہ محاسن نہایت وسعت اور عمومیت کے ساتھ ہر پہلو سے دکھائے جاتے ہیں، پھر نہایت کمزور اور ضعیف الفاظ میں ایک آدھ اعتراض بھی کر دئے جاتے ہیں جس سے دراصل مداحی کو اَور قوت دینی مقصود ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ ظاہر کرنا منظور ہوتا ہے کہ مصنف نے واقعہ نگاری کے لحاظ سے کسی واقعہ کو چھپانا نہیں چاہا ہے اور اس لحاظ سے ممدوح کی چھوٹی سے چھوٹی برائی کا بھی ذکر کر دیا ہے ورنہ ایسے محاسن اور خوبیوں کے مقابلہ میں ایک ذرا سی برائی نظر انداز کرنے کے قابل تھی۔ یہ طریقہ ہماری زبان کے سوانح نگاروں نے یورپ سے سیکھا ہے۔ اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں کا یہی انداز ہے لیکن یہ طریقہ قدیم طریقہ سے بہت زیادہ قابلِ اعتراض بلکہ خطرناک ہے۔ قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا

لیکن موجودہ طریقہ درحقیقت خیانت اور غدائی ہے جو واقعہ نگاری سے بہ مراحل دور ہے۔"
(مقالات شبلی، جلد چہارم، ص ۵)

نیک نیتی اور خلوص کا کاروبار (خورشید الاسلام صدیقی)

خلوص خلا میں تیرنے والا جذبہ نہیں ہے۔ اس کا اظہار ہماری ٹھوس زندگی میں ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ میں دُنیا سے بیزار ہوکر آپ کو رضا کارانہ طور پر مرنے کا مشورہ دوں اور خود آپ کا مشورہ لئے بغیر دُنیا سے دامن کشاں چلا جاؤں، اور یہ سارا کاروبار نیک نیتی اور خلوص پر مبنی ہو تو کیا آپ کے خیال میں میری نجات ہوجائے گی؟
(شبلی اور یوں کی نظر میں، ص ۱۳۱)

بڑے آدمیوں کی باتیں (ملک نصراللہ خاں عزیز)

بڑے آدمیوں کی اکثر باتیں ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتیں۔
(زندگی کی گزرگاہوں میں، ص ۳۶)

تحریکوں کے حالات میں برابر رنگ آمیزی (پروفیسر محمد سرور)

سیاسی تحریکوں (بلکہ عام تحریکوں۔ ناقل) کے بارے میں خالصتاً غیر جانب داری کا رویہ اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ہر آدمی ان سرگرمیوں کو اپنی ہی نظر سے دیکھتا اور ان کے حسن و قبح کو اپنے ہی مفاد سے جانچتا ہے، یہاں تک کہ ... تحریکوں کے خود حالات و واقعات تک بھی صحیح طور پر نقل نہیں ہوتے اور ان میں برابر رنگ آمیزی ہوتی رہتی ہے۔ بار ہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی واقعہ ہے جس کی ایک سے زیادہ آدمی روایت کرتے ہیں، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص کی روایت دوسرے سے نہیں ملتی۔ اس بارے میں صرف اُن کے تاثرات و محسوسات ہی باہم مختلف نہیں ہوتے بلکہ اُن کا مشاہدہ تک بھی آپس میں نہیں ملتا۔
(تحریک پاکستان کا ایک باب، ص ۱۴)

پیشین گوئیوں پر اعتقاد اور اُن سے مرعوبیت (پروفیسر عبدالحق)

میں پیشین گوئیوں کا نہ معتقد ہوں اور نہ مرعوب، جیسے پیکر اقبال میں روح غالب کا

حلول کرتا۔ یا اگر سرسید نہ ہوتے تو فارسی زبان میں خودی کا فلسفہ نازل نہ ہوتا، یا اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال کی شاعری نہ ہوتی جیسے اقوال بے معنی ہیں۔ ہر مفکر اور مجتہد نہاں خانۂ ازل سے اپنی متاعِ فکر کا مالک ہوتا ہے مگر وہ اسلاف کی فکری یافت سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ انسان فلسفہ و ادراک ایک تکفیری تسلسل کا نام ہے جو ردّ و قبول کے باوجود رواں دواں رہتا ہے۔ وحدتِ فکر میں ارتباط و انضمام کے عمل کی کارفرمائی بھی نمایاں رہتی ہے۔

(مقالات قومی سرسید سیمینار، ص ۱۱۱)

اپنے ''ہیرو'' کی شخصیت نگاری کا مسئلہ (پروفیسر سلیم اختر)

کسی متنازعہ فیہ شخصیت کے بارے میں اگر شخصیت نگار نے پہلے سے ہی دل میں ٹھان رکھی ہو کہ ''اس کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا'' تو نتیجہ ظاہر ہے۔ اس کے ساتھ جب شخصیت نگار کو یہ احساس بھی ہو کہ زمانہ ''کریٹیکل بائیوگرافی'' لکھنے کا نہیں تو ایسے میں اس کا سونا کسوٹی پر پرکھنا، اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھنا اور ''نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے'' وغیرہ محض خالی دعوے ہی رہ جاتے ہیں۔ دراصل حالی طبعاً سرسید تو کیا کسی کی بھی ''کریٹیکل بائیوگرافی'' نہ لکھ سکتے تھے۔ ''حیاتِ جاوید'' میں یہ انداز پیدا کرنا اور بھی مشکل تھا کہ وہ خود بھی سرسید کو ''ہیرو'' اور ''مثالی'' شخصیت سمجھتے تھے، اس لئے وہ خوبیوں کو تو خوب صورتی کے ساتھ اجاگر کرتے ہیں لیکن نزاعی امور میں معذرت، جواز اور توجیہات پیش کرتے ہیں۔ (نگار کراچی، سرسید نمبر ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۶)

علی گڑھ سے تعلق بمقابلہ سرسید پر طنز (ڈاکٹر سید عبداللہ)

علی گڑھ سے تعلق رکھنے والا طبقہ کسی ایسے آدمی سے صحیح معنوں میں خوش نہیں رہ سکتا جس نے سرسید پر کوئی طنز کی ہو۔ (طیفِ نثر، ص ۲۱۶)

سرسید کے رُفقا کی انگریز پرستی

انگریزی حکومت کی اطاعت کے حق میں جوازات

نواب محسن الملک

۲۰ جون ۱۸۹۷ء کو جو شصت سالہ حکومت ہماری عادل فرماں روا حضور ملکہ معظمہ قیصرۂ ہند کی پوری ہونے والی ہے، اس کی خوشی کے اظہار کرنے کے لئے ایک یادگار ہم مسلمانوں کو قائم کرنی چاہیے کیونکہ ''حضور پُر نور'' کے عہد معدلت مہد میں ہم نے اپنی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ حاصل کرنے کا موقع پایا ہے اور ہم کو ہر قسم کی بہبودی اور ترقی کرنے کے وسائل حاصل ہوئے ہیں، اس لئے بحیثیت ایک وفادار رعایا ہونے کے ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس خوشی میں دل سے شریک ہوں اور اس کی یادگار قائم کرنے میں بے دریغ کوشش کریں۔ (مجموعہ لکچرز و اسپیچز نواب محسن الملک، ص ۳۰۶)

ہم تمام مسلمانوں کو اس بات کا یقین ہے کہ حکومت برطانیہ سے بڑھ کر کوئی ایسی حکومت نہیں ہے جو اپنی رعایا کی بہبودی اور فلاح اور ترقی کی خواہاں ہو اور جسے سوائے رعایا کی بھلائی کے کوئی دوسری بات پیش نظر ہو۔ سو برس کے تجربہ نے ہم کو گورنمنٹ کے انصاف بے طرف دارانہ کارروائی پر یقین دلایا ہے اور ہم صدق دل سے اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ کسی کارروائی میں گورنمنٹ کو نہ خود غرضی کا خیال ہوتا ہے، نہ کسی خاص فریق کی حمایت اور طرف داری منظور ہوتی ہے.........

ہمارے دلوں میں ملکہ معظمہ کی محبت ہے اوران کی گورنمنٹ کی برکتوں پر ہم کو یقین ہے اور اسی گورنمنٹ کی بدولت ہم اپنی سلطنت کے جانے کے بعد اپناوجود ہندوستان میں دیکھتے ہیں اورآزادی اورامن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ پس ہم کوقلم سے کچھ نہیں کر سکتے مگر خدانخواستہ جب مغرب سے ہم کسی کواس گورنمنٹ کے مقابلہ میں آتے دیکھیں گے تو اُسی طرح ملکہ معظمہ کے تاج اور سلطنت پر اپنا خون بہائیں گے جیسا ہم اپنے مذہب بادشاہوں کی بادشاہی قائم رکھنے کے لئے بہاتے تھے۔ (ایضاً،ص ۳۸۳۔۳۸۴)

برٹش گورنمنٹ وہ گورنمنٹ ہے کہ صداقت، انصاف اور آزادی پر اس کی بنیاد ہے۔ (ایضاً،ص ۳۹۰)

انگریزی قوم نے تعلیم اور تہذیب میں اعلیٰ درجہ کی ترقی کی ہے اوران کے طرزِ عمل اور برتاؤ سے اس کے عمدہ نتیجے ظاہر ہیں۔ اس لئے مجھے کچھ تعجب نہیں ہے کہ ہم اپنی اس قومی مجلس میں بہت سی پاکیزہ صورتیں ان کی دیکھتے ہیں۔ اور میں یقین کرتا ہوں کہ کوئی اور خیال ان کو یہاں نہیں لایا، سوائے اُس انسانی ہمدردی کے جو اس قوم کا خاصہ ہے۔ اس لئے میں تہِ دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں اوران کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کی یہ ہمدردی ایسی قوم کے ساتھ ہے جو گووہ مغربی تعلیم وتربیت میں پیچھے ہے مگران کے کان میں یہ الہامی آواز کہ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان برابر گونجتی رہتی ہے اور اپنے محسنوں کے احسان کو ہمیشہ نہایت شکرگزاری کے ساتھ یاد کرتی ہے۔ اور گواس کی سلطنت، ثروت، دولت جاتی رہی ہے مگر اس کا مذہب زندہ ہے اور وہ اپنی مذہبی روایتوں کو نہیں بھولی۔ اس کا مذہب اس کو سکھاتا ہے کہ اپنے ساتھ نیکی اور سلوک کرنے والوں کا احسان مانیں اور جس گورنمنٹ کی رعیت ہوں، اس کی پوری اطاعت کریں اور دل سے اس کے وفادار رہیں۔ اور خدا کا شکر ہے کہ وہ ایک ایسی سلطنت کی رعیت ہیں جس کی حکومت میں وہ پوری آزادی رکھتے ہیں اور ہر طرح کی ترقی کر سکتے ہیں۔ (ایضاً،ص ۴۳۱)

گورنمنٹ بھی چونکہ ظلِ الٰہی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے بھی اس نظیر کی

پیروی کی ہے جو شہنشاہ حقیقی نے قائم کی ہے، یعنی بجائے ان بہت سے عطیات کے جو سلاطین سابق اپنی رعیت کو بخشتے تھے، گورنمنٹ نے ہم کو امن و آزادی عطا کی ہے۔ (ایضاً ص ۳۰۶)

ہر ایک بورڈر، جو مدرسۃ العلوم کی چار دیواری میں قدم رکھتا ہے، اپنے تئیں نئی آب و ہوا اور ایک نئی زندگی میں پاتا ہے اور اپنی گرد و پیش کی تمام چیزوں میں زندہ دلی اور شگفتگی اور حرکت اور جوش دیکھتا ہے، اس کے کانوں میں ہر طرف سے محبت، ہمدردی اور گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی کی آوازیں آتی ہیں...... (ایضاً ص ۳۶۶)

یہاں کی مذہبی تعلیم تعصب سے پاک ہے، تفرقہ کو دور کرنے والی ہے، غیر مذہب والوں سے اتحاد اور دوستی رکھنے کی تعلیم دیتی ہے، گورنمنٹ کی اطاعت اور سچی خیر خواہی کو جزو اسلام بتاتی ہے۔ (ایضاً ص ۴۷۰)

اس (کالج) کا بیج تو بویا سرسید نے، اب جب کہ یہ پھلے پھولے گا اور اس میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو تہذیب، شائستگی، علمی قابلیت اور گورنمنٹ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی مثال ہوں گے تو اُس وقت گورنمنٹ انگریزی کی برکتوں اور آزادی کی بشارت دیتے پھریں گے۔ (ایضاً ص ۴۸۶)

جو اصلی دعا ہے اور جس پر ساری دعائیں منحصر ہیں، وہ دعا ہے اپنی قیصرۂ ہند ملکہ معظمہ اور اُن کی گورنمنٹ کی جس کے سایۂ عاطفت میں ہر قوم آزاد اور ہر شخص اپنی فلاح کی تدبیروں میں مشغول ہے...... یہ آزادیاں اور یہ آسانیاں جس گورنمنٹ کی بدولت ملک اور ملک کے سب باشندوں کو حاصل ہوں، اس کا شکر اور اس کے لئے دل سے دعا کرنا ہر بشر پر فرض ہے۔ (ایضاً ص ۴۴-۴۵)

......مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ وہ پارسیوں کی طرح تاج برطانیہ کے اس لئے شکر گزار ہیں کہ ہندوستان میں ان کی ہستی کا قیام اس گورنمنٹ کے قیام پر منحصر ہے۔ ان دونوں قوموں کے لئے یہ امر یقیناً بیہودہ ہوگا کہ وہ ایسے منصوبے کی مدد کریں جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اسی طاقت کی بیخ کنی کریں جس کے سبب سے ان کو مذہبی آزادی، رائے اور خیالات کی آزادی،

تجارتی آزادی اور وہ آزادی حاصل ہے جس سے وہ بحیثیت ایک مستقل گروہ کے اس ملک میں زندگی بسر کرتے ہیں..... یہ انگریزوں ہی کی آمد تھی جس نے دہلی کی اسلامی حکومت کو مرہٹوں اور سکھوں اور راجپوتوں میں تقسیم ہونے سے بچایا اور صرف اسی امر کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو تاج برطانیہ کے ساتھ وفادار رہنا چاہیے۔ (تذکرۂ محسن، ص ۱۷۷)

نواب وقار الملک

خدا نے خود ہم کو اس بات سے مطلع فرمایا ہے کہ نصاریٰ تمہارے ساتھ زیادہ دوستی کریں گے، کما قال ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنو الّذین قالو انّا نصاریٰ ذالک و بان منھم قسیسین و رھباناً و انھم لا یستکبرون۔ بعض دوستیاں اس قسم کی بھی ہیں کہ گویا ایک فریق دوستی کا اظہار کرے لیکن دوسرے فریق کو اس سے کنارہ ہی کرنا اولیٰ ہے لیکن خدا نے نصاریٰ کی اس دوستی کی علت بھی بیان فرمادی تاکہ کسی کو شبہ نہ رہے کہ وہ دوستی کس قسم کی ہوگی، اور فرمایا کہ وہ اس واسطے تمہارے دوست دار ہوں گے کہ ان میں عالم ہیں اور درویش ہیں اور وہ غرور نہیں کرتے یعنی ان کی طرف سے یہ دوستی تمہاری نسبت کمال تہذیب کے سبب ہوگی۔ جیسا عام دستور ہے کہ ایک مہذب انسان دوسرے مہذب انسان سے محبت اور دوستی سے پیش آتا ہے، پھر کیا مسلمان ایسے نامہذب اور وحشی ہو جائیں گے کہ جو فرقہ ان کا دوست ہو، اور دوست بھی ایسا دوست جس کی دوستی کی خبر خدا نے ہم کو دی، اس کے ساتھ بھی وہ نفرت سے پیش آئیں؟ کیا مسلمان بھی انگلستان اور فرانس کے نصاریٰ کے ان احسانات کو بھول سکیں گے جو کریمیا کی لڑائی میں ان کی طرف سے مسلمانوں کی سلطنت اعظم، نہیں نہیں بلکہ مسلمانوں کی مذہبی عزت برقرار رکھنے اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اسلام کا جھنڈا قائم رکھنے کے واسطے برتی گئی؟ اس لڑائی میں ہمارے یہ مددگار، جن کو خدا جزائے خیر دے، خاص اپنے مذہب، یعنی روسیوں کے مقابلہ پر جنھوں نے ظلم پر کمر باندھی تھی، کندھے سے کندھا اور سینہ سے سینہ ملا کر لڑے اور جہاں ہمارا خون گرا، وہاں انہوں نے اپنے خونوں کی بھی دھاریں بہادیں اور ہمارے دشمنوں کو مغلوب کیا اور حرمین شریفین پر، جن کا نام لے لے

کر ہمارے عالم وجد میں آجاتے ہیں، ہمارا قبضہ قائم رکھا، مگر یہ سب اس لئے ہوا کہ سلطان روم خلد اللہ ملکہٗ اپنے ان مددگاروں سے نہایت صفائی اور خلوص کے ساتھ دوستانہ ملا۔ بخارا میں اس کے برخلاف اور علمائے ناعاقبت اندیش کی مرضی کے مطابق کام ہوا غارت ہو گیا۔ پھر کیا مسلمانوں پر یہ فرض نہیں ہے کہ جب کبھی خدانخواستہ اور نصیب اعدا کوئی موقع آئے تو جہاں ہمارے ان مددگاروں کے پسینہ گرنے کا احتمال ہو، وہاں اپنے خون کے نالے بہادیں؟

(تہذیب للاخلاق، جلد چہارم، ص ۳۹۔۴۰)

برٹش گورنمنٹ کے عام اصول سلطنت چاہے کچھ ہوں اور برٹش نیشن کی لبرٹی اور انصاف پسندی چاہے رعایا کو کیسے ہی حقوق کا مستحق بناتی ہو لیکن ہم لوگوں کو، جو اپنی تاریخی روایتوں کو ابھی بھولے نہیں ہیں اور سلطنت و رعایا کے باہمی تعلقات سے بخوبی واقف ہیں، بطور ایک اصول کے یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ رعایا کے پولیٹیکل حقوق کا پودا صرف وفاداری کی سرزمین میں نشوونما پاسکتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کو قبل اس کے کہ وہ اپنے کسی حق کا مطالبہ گورنمنٹ سے کریں، اپنی گورنمنٹ کا سچا وفادار گروہ ثابت کرنا چاہیے...... وائے اس وقت پر جب کہ ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اور رنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہوں اور اس خطرہ سے بچنے کے واسطے، جبکہ خدانخواستہ وہ کسی وقت پیش آجائے، دوسرا اور کوئی راستہ مسلمانوں کے پاس اس کے سوا نہ ہوگا کہ برٹش جھنڈے کے نیچے اور اس کی حفاظت میں اپنے مالوں اور جانوں کو وقف کر دیں۔ اور ہمارا ایسا کرنا کچھ برٹش لوگوں کے واسطے نہ ہوگا بلکہ خود اپنی جان و مال و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی غرض سے ہم کو ایسا کرنا ناگزیر ہوگا۔

(تذکرہ وقار، ص ۱۶۸ تا ۱۷۰)

......تمام چیزیں کھو کر صرف ایک سہارا ہمارے لئے باقی رہ گیا ہے اور وہ برٹش گورنمنٹ کی حمایت کا سہارا ہے۔ نہایت بدبختی ہوگی اگر ہم اس سہارے کو بھی کھو بیٹھیں اور خدا کی ان برکتوں اور رحمتوں کی بھی قدر نہ کریں جو اس گورنمنٹ کے سایہ میں ہم کو حاصل ہیں۔ ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس مبارک گورنمنٹ کے وجود کو ہندوستان میں خدانخواستہ کوئی صدمہ

پہنچے یا کسی اور وجہ سے اس کو ضعف ہو جائے تو وہ قوم جس کی نسبت مقابلہ دیگر قوم کے ایک اور پانچ کی ہے، کبھی سرسبز نہیں رہ سکتی۔ (ایضاً، ص ۲۲۸)

مسلمانوں کا بقا و فنا اس ملک میں انگلش گورنمنٹ کے بقا و فنا کے ساتھ وابستہ ہے۔ (ایضاً، ص ۳۱۹)

برٹش گورنمنٹ کا سایہ ہندوستان سے اٹھنا یا اس کا اثر بہت زیادہ کم ہو جانا مسلمانوں کے حق میں بربادی بخش ثابت ہوگا...... اگر ہمیں ہندوستان میں رہنا ہے تو برٹش گورنمنٹ سے بگاڑ کر رہنا، یہ ہمارے لئے ٹھیک نہ ہوگا۔ گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش کرنا اور اس کے ساتھ شریک رہنا، یہ خود ہم کو اپنے استحکام میں کوشش کرنا ہے۔ (ایضاً، ص ۳۳۰)

''مسلمانوں کی تمام ترقیوں اور کامیابیوں کا مدار اس پر ہے کو برٹش گورنمنٹ کے ساتھ ان کا دوستانہ تعلق ہو اور تاج برطانیہ کی حمایت میں اپنی جانیں قربان کرنے اور اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہیں۔ (ایضاً، ص ۱۷۳)

ڈپٹی نذیر احمد

ہم نے سینکڑوں برس ہندو اور مسلمان دونوں کی حکومتوں کو آزمایا اور تاریخ میں اس بات کا کافی اور وافی ثبوت موجود ہے کہ کسی ایک گورنمنٹ کو بھی برٹش گورنمنٹ کی سی کامیابی نہیں، اس کا ہزارواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ ہندوؤں کی عمل داری میں مسلمانوں پر طرح طرح کی سختیاں رہیں اور مسلمانوں کی حکومت میں بعض ظالم بادشاہوں نے ہندوؤں کو ستایا۔ الغرض یہ بات فیصل شدہ ہے کہ ہمارے ہندوستان کی عافیت اسی میں ہے کہ کوئی اجنبی حاکم اس پر مسلط رہے جو نہ ہندو ہو اور نہ مسلمان۔ پس ہو نہ ہو کوئی سلاطین یورپ میں سے ہو...... خدا کی بے انتہا مہربانی اسی کی مقتضی ہوئی کہ انگریز بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے سوسوا سو برس حکومت کر کے اپنی قومی بیدار مغزی، جفاکشی، لیاقت، انصاف، رعایا پروری اور بہادری کو ایسے آشکارا طور پر ثابت کر دکھایا جیسے روز روشن میں آفتاب۔ (لکچروں کا مجموعہ، جلد اول، ص ۲۴-۲۵)

...... اسلامی سلطنت جاتی رہی تو خدا نے برٹش گورنمنٹ میں ہم کو اس کا نعم البدل

عطا فرمایا ہے کہ اس عملداری میں ہم کو امن اور آزادی۔ بشرطیکہ ہم اس سے مستفید ہونا چاہیں، اس قدر ہے کہ ہم کو اپنی سلطنت میں بھی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ ہم کو اگر ہندوستان سے اسلامی سلطنت جاتے رہنے کا خیال آتا ہے، اور اکثر آتا ہے، تو صرف اس وجہ سے کہ ہم کو برٹش گورنمنٹ کی برکات سے متمتع ہونے کا سلیقہ نہیں ورنہ ہم تو اسلامی سلطنت کو جیسی اکثر ہو گزری ہیں یا جیسی ضعیف و نامنتظم جا بجا اب بھی ہیں، کبھی بھول کر بھی یاد نہ کرتے۔ (ایضاً، ص ۳۳۲)

ہم کو برٹش گورنمنٹ پر پورا اعتماد ہے کہ اس کے ہاتھ سے نہ صرف ہماری بلکہ کسی کی بھی حق تلفی ہوئی نہیں اور ہو گی بھی نہیں...... ہم پر گورنمنٹ کے احسانات اتنے ہیں کہ ہم کو ان ہی کی شکرگزاری سے فرصت نہیں ہونی چاہیے۔ پس بجائے اس کے کہ گورنمنٹ کی کارروائیوں پر بیٹھے نکتہ چینیاں کیا کریں، ہمارے حق میں زیادہ مفید ہو گا کہ اس مبارک گورنمنٹ کی مہربانیوں اور فیاضیوں سے پورا پورا استفادہ کریں۔ (ایضاً، ص ۵۴۱)

...... حکم ہے "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم"۔ متعصب لوگ "منکم" سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ جس حاکم وقت کی اطاعت لازم ہے وہ ہم میں سے ہونا چاہیے یعنی مسلمان، حالانکہ "منکم" کی قید، قیدِ اتفاقی ہے اور "لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا" اس کا اتفاقی ہونا پکار رہا ہے۔ پس ہم مسلمان مذہباً اطاعتِ حکام پر مجبور ہیں۔ (ایضاً، ص ۳۹۲-۳۹۳)

ہم نے ...... ان کی رعایا بن کر رہنا قبول کیا تو یہ شرعاً عہد ہو گیا اور ایفائے عہد کے بارے میں جیسی کچھ تاکید قرآن میں ہے، سب کو معلوم ہے۔ (ایضاً، جلد دوم، ص ۲۱۶)

انگریزوں کے ہم مسلمانانِ ہند پر اتنے حقوق ہیں کہ وہ اہلِ کتاب ہیں اور ہم ان سے عہد امن رکھتے ہیں، اور تیسری بات یہ کہ ان کی حکومت، حکومتِ صالحہ ہے۔
(ایضاً، ص ۲۳۰)

انگریزوں کی حکومت اگر حکومتِ صالحہ نہ ہوتی، تا ہم مستامن ہونے کی حیثیت سے ان کی خیرخواہی اور اطاعت ہمارا فرض اسلامی ہوتا، فکیف جبکہ امن، آسائش اور آزادی کے

انطباد سے ... رے حق میں خدا کی رحمت ہے ... اگر انگریز نہ آتے تو کبھی کے آپس میں کٹ مرے ہوتے۔ (ایضاً، ص ۳۲۲)

شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عملداری میں ہم کو اپنی سلطنت سے زیادہ آرام و آسائش ہے۔ (حیات النذیر، ص ۱۳۷)

ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عملداری میں آنکھ کھولی ہے، خدا اس کو ابدالآباد تک سلامت رکھے۔ (ایضاً)

ہم مسلمانوں کو خدا رسول نے بھی بڑی تاکید کے ساتھ اطاعت حاکم کا حکم دیا ہے۔ پس اگر ہم مسلمان حاکم وقت یعنی انگریزوں کی سچی اطاعت نہ کریں تو دنیا کے علاوہ اپنا دین بھی کھو بیٹھیں ... قسم کھانے کی بات ہے کہ سارے ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک ایک مسلمان بھی ایسا نہ پاؤ گے جو انگریزی عمل داری کو دل سے عزیز نہ رکھتا ہو مگر مذہب کی بات مذہب کے ساتھ ہے۔ سرکار بھی کسی مذہب میں دست اندازی نہیں کرتی ...... جب خدا نے انگریزوں کو ملک پر مسلط کر دیا اور ہم نے رعایا بن کر ان کے ملک میں رہنا اختیار کیا تو اس کے یہی معنی ہیں کہ ہم میں اور انگریزوں میں ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا کہ انگریز حاکم ہونے کی حیثیت سے ہمارے حقوق کی حفاظت کریں اور ہم رعایا ہونے کی حیثیت سے ان کی اطاعت ... شریعت اسلامی کے جو احکام معطل ہیں، خدا نے حکام وقت کی اطاعت فرض کر کے ان احکام کو ہمارے حق میں خود معطل فرما دیا ہے اور ہمارے لئے انگریزی قانون ہی اسلامی قانون ہے۔ (ایضاً، ص ۱۴۱ تا ۱۴۳)

ہم انگریزوں کے مستامن ہیں اور ان کی عملداری میں ہم کو ہر طرح کا امن ہے، ہر طرح کی آسائش ہے اور جہاں تک رعایا کو آزادی ہو سکتی ہے، آزادی بھی ہے اور مـــن لـــم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ کی رُو سے ان کی خیر مناتے رہنا بھی ہمارا فرض اسلامی ہے۔ (ایضاً، ص ۱۳۸)

الطاف حسین حالی

ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں، جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو درپیش ہے، براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے۔ ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لئے درکار ہیں، ہمارے لئے بے سود ہوں گی..... ہماری خیر اب اس میں ہے کہ سب مل کر ایک دوسرے کی خیر منائیں۔

(حیات جاوید، دیباچہ، ص ا۔۲)

ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح اپنے مذہب کی رُو سے اس بات کی ضرورت ہے کہ سچے دل سے انگلش گورنمنٹ کے وفادار رہیں، اسی طرح ملکی مصلحت سے یہ بھی ضرور ہے کہ حکمران قوم کو کبھی اپنی طرف سے بدگمان ہونے کا موقع نہ دیں۔ (ایضاً، حصہ دوم، ص ۱۰۱)

حالتِ موجودہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی اس بات پر موقوف ہے کہ انگریزی سلطنت کو زیادہ استحکام ہو۔ (ایضاً، ص ۳۱۷)

سب سے زیادہ وفاداری اور لائلٹی کی مستحکم بنیاد، جو سرسید کی مذہبی تحریروں نے مسلمانوں میں قائم کی ہے، وہ انگریزی تعلیم کی مزاحمتوں کو دور کر کے ان کو عام طور پر اس کی طرف متوجہ کرنا اور خاص کر ان کی تعلیم کے لئے محمڈن کالج کا قائم کرنا ہے جس کی رُو سے نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر اعلیٰ تعلیم مسلمانوں میں زیادہ پھیلتی جائے گی، اسی قدر وہ تاج برطانیہ کے زیادہ وفادار اور گورنمنٹ کے زیادہ معتقد علیہ بنتے جائیں گے۔ (مقالات حالی، جلد اول، ص ۲۱۶)

اس (سرسید) نے ایک جماعتِ کثیر مسلمانوں میں ایسی پیدا کر دی ہے جو انگلش گورنمنٹ کی برکتوں کی دل سے قدر کرتی ہے، اس کو ہندوستان کے حق میں خدا کی مہربانی سمجھتی ہے اور اس بات کا یقین رکھتی ہے کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کا قدم نہ آتا تو مسلمانوں کو وہی روزِ سیاہ دیکھنا پڑتا جو اسپین کے مسلمانوں کو ان کی سلطنت کے زوال کے بعد دیکھنا پڑا تھا۔

وہ اپنی سلامتی، بلکہ اپنا وجود، ہندوستان میں محض انگریزی حکومت کی بدولت جانتے ہیں۔ ان کو اپنے اسلاف کی اقبال مندی کے خواب نظر آنے موقوف ہو گئے ہیں۔ وہ اپنی حالت اور حیثیت کو خوب سمجھ گئے ہیں۔ انہوں نے برٹش گورنمنٹ کی طاقت اور اقتدار کا بخوبی اندازہ کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ ہندوستان میں کوئی قوم انگریزوں کے سوا حکومت نہیں کر سکتی اور اس لئے وہ اپنی خیر اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ رعایا بن کر رہیں...... وہ اپنی قوم میں وفاداری، اخلاص اور اطاعت کا ہمیشہ کے لئے بیج بو گیا ہے۔ وہ ان کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا بارآور درخت لگا گیا ہے جس کا پھل انگلش نیشن کی محبت اور انگلش گورنمنٹ کی وفاداری اور فرماں برداری ہے۔ (کلیات نثر حالی، جلد دوم، ص ۵۷۔۵۸)

اگر "سر" نہ ہوتے تو کیا کیا نہ ہوتا!

مدح خوانوں کی تصوراتی بلند پروازیاں

ممتاز حسن

اگر سر سید نہ ہوتے تو پھر اقبال اور جناح بھی نہ ہوتے۔

(بحوالہ تہذیب الاخلاق لاہور، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۵)

محمود علی خاں

سر سید نہ ہوتے تو نہ علی گڑھ ہوتا...... نہ اقبال کے خواب کی تعبیر حقیقت بنتی اور نہ جناح کو پاکستان کے معمار اور افواج پاکستان کے قائد ملتے۔ یہ سر سید علیہ الرحمہ ہی کا طفیل ہے کہ پاکستان کے وجود کو قائم رکھنے کے لئے لیاقت (علی خاں) اور اسے استحکام بخشنے کے لئے (جنرل) ایوب جیسا فرزندِ قوم علی گڑھ سے مل گئے۔ (تذکرہ سر سید، ص "ز")

خورشید اسلام صدیقی

اگر یہ درویش نہ ہوتا تو ابوالکلام کی تفسیر وجود میں نہ آتی اور نہ خودی کا فلسفہ فارسی زبان میں نازل ہوتا۔ ابوالکلام اور اقبال کہاں ہوتے، کون جانتا ہے؟ البتہ اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہوتے تو یہ مصرع گنگناتے کہ:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

(کریسنٹ لاہور، شبلی نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۱)

آل احمد سرور

سرسید کی رہنمائی نہ ہوتی تو حالی کی عظیم الشان کوششیں بار آور نہ ہوسکتیں، علامہ شبلی مولوی ہی رہتے، نذیر احمد عربی کے ایک زبردست عالم کہلاتے، اردو میں ان کا یہ مرتبہ نہ ہوتا۔ وہ نئی نسل وجود میں نہ آتی جس نے اقبال کی شاعری، سجاد حیدر کی نثر، عبدالقادر کے مضامین اور ظفر علی خاں، محمد علی، طفیل احمد کی صحافت کے ذریعہ سے ایک نئی مشرقیت کا چراغ روشن کیا۔ (بحوالہ سرسید کی صحافت، ص ۲۱۱)

اگر سرسید کی تہذیبی تحریک نہ ہوتی تو شبلی مولوی شبلی ہی رہتے، مہدی افادی کے الفاظ میں تاریخ کے معلّمِ اول نہ بنتے، آزاد کی کوششوں کو فروغ نہ ہوتا، حالی کی معرکتہ الآراء مسدس نہ لکھی جاتی، "مقدمہ شعروشاعری" تصنیف نہ ہوتا، نذیر احمد کے تمثیلی قصے واقعیت اور مقصدیت کا آغاز نہ کرتے، نہ محمد علی ہوتے نہ اقبال، نہ ترقی پسند تحریک ہوتی نہ ادب عروسِ زندگی کا شانہ بنتا۔ (انتخاب آل احمد سرور، ص ۵۹-۶۰)

صفدر سلیمی

اگر سرسید کا یہ شاہکار (مدرسۃ العلوم) سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں کے نعرہ ہائے حریت سنائی دیتے، نہ اقبال کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائداعظم میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا تدبر برطانوی سامراج اور ہندو سامراج کے لئے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم مملکت کا نقطۂ آغاز۔ (پاکستان کا معمارِ اول، ص ۱۷)

تاریخ کے اٹل حقائق کی روشنی میں ذرا سنجیدگی سے سوچئے کہ اگر سرسید اعتدال کی اس راہ کو اختیار نہ کرتے تو ہمارا حشر کیا ہوتا۔ (ایضاً، ص ۱۱)

اگر سرسید کی یہ مصلحت کوشی اور دور بینی اس نازک وقت پر آڑے نہ آتی تو پھر سوچئے کہ آج اس ملک کا نقشہ کچھ اور ہوتا! (ایضاً، ص ۱۲)

اگر اُس وقت مذہب کے ان اجارہ داروں کی کوششیں کامیاب ہو جاتیں جو

سرسید کی مخالفت میں ہجوم کر کے لائی جا رہی تھیں تو آج ہندوستان (اور پاکستان) میں ہمارا یہ حشر ہوتا؟ (ایضاً ص ۸۶)

اگر ایک صدی قبل صبحِ امید کا یہ روشن ستارہ ہمارے آسمان تقدیر پر نمودار نہ ہوتا اور یہ بانگِ رحیل ہمیں آمادۂ سفر نہ کرتی تو متحدہ ہندوستان کی تاریخ میں ہماری موت کا مرثیہ لکھا جا چکا ہوتا اور اس برصغیر کے نئے خاکوں میں ہماری قومی حیثیت ایک قبرستان سے زیادہ نہ ہوتی۔ (ایضاً ص ۱۳۵)

اگر ہمارے آسمانِ تقدیر پر صبحِ امید کا یہ ستارہ جلوہ بار نہ ہوتا تو آج قوم بے بسی، زوال اور شکست کے جہنم میں دم توڑ چکی ہوتی۔ (ایضاً ص ۱۳۸)

غلام احمد پرویز

اگر سرسید مولانا حضرات کے فتووں کے سامنے سپر انداز نہ ہوتا تو آج نہ پاکستان دنیا کے نقشے پر موجود ہوتا، نہ کوئی اقبال اور جناح کا نام جانتا۔

(تہذیب کراچی، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص ۲۲)

اگر سرسید یہ کچھ نہ کر جاتا تو نہ محمد علی ہوتا نہ شوکت علی، نہ اقبال ہوتا نہ جناح، اور ہم آج ہندوستان میں شودروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔

(قائداعظم کا تصورِ پاکستان، ص ۱۹)

ریاض الرحمٰن شروانی

اس برصغیر میں تو مسلمان شودروں سے بدتر ہوتے، اگر سرسید نے ان کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی میں رہنمائی نہ کی ہوتی۔ سرسید کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جتنا بڑا کارنامہ پچھلے سوا سو، ڈیڑھ سو برسوں میں کسی اور کا نہیں۔

(کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۵)

صلاح الدین احمد

اگر سرسید قومی وحدت اور قومی ہستی کی وہ بنیاد استوار نہ کرتے جس پر تحریک علی گڑھ

کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی اور قومی احساس اور روشن خیالی کی وہ شمع روشن نہ کرتے جو...... انہوں نے روشن کی اور ہمیں مُلّا کے پنجے اور ذہنی استبداد سے نجات دلا کر زندگی کی صحیح اقدار روشناس نہ کراتے تو آج ظلمستانِ ہند میں ہم اُسی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرتے جس طرح نیم وحشی قبائل وسطی ہند کے جنگلوں میں اب بھی کھاتے پھرتے ہیں۔

(سرسید پر ایک نظر، ص ۳۰۔۳۱)

ڈاکٹر سید ارشاد علی

سرسید جیسا مصلح اور قائد اگر اس قوم کو نہ ملتا تو آج خدا جانے یہ کن راہوں میں بھٹکتی پھرتی! (مطالعہ سرسید احمد خاں، ص ۲۱۲)

پروفیسر علی احمد عباسی

اگر اللہ تعالیٰ نے اس وقت سرسید کو اس مجتہدانہ بصیرت سے سرفراز نہ فرمایا ہوتا تو نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں پر کیا گزرتی؟ (برگِ گل کراچی، سرسید نمبر ۶۹۔۱۹۶۸، ص ۹۶)

بشیر احمد ڈار

سرسید کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا حکومت سے سو فیصدی تعاون اور وفاداری کا اظہار تاکہ وہ دو دشمنوں کے پاٹ میں آ کر پس نہ جائیں۔ اگر وہ ایسا قدم نہ اٹھاتے تو اس ملک میں مسلمانوں کا وجود یقیناً خطرے میں پڑ جاتا۔

(ثقافت لاہور، اپریل ۱۹۵۶، ص ۵۸)

رشید احمد صدیقی

سرسید، علی گڑھ تحریک اور ان دونوں کے سب سے بڑے سربراہ لیفٹیننٹ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نہ ہوتے تو آج مسلمان کہیں کے نہ ہوتے۔ (عزیزانِ علی گڑھ، ص ۸۱)

غلام رسول مہر

سرسید نے مسلمانوں کے لئے یہی کیا۔ اگر وہ بروئے کار نہ لاتے اور سب کچھ

یہ کرتے جس کے لئے ان کی زندگی وقف رہی تو سوچو، آج مسلمانوں کا وجود بھی بحیثیت ملت و قوم محفوظ ہوتا؟ (بحوالہ تذکرہ سرسید، صفحہ "ض")

عبدالسلام خورشید

اگر سرسید مسلمانوں کو ان تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو آج پاکستان بنانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کیونکہ اس برعظیم میں مسلمانوں کا وجود نہ ہوتا۔ (سرسید احمد خاں از عبدالسلام خورشید، ص ۴۱)

محمد امین زبیری

اگر سرسید ابتدا میں ہی دو قومی نظریہ کو سامنے نہ لاتے اور ہندو قومیت میں جذب ہونے کو نہ روکتے تو آج سیاسی حیثیت میں مسلمانوں کا مقبرہ بن چکا ہوتا۔

(تذکرہ سرسید، ص ۲۳۱)

احمد ندیم قاسمی

اگر سرسید انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنی اصلاحی تحریک نہ چلاتے تو نہ صرف یہ کہ ان حضرات کا جدید تعلیم سے مسلح ہونا مشکوک تھا بلکہ ہم سب لوگوں کا، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، غیرت مندانہ وجود تک مشکوک تھا۔ (تہذیب و فن، ص ۱۳۷)

خلیل الرحمٰن داؤدی

اگر سرسید احمد خاں کی دور اندیشی نے علی گڑھ نہ بنایا ہوتا تو نہ معلوم آج کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا! نہ تو پاکستان بنتا اور نہ ہندوستان میں انہیں کوئی کام ملتا۔

(یادنامہ داؤدی، ص ۲۷)

ڈاکٹر خیال امروہوی

سرسید کی تحریک نہ ہوتی تو نہ مسلمان تعلیم حاصل کر سکتا، نہ پاکستان بنتا۔

(مضمون "غبار خاطر" مطبوعہ دن لاہور، ۲۰ راگست ۱۹۹۸ء)

سر آغا خاں

اگر علی گڑھ نہ ہوتا تو پاکستان قائم نہ ہو سکتا تھا۔ (بحوالہ تذکرہ سرسید، ص ۳۹۵)

ڈاکٹر شوکت سبزواری

اگر سرسید مذہبی اصلاح کا کام انجام نہ دیتے تو سائنس کی تیز روشنی میں باطل تصورات کے دیئے جھلملا کر ماند پڑ جاتے۔ یہ تصورات اسلام سے وابستہ سمجھے جاتے تھے اس لئے سائنس کے مقابلے میں یہ اسلام کی بہت بڑی شکست ہوتی۔

(برگ گل، سرسید نمبر ۶۹۔۱۹۶۸، ص ۲۹۸)

ڈاکٹر نذیر احمد

اگر سرسید نہ اٹھتے تو ہندوستان کے مسلمانوں کا وہی حال ہوتا جو سپین کے مسلمانوں کا ہوا تھا۔ (مطالعہ سرسید احمد خاں، ص ۳۲)

ڈاکٹر حسین فاروقی

اگر سرسید...... انگریزوں کے اس اشتعال کو، جو انقلاب ۵۷ء کے بعد ان میں پیدا ہو گیا تھا، وفا شعاری کے پانی سے نہ بجھا دیتے تو آج ہندوستان سے اسلام کا نام اسی طرح فنا ہو جاتا جس طرح سپین سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ (مسلم لیگ کیوں؟ ص ۱۵)

تاویل سازی اور خود ساختہ فلسفوں کی تخلیق

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی

سرسید کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے دوست تھے۔ انہوں نے آزادی کی جنگ کو سراہا نہیں بلکہ اس انقلاب کو ہندوستانیوں کی نادانی پر محمول کیا ہے، لیکن یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ سرسید انگریزوں کے دشمن تھے .... کہیں کہیں ان کے طرزِ عمل سے انگریز دوستی کی بُو آتی ہے اس لئے انہیں معاف تو نہیں کیا جا سکتا البتہ ذرا ہمدردانہ زاویہ نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اگر اس طرح دیکھا جائے تو سرسید کی تحریک بھی انقلاب اور جنگِ آزادی کا ایک حصہ نظر آئے گی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ہی اس تحریک کو پیدا کیا اور اس میں شک نہیں کہ یہ تحریک اس انقلاب کا ایک تسلسل ہے۔ (خیال لاہور، ۱۸۵۷ نمبر، ۱۹۵۷ء، ص ۲۵)

ڈاکٹر معین الحق

......اس میں شک نہیں کہ آج ہماری رائے میں سید احمد خاں کا یہ عقیدہ، اور اس بنا پر انہوں نے جو رویہ اختیار کیا، یقیناً غلط ہے لیکن بحیثیت ایک مؤرخ کے ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی، اس کے پیچھے کوئی ذاتی غرض یا مقصد نہ تھا ان کی وفاداری کا رویہ کسی غرض یا فائدہ کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ ان کی یہ ایمانداری کی رائے تھی، اگرچہ غلط تھی۔
(سرکشی ضلع بجنور، مرتبہ ڈاکٹر معین الحق، ص ۴۴)

عبدالسلام خورشید

انہوں نے اس جنگ میں حصہ نہ لیا، انگریزوں سے وفاداری کی بنا پر نہیں، اپنی قوم سے وفاداری کی بنا پر۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستانیوں میں حکمرانی کی اہلیت اس درجہ زوال پر پہنچ چکی ہے کہ وہ کوشش کے باوجود "جبر سے کام لے کر" اقتدار حاصل کرنے پر قادر نہیں۔ اب ان کی نجات کا ذریعہ صرف ایک ہے کہ نئی حکمران طاقت سے تعاون کر کے نظم ونسق میں زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کریں اور آزادی کے "مناسب وقت" کا انتظار کریں۔

(سرسید احمد خاں از عبدالسلام خورشید، ص ۱۷۔۱۸)

آل احمد سرور

سرسید مشرق اور مغرب کے ملاپ کی خاطر سرکار پرست بنے تھے۔ یہ ان کا نئی نسل پر بڑا احسان ہے۔ (مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، ص ٦)

فوق کریمی

سرسید انگریز قوم کے دوست تھے اور وہ کوچۂ رقیب میں سر کے بل اس لئے جاتے کہ ہندوستان میں کھوئی ہوئی آزادی کو پھر سے حاصل کر لیں۔

(اسباب بغاوت ہند، مرتبہ فوق کریمی مطبوعہ ۱۹۵۸ء، ص ۲۳)

ان کی یہ انتہا پسندی ہی ان کے ایمان اور کامیابی کی نشانی ہے۔ ہم ان کی زندگی میں آغاز سے لے کر انتہا تک انتہا پسندی کے جذبات پاتے ہیں اور اس انتہا پسندی میں ان کے یہاں ہر جگہ عشق کی چنگاری سلگتی نظر آتی ہے اور یہ چنگاری جہاں جہاں شعلہ بنی وہیں وہیں سرسید اپنے مقصد میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ یہ عشق ہی کی چنگاری تھی جس نے سیاست کا جامہ پہن کر ۱۸۵۷ء میں سرسید کو انگریزوں کی حمایت کے لئے مجبور کیا۔

(سرسید کے سیاسی افکار، ص ۱۵۱)

سرسید کی وفات ۱۸۹۸ء میں ہوئی ہے۔ ان کی وفات سے پچاس سال بعد ہی ملک آزاد ہو جاتا ہے تو یقیناً یہ خیال ذہن میں آتا ہے کہ کیا سرسید ان حالات کو نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ملک آزاد ہو کر رہے گا اور ان کو اس وقت انگریزوں کی ہمنوائی کے مقابلہ میں کانگرس کی حمایت

کرنی چاہیے تھی؟ اس بات کو سرسید بھی سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان آزاد ہوگا اور خود ہندوستانی ہی اپنے ملک کے حکمران بنیں گے جس کا اشارہ اور اظہار وہ اپنی تقریر میں کر چکے تھے لیکن وہ یہ چاہتے تھے کہ جب ہندوستان آزاد ہو تو اس کا نظم و نسق ہندوستانی سنبھالیں اور اس سے وہ علی گڑھ میں ایسے کرنیل اور جرنیل پیدا کرنا چاہتے تھے کہ جب آزادی کی جنگ لڑی جائے تو یہ اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر ہندوستان کو آزاد کرائیں گے۔ (ایضاً، ص ۲۵۶)

ابوسفیان اصلاحی

سرسید نے اپنی پوری زندگی اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے میں بسر کر دی۔ گو کہ ان سے بہت سی اجتہادی غلطیاں بھی واقع ہوئی ہیں، اور یہ غلطیاں ایسی ہیں کہ بظاہر ان سے اسلام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں لیکن سرسید کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسلام کے تئیں ان کے دل میں جو سچے جذبات تھے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ (فکر و نظر علی گڑھ، سرسید نمبر ۱۹۹۲، ص ۱۸۷)

الطاف حسین حالی

......اگرچہ سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں، بایں ہمہ اس تفسیر کو ہم ان کی مذہبی خدمات میں ایک جلیل القدر خدمت سمجھتے ہیں جس سے اسلام کی محبت اور ہمدردی کے علاوہ ان کی لٹریری (Literary) لیاقت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ظاہر ہوتا ہے۔ (حیاتِ جاوید، حصہ اول، ص ۲۳۲)

......درحقیقت یہ کفر و ارتداد کے فتوے نہیں ہیں بلکہ سرسید کے اعلیٰ درجہ کے مسلمان ہونے کے وثیقے ہیں۔ یہ تمغے "ہمیشہ" انہی لوگوں کو نصیب ہوئے ہیں جو دنیا کی مخالفت کے خوف سے کبھی حق بات کہنے سے نہیں چوکے۔ (ایضاً، حصہ دوم، ص ۲۹۲)

انسان کا منتہائے کمال یہ ہے کہ اس میں عیب کم اور خوبیاں زیادہ ہوں، نہ یہ کہ وہ عیبوں سے بالکل پاک ہو۔ پس سرسید میں باوجود بے شمار خوبیوں اور حیرت انگیز اوصاف کے اس قسم کی کمزوریوں کا پایا جانا، بجائے اس کے کہ ان کے اخلاقی نقص کی دلیل ہو، ان کے اعلیٰ درجہ کی اخلاقی فضیلت اور کاملیت پر دلالت کرتا ہے۔ (ایضاً، ص ۳۶۳)

قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

سرسید اپنی معلومات اور تحقیقات کے آگے دوسروں کی باتوں کو نہیں سنتے تھے یا اگر سنتے تھے تو تسلیم نہیں کرتے تھے ..... اس کو تعصب یا ہٹ دھری بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ اپنی ذات پر اعتماد اور اپنی رائے پر وثوق! اسے کہنا چاہیے کہ غالب کے ہم خیال تھے:

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

(سرسید کا علمی کارنامہ، ص ۶۶)

غلام احمد پرویز

وہ نیچری مشہور ہو گیا اور نیچر کی اہمیت سے بے خبر مُلّا نے اسے اس پر ملحد اور بے دین قرار دے دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں سرسید کے ذہن نے بعض مقامات پر غلطیاں کیں لیکن غلطیاں ہر پایونیر (سابق اوّل) سے ہوتی ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اگر سرسید علم فطرت کے اس دروازے کو مسلمانوں کے سامنے نہ کھولتا تو آج ہم کس مقام پر کھڑے ہوتے اور اقوامِ عالم میں ہمارا کیا حشر ہوتا؟ (قائداعظم کا تصورِ پاکستان، ص ۱۸)

رشید احمد صدیقی

سرسید ابتدا میں اردو کو وسیلۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھے لیکن جلد ہی اس ارادے کو ترک کر دیا اور ہندوستان کی دوسری تعلیم گاہوں کی طرح تعلیم اور دوسرے کاروبار کا وسیلہ انگریزی کو رکھا..... اس بارے میں ایک قانونی نکتہ یہ بھی تھا کہ مسلم یونیورسٹی کی حیثیت ایک کل ہند ادارے کی تھی۔ اس میں ایسے طلبہ کو بھی داخلے کا حق تھا جو ملک کے دور افتادہ حصوں کے باشندے تھے اور ان کی زبان اردو نہ تھی لیکن وہ انگریزی سے بخوبی واقف تھے۔ اس بنا پر اردو کو ''اردو بردار'' رکھنے میں نہ صرف حکومت کی طرف سے اعتراض کا اندیشہ تھا بلکہ خود مسلمانوں کو بھی کچھ کم نقصان نہ پہنچتا..... سرسید کی بے مثل دور اندیشی، دانشمندی اور حقیقت پسندی کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ انہوں نے اردو کے بارے میں رائے بدل دی اور علی گڑھ کو اردو ادارہ رکھنے کی بجائے اعلیٰ تعلیم کا معیاری ادارہ رکھنے پر زور دیا۔

(خطبات رشید احمد صدیقی: ص ۳۶۳-۳۶۴)

شخصیت پرستی اور نثری قصیدہ گوئی

لفاظی کے زور پر تاریخ سازی کا عمل

صفدر سلیمی

......عین اس وقت جب کہ پردۂ افلاک سے ہماری زندگی کا یہ سب سے اندوہناک حادثہ برپا ہوا چاہتا تھا، قومی زندگی کے ایک نامعلوم اور غیر معروف گوشے سے سرسید علیہ الرحمۃ ایسا گراں مایہ زعیم صبحِ امید کا ستارہ بن کر نمودار ہوا اور اس نازک اور کڑے مرحلہ پر ملتِ بےچارگاں کا قافلہ سالار بن کر عرصۂ کارزار میں مردانہ وار کود پڑا۔ یہ جرأت رندانہ کس قدر صبر آزما ثابت ہوئی، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جہاں سرسید کو سیلاب بلا کی بپھری ہوئی موجوں سے نبرد آزما ہونا پڑا وہاں اپنی ہی اس کشتی کے مسافر دشمنِ جان بن کر مقابلے میں آ گئے جسے بچانے کے لئے اس نے جان کی بازی لگائی تھی ...... اس کا جذبۂ صادقہ، اس کا عزم و استقلال، اس کا خلوص و ایثار اور جوشِ کردار جذب و مستی کے والہانہ کیف میں تمام موانعات کو زیر و زبر کرتے چلے گئے۔ مخالفت کی تند و تیز آندھیاں اس کے عزمِ صمیم کو غبار آلودہ نہ کر سکیں، بغض و عناد کے شعلے اس کے جذب و مستی کی مسکراہٹیں نہ چھین سکے، حوادث کی بجلیاں اس کے ولولوں کو شکست نہ دے سکیں، مصائب و آلام کی تاریکیوں میں اس کے خلوص و ایثار کی آب و تاب ماند نہیں پڑی...... (پاکستان کا معمارِ اول، ص ۴-۵)

رسم و منزل نے الہامِ ایزدی سے سمجھ لیا تھا کہ پرانے ہتھیار نئے اسلحۂ آتش بار کے مقابلے میں بے کار ہیں:

نہیں چلتی توپوں میں تلوار ان کی

تو تھوائے آیۂ کریمہ اعدو لھم ما استطعتم اسلوب جدید وطرز نوی کی بنیاد ڈالی۔

(آخری مضامین، ص ۷۔۸)

ڈاکٹر قدسیہ خاتون

سرسید جب تعلیم تعلیم اور ترقی ترقی کی پکار لگاتے تو وہ ہنگامہ بپا ہوتا کہ الامان! ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جاتی مگر اس طوطی کی آواز میں وہ زور تھا کہ سارے شور وشر ماند پڑ جاتے۔ (سرسید کی ادبی خدمات، ص ۳۲۸)

عبدالغفور چوہدری

سرسید کی شخصیت ہمالیہ کی ان سر بہ فلک چوٹیوں کی سی ہے جن تک کوئی نہ پہنچ پایا۔ کوشش کی تو راستے کے گلیشروں اور بہتی ہوئی برف کے نیچے دب کر رہ گیا۔ اگر کبھی بادل اور کہر کے پردے اٹھ بھی گئے تو دھوپ میں سے برف کی ڈھپی ہوئی چوٹی اس شان سے جگمگاتی کہ اس پر آنکھ ٹھہر نہ پاتی تھی۔ (تاریخ تحریک پاکستان، ص ۱۳۲)

صلاح الدین احمد

سید احمد خاں ...... جسے قضا و قدر کے دربار سے اس منصب عالی پر فائز کر دیا گیا تھا جو خداوند جل و علیٰ کے محض چند منتخب اور برگزیدہ بندوں کے لئے ازل سے مخصوص ہے۔ یہ منصب رشد و ہدایت اور ایثار و خدمت کا وہ منصب جلیل تھا جو عالمِ انسانیت کے عظیم راہبروں میں سے بہت کم اکابر کو ارزانی ہوتا ہے۔ سرسید احمد خاں مرحوم انہی اکابر میں سے ایک فرد عظیم تھے اور اس میں کس کو کلام ہے کہ جس لمحے انہیں یہ سعادت عظمیٰ نصیب ہوئی، اسی لمحے ان کی قوم کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھا اور اس کی ضوفشانیوں سے محض اس کی زندگی ہی میں اس بر عظیم کا گوشہ گوشہ مستفید ہو گیا۔ (سرسید پر ایک نظر، ص ۳۔۵)

پہلی اینٹ کا قضیہ

جتنے منہ اُتنی باتیں

غلام احمد پرویز

سرسید ہی درحقیقت پاکستان کا معمارِ اوّل ہے جس نے اس مملکت کی ''پہلی اینٹ'' اس دن رکھی جب اس نے علی گڑھ مدرسہ کا افتتاح کیا تھا۔ (قائداعظم کا تصورِ پاکستان، ص ۱۹)

۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس مدرسے کی بنیاد رکھی گئی جسے میں پاکستان کی بنیاد میں ''پہلی اینٹ'' قرار دیتا ہوں۔ (تہذیب کراچی، نومبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۷)

مولوی عبدالحق

قصرِ پاکستان کی بنیاد میں ''پہلی اینٹ'' اسی پیرِ مرد (سرسید) کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور وہ اینٹ اردو زبان تھی۔ (سرسید احمد خاں، حالات و افکار، ص ۱۳۹)

قصرِ پاکستان کی تعمیر میں ''پہلی اینٹ'' جس نے رکھی، وہ اردو زبان ہے۔ (خطباتِ عبدالحق، ص ۳۱۸، ۳۳۹، ۵۲۱)

رئیس احمد جعفری

دو قومی نظریے کے اصل خالق سر سید احمد خاں تھے۔ انہوں نے بار بار اپنی تقریروں اور بیانات میں اعلان کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ اپنی انفرادیت چاہتے ہیں۔

دراصل پاکستان کی ''خشتِ اوّل'' یہی تھی۔ (خطبات قائداعظم، ص ۵۶۷)

بیسویں صدی کے آغاز میں نواب محسن الملک کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد شملہ پہنچا اور وائسرائے ہند کے سامنے اس نے ایک مفصل عرض داشت پیش کی ...... یہ غدر کے بعد مسلمانوں کی ''پہلی آواز'' تھی جو ایک قوم کی حیثیت سے بلند ہوئی تھی اور اس میں صاف صاف قومی انفرادیت پر زور دیا گیا تھا۔ (حیات محمد علی جناح، ص ۵۳۸۔۵۳۹)

شریف الدین پیرزادہ

علی گڑھ کے زعما، خصوصاً نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک وغیرہ، نے پاکستان کے قیام کے لئے ''خشتِ اوّل'' کی بنیاد قائم کی۔

(بحوالہ تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان، ص ۱۳۰)

ڈاکٹر ایس ایم اکرام کوثر

۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے اردو و فارسی رسم الخط کی جگہ ہندی دیوناگری رسم الخط کو جاری کرنے کا مطالبہ کر کے ہندوستانی قوم میں پھوٹ ڈال دی......اس لسانی تنازعہ نے نہ صرف فرقہ وارانہ منافرت و تفریق کو ہوا دی بلکہ ہندوستان کی سیاسی سطح پر تفریق کا ''پہلا پتھر'' نصب کر دیا۔ (اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقا کا حصہ، ص ۷۵)

مشیر مخدومی فیروز پوری

سرسید ہی تھا جس نے سب سے پہلے مسلمان کی انفرادیت کو ہندو کی دستبرد سے بچانے کے لئے ۱۸۸۳ء میں گورنر جنرل کی کونسل میں سی۔ پی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر بحث کرتے ہوئے اس اصولِ انتخاب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی تنظیم کی بنیاد رکھی تاکہ کسی وقت مسلمان ہندو میں جذب ہو کے نہ رہ جائے...... یہ ''پہلی آواز'' تھی جو ۱۸۸۳ء میں سرسید نے اپنی قوم کو جداگانہ سیاسی تنظیم کے لئے اور اس کے حقِ انفرادیت کے شیشہ کو ہندو کی متحدہ قومیت کے پتھر کی ضرب سے بچانے کے لئے اٹھائی۔

(پاکستان کی طرف، ص ۵۷۔۵۸)

بے مثل، لاثانی اور یکتا سرسید

نہ اُن سے پہلے اور نہ کوئی بعد میں

سید طارق حسین زیدی

سرسید جس قدر سچا اور بے تکلف ہے، شاید دوسرا کوئی بھی ایسا نہیں۔

(سرسید شناسی ص ۳۳۴)

صفدر سلیمی

سرسید سے قبل اور ان کے بعد ایک رہنما ایسا نظر نہیں آتا جو عظمت رفتہ کی باز آفرینیوں میں سرسید کی طرح زندگی کے ہر گوشے میں وقفِ پیکار دکھائی دے۔

(پاکستان کا معمار اول ص ۹۲)

پروفیسر رشید احمد صدیقی

ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں، نہ اس کے بعد سرسید جیسا ہمہ صفت موصوف لیڈر اب تک مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا ...... (سرسید شناسی ص ۱۷)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

سرسید احمد خاں ...... مسلمانان پاک و ہند کے ہمدرد ترین روشن خیال سماجی اور سیاسی رہبر تھے جن کا مثیل آج تک پیدا نہ ہوسکا۔ (سرسید احمد خاں اور جدت پسندی، ص ۲۵)

دنیا بھر کے سماجی سائنس دان تسلیم کرتے ہیں کہ انیسویں صدی میں سرسید احمد خاں سے زیادہ لائق اور فائق مسلم رہنما موجود ہی نہ تھا۔ (ایضاً، ص ۲۹)

شیخ محمد اکرام

ہمیں اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں سرسید سے بہتر دل و دماغ والا عملی رہنما (ابھی تک) پیدا نہیں ہوا۔ (موج کوثر طبع اول، ص ۶۸)

چودھری خلیق الزماں

اگر بصیرت، ذور ذہنی اور فراست، سیاست کے سب سے بڑے قیمتی لعل و گہر ٹھہریں تو سرسید احمد خاں ہندوستان میں ان کے سب سے بڑے حق دار ہیں۔

(سرسید علیہ الرحمۃ، ص ۷۳)

ڈاکٹر عبدالقیوم

...... یہ سرسید ہی کی ذات کی برکت ہے کہ مسلمان اس تباہی و بربادی سے جانبر ہو سکے...... سرسید نے ایک ایسا عظیم الشان کام انجام دیا جس کی مثال مسلمانوں کی صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ (نگار کراچی، سرسید نمبر ۱۹۷۱ء، ص ۲۷۵)

عبدالرحمٰن صدیقی

اسلام کے خادم...... کئی ملکوں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ عالم اسلام ان کا شکر گزار ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان بزرگوں کی کوششیں وقتی اور محدود رہ گئیں۔ ان میں اگر کوئی کامیاب رہا تو سید احمد خاں ہی رہے۔

(تذکرہ سرسید، ص ۳۲۲)

بدحواسیاں رلطیفے

......بہت دُور کی سوجھ......

ڈاکٹر حسن رضوی

<u>بنیاد پہلے، خواب بعد میں</u>

... وہ خواب جس کو اقبال نے دیکھا اور جس کی بنیاد سرسید احمد خاں نے رکھی اور قائد اعظم نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

(جنگ، لاہور، ۱۶ مئی ۲۰۰۰ء۔ اشاعت خاص قومی سمینار، کالم اوّل)

ڈاکٹر سید محبوب شاہ

<u>تلقین بعد میں، مایوسی تیس سال قبل ہی</u>

ایک مرتبہ (۱۸۹۷ء میں... ناقل) انہوں (سرسید) نے اس سلسلہ میں یہ اظہار خیال کیا کہ "اگر گائے کی قربانی ترک کرنے سے آپس میں ہندو مسلمانوں کی دوستی اور محبت قائم ہو تو گائے کی قربانی نہ کرنا اس کے کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے، مگر جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے بڑے پیمانے پر اردو دشمنی شروع کر دی تو سرسید ہمت ہار گئے۔

(سرسید احمد خاں اور ان کے ناقدین ص ۳۳۵)

پروفیسر جعفر رضا

دو متضاد حکمت عملیوں پر یکساں عمل درآمد:

سرسید انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے حق میں تھے لیکن اُسی شدت سے مادری زبان میں تعلیم دینے کے حق میں بھی تھے۔ (مقالاتِ قومی سرسید سمینار، ص ۲۸)

چراغ حسن حسرت

ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب (مطبوعہ ۱۸۷۱ء) کے جواب میں "اسبابِ بغاوتِ ہند" (مطبوعہ ۱۸۵۹ء)

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنا مشہور رسالہ "انڈین مسلمانز" لکھا۔۔۔ سرسید احمد خاں نے اس کے رد میں "اسبابِ بغاوتِ ہند" کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔

(بحوالہ ملّیہ فیصل آباد، ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۹)

یعقوب ہاشمی

پاکستان کے قیام کا "دھبہ"

۱۹۴۱ء میں سر آغا خاں نے اپنی یادداشتوں (My Memoirs) میں لکھا ہے کہ اگر علی گڑھ یونیورسٹی نہ بنتی تو پاکستان نہ بنتا۔ یہ پڑھ کر ہندو اور سکھ مشتعل ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم یونیورسٹی کو بند کرا دیں گے۔۔۔ مسلم یونیورسٹی کے دامن پر ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان کے قیام کا جو "دھبہ" لگایا تھا، بڑی مشکل سے ہم نے یہ "دھبہ" دھویا۔

(تہذیب الاخلاق لاہور، ۷ نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۴۰۔۴۱)

مدّاحوں کی اپنی ہی تحریروں میں تضاد

مارُوں گھٹنا پھوٹے آنکھ

جمیل یوسف

سید محمود کے کردار پر کیچڑ اچھالا گیا، یورپین دوستوں کے ساتھ ان کی شراب نوشی کے قصے مشہور کیے گئے۔ (سرسید احمد خاں شخصیت اور فن، ص ۱۳۶)

کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے سید محمود بیمار پڑے۔ (ایضاً ص ۱۳۹)

الطاف حسین حالی

فریضۂ حج، جو باوجود استطاعت اور قُربِ مسافت، ان (سرسید) سے ادا نہ ہو سکا...... (مقالاتِ حالی، حصہ اوّل، ص ۵)

حج اور زکوٰۃ کی ان میں کبھی استطاعت نہیں ہوئی۔

(حیاتِ جاوید، حصہ دوم، ص ۲۵۳)

من گھڑت داستانیں
ان قارئین کے لئے جن کا مطالعۂ سرسید محض نصابی ہے

سید عابد علی عابد

سرسید کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ وہ خدانخواستہ انگریزوں کے حامی تھے۔ (نگار کراچی، سرسید نمبر ۱۹۷۱ء، ص ۳۱۳)

ڈاکٹر سید محبوب شاہ

سرسید پر یہ الزام کہ وہ انگریز اور انگریزی علوم و تہذیب سے مرعوب تھے، درست نہیں ہے۔ (سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ، ص ۳۳۱)

احمد ندیم قاسمی

کیا سرسید کے نوزائدہ مخالفین یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سرسید انگریزی اقتدار میں بہت خوش تھے اور وہ ملکہ وکٹوریا کی غلامی کو اہل وطن کے لئے واقعی باعثِ برکت سمجھتے تھے؟ (تہذیب و فن، ص ۱۳۹)

ڈاکٹر عارف الاسلام

سرسید کا پہلا سیاسی کارنامہ ان کی شہرہ آفاق تصنیف ''اسباب بغاوتِ ہند'' ہے۔۔۔۔۔

برطانیہ کی پارلیمنٹ میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ سرسید کو سخت سزا دی جائے۔

(مقالات قومی۔ سید یمین، ص ۶۸)

مولوی عبدالحق

''اسباب بغاوت ہند'' جیسی کتاب ...... پر تمام انگریز حکام بے حد برہم ہوئے اور انہیں باغی اور قابل دار سمجھا گیا۔ (سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار، ص ۲۰)

پروفیسر محمد اسلم

سرسید نے اسباب بغاوت ہند کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اسے برطانوی دارالعوام کے ایک ایک رکن تک پہنچایا۔ اس میں سرسید نے لکھا تھا کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اس جنگ میں انگریزوں کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا مسلمانوں کا۔ اس پر لارڈ لٹن نے بیان دیا تھا کہ سرسید کو پھانسی دے دی جائے۔

(تہذیب الاخلاق، لاہور۔ نومبر ۱۹۹۲ء، ص ۴۱)

رفیع اللہ شہاب

اس کتاب کے لکھنے پر انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن چونکہ یہ کتاب حقائق پر مبنی تھی اس لئے انگلستان کے بعض انسان دوست انگریزوں نے کوشش کر کے ان کی سزا معاف کرا دی۔ (تفسیر القرآن سرسید مطبوعہ ۱۹۹۴ء، تعارف حصہ اول)

سعید صدیقی

سرسید احمد خاں نے ۱۸۶۷ء میں بنارس کے مقام پر کمشنر شیکسپیئر کی موجودگی میں دو ٹوک لفظ میں کہہ دیا تھا کہ ہندوؤں کے متعصبانہ رویے اور تنگ نظری کا یہی عالم رہا تو ہندوستان مذہب کی بنیاد پر ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی صورت میں تقسیم ہو کر رہے گا۔

(تہذیب کراچی، اگست ۲۰۰۶ء، ص ۷)

قوم کے بطل جلیل سرسید احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں بنارس کے مقام پر واشگاف

من گھڑت داستانیں

ان قارئین کے لئے جن کا مطالعۂ سرسید محض نصابی ہے

سید عابد علی عابد

سرسید کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ وہ خدانخواستہ انگریزوں کے حامی تھے۔ (نگار کراچی، سرسید نمبر ۱۹۷۱ء، ص ۳۱۳)

ڈاکٹر سید محبوب شاہ

سرسید پر یہ الزام کہ وہ انگریز اور انگریزی علوم و تہذیب سے مرعوب تھے، درست نہیں ہے۔ (سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۳۱)

احمد ندیم قاسمی

کیا سرسید کے نوزائدہ مخالفین یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سرسید انگریزی اقتدار میں بہت خوش تھے اور وہ ملکہ وکٹوریا کی غلامی کو اہلِ وطن کے لئے واقعی باعثِ برکت سمجھتے تھے؟ (تہذیب و فن، ص ۱۳۹)

ڈاکٹر عارف الاسلام

سرسید کا پہلا سیاسی کارنامہ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''اسباب بغاوتِ ہند'' ہے۔

برطانیہ کی پارلیمنٹ میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ سرسید کو سخت سزا دی جائے۔

(مقالات قومی سرسید سیمینار، ص۹۸)

مولوی عبدالحق

''اسباب بغاوت ہند'' جیسی کتاب پر تمام انگریز حکام بے حد برہم ہوئے اور انہیں باغی اور قابل دار سمجھا گیا۔ (سرسید احمد خاں۔ حالات وافکار، ص۴۰)

پروفیسر محمد اسلم

سرسید نے اسباب بغاوت ہند کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور اسے برطانوی دارالعوام کے ایک ایک رکن تک پہنچایا۔ اس میں سرسید نے لکھا تھا کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اس جنگ میں انگریزوں کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا مسلمانوں کا۔ اس پر لارڈ لٹن نے بیان دیا تھا کہ سرسید کو پھانسی دے دی جائے۔

(تہذیب الاخلاق، لاہور۔ نومبر ۱۹۹۲ء، ص۳۱)

رفیع اللہ شہاب

اس کتاب کے لکھنے پر انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی، لیکن چونکہ یہ کتاب حقائق پر مبنی تھی اس لئے انگلستان کے بعض انسان دوست انگریزوں نے کوشش کر کے ان کی سزا معاف کرادی۔ (تفسیر القرآن سرسید مطبوعہ ۱۹۹۴ء، تعارف حصہ اول)

سعید صدیقی

سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۶ء میں بنارس کے مقام پر کمشنر شیکسپیئر کی موجودگی میں دو ٹوک لفظ میں کہہ دیا تھا کہ ہندوؤں کے متعصبانہ رویے اور تنگ نظری کا یہی عالم رہا تو ہندوستان مذہب کی بنیاد پر ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی صورت میں تقسیم ہو کر رہے گا۔

(تہذیب کراچی، اگست ۲۰۰۶ء، ص۷)

قوم کے جلیل جلیل سرسید احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں بنارس کے مقام پر وا شگاف

الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ہندوؤں کی تنگ نظری اور تعصب کا یہی حال رہا تو ایک دن برصغیر ہندو اور مسلم ریاستوں میں بٹ جائے گا۔ (تہذیب کراچی، اگست ۱۹۹۹ء، ص ۲۱)

پروفیسر انوار الحق انصاری

۱۳ را گست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے سرسید احمد خاں کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''دو قومی نظریے کے بانی سرسید احمد خاں تھے''۔

(تہذیب کراچی، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۲۰۳)

ڈاکٹر رفیق زکریا

برصغیر کی تقسیم کی موافقت میں مسٹر جناح نے جو بھی دلائل پیش کئے، وہ نہ صرف یہ کہ من وعن وہی تھے جو سرسید نے کانگرس کی مخالفت کرتے ہوئے پیش کئے تھے بلکہ آخر الذکر کی تقاریر سے نقل کئے گئے تھے، حتیٰ کہ مسٹر جناح نے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ بھی اکثر وہی تھے جنہیں سرسید نے اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کیا تھا۔

(ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج ص ۱۱)

سید سبط حسن

مولانا حالی نے ''حیات جاوید'' میں سرسید کے تعلق سے لکھا ہے کہ جب راجہ رام موہن رائے انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم کا مطالبہ کررہے تھے تو عین اسی وقت مسلمان علما اور زعمانے آٹھ ہزار دستخطوں سے گورنر جنرل کو درخواست گزاری تھی کہ ہمیں نئی کافرانہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمیں وہی قدیم فارسی اور عربی کی تعلیم کافی ہے۔

(گفتگو، ص ۵۷)

قمرالدین خاں

اب موجودہ دور میں ہر وہ بات جو سرسید نے لکھی ہے، مقبولیت عام حاصل کر چکی ہے۔ (برگ گل، سرسید نمبر ۶۹-۱۹۶۸ء، ص ۲۲۸)

راجہ انور

سرسید فکری لحاظ سے شاہ عبد العزیز، سید احمد اور اسماعیل شہید کے پیروکار تھے۔

(روزنامہ اوصاف اسلام آباد، ۲۳ جون ۲۰۰۰ء)

عشرت رحمانی

سرسید کی تعلیم ...... حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے دینی و علمی دار العلوم میں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے زیر اثر ہوئی جہاں انہوں نے علوم متداولہ کی تکمیل کر کے سندِ فضیلت حاصل کی۔ (امروز لاہور ہفت روزہ اشاعت ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء، ص ۱۴)

سرسید کو ایک طبقہ نے عمر بھر کافر اور انگریز کا جاسوس اور غدار کہا لیکن بعد میں وہی لوگ ان کو "علیہ الرحمۃ" کہنے لگے۔ (ہماری آزادی کی کہانی، ص ۳۸)

وہ کئی بار انگلستان گئے۔ (ایضاً، ص ۳۸)

صفدر سلیمی

سرسید نے ...... ہر ایک کو اپنی فکری تقلید سے "بشدت" روکا۔

(پاکستان کا معمارِ اول، ص ۱۹)

...... چند سال ادھر کا ذکر ہے کہ پاکستان کے ایک مولانا، جو اقامتِ دین کے بڑے مدعی ہیں، سرسید کے خلاف بڑے جوش و خروش سے حملہ آور ہو رہے تھے۔ اس پر ایک ستم ظریف اور سن چلے نے ان سے پوچھا کہ "حضرت! ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک بات بتائیے اور وہ یہ کہ اگر سرسید یہ کچھ نہ کرتا تو آپ کے والد ماجد مسلمان ہوتے؟" جواباً مولانا خاموش تھے۔ مولانا کو خاموش پا کر اس نے کہا کہ "قبلہ! یقین فرمائیے، اگر اس دور میں سرسید نہ ہوتے تو دیگر نوجوانوں کی طرح آپ کے والد محترم بھی اغیار کے ہو چکے ہوتے، اور آپ آج "حضرت مولانا" کے بجائے "مسٹر جیمز یا لالہ گردھاری لال" ہوتے اور اقامتِ دین کے مدعی ہونے کے بجائے عیسائیت یا شدھی کے علمبردار! (ایضاً، ص ۸۷-۸۸)

نسیم احمد

اس ادارے (مسلم یونیورسٹی) کے بانی سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے حضرت علیؓ کی نسبت سے اس شہر کو اس لئے پسند فرمایا کہ اس شہر کا نام حضرت علیؓ سے وابستہ ہے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اس ادارے سے ایسے طلبا پیدا ہوں جو حضرت علیؓ کے نام کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا سکیں۔ (کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵، ص ۱۹)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

مولانا جمال الدین افغانی فری میسن لاج کے ممبر تھے۔

(سرسید احمد خاں اور جدت پسندی، ص ۱۲۸)

پروفیسر شان محمد

سرسید کی دُور اندیشی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگلش حکومت کا خیر مقدم کیا کیونکہ ان حالات میں ان سے بہتر کوئی حاکم نہیں ہو سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ انگریز زیادہ عرصہ تک اس ملک میں حکومت نہ کر سکیں گے۔

(مقالات قومی سرسید سیمینار، ص ۵۹)

ہمارا تمہارا کچا چٹھا

سرسید کے نام غالب کا حالیہ مکتوب

انتخاب از پیروڈی: امجد علی شاکر

مولوی سرسید احمد خاں، کہو کیسے ہو!......

......ان دنوں تمہارے ایک محقق کا بہت شہرہ سنا ہے۔ نام ضیاء الدین ہے اور لاہوری نسبت رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین نیر یاد آتے ہیں، ان سے ملاقات کو ایک مدت گزر گئی۔ ضیاء الدین لاہوری سے ملاقات ہوئی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس مردِ خوش خصال نے تمہاری ایک ایک کتاب ہی نہیں، ایک ایک ورق سنبھال رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاک و ہند کے کسی اور کتب خانے کا تو کیا ذکر، خود تمہارے بنائے ہوئے دارالعلوم میں بھی یہ کتابیں یوں یکجا نہ مل سکیں گی۔ تمہاری ایک ایک کتاب کی متعدد اشاعتیں ان کے ہاں محفوظ ہیں۔ تمہارے رسائل میں شائع شدہ مضامین کی نقول، تمہارے بارے میں طبع ہونے والی کتب اور رسائل، تمہارے مخالفوں کے شور و شر کا ذخیرہ، تمہارے مداحوں کی مداحی کیا، بھبتی تک لفظاً لفظاً محفوظ۔ تمہاری کتب کی پہلی اشاعتیں بہم پہنچانا کیا جان جوکھوں کا کام تھا، سو یہ عزیز یہ خدمت بجالایا۔ تمہاری ہر کتاب کی پہلی اشاعت کے سرِ ورق کی نقل خصوصیت سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اب تمہارے بارے میں ایک کتاب نامہ مرتب کر رہا ہے۔ اس کتاب میں یہ نقول عام کی جائیں

نسیم احمد

اس ادارے (مسلم یونیورسٹی) کے بانی سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے حضرت علیؓ کی نسبت سے اس شہر کو اس لئے پسند فرمایا کہ اس شہر کا نام حضرت علیؓ سے وابستہ ہے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اس ادارے سے ایسے طلبا پیدا ہوں جو حضرت علیؓ کے نام کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا سکیں۔ (کانفرنس گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۰۵، ص ۱۹)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

مولانا جمال الدین افغانی فری میسن لاج کے ممبر تھے۔

(سرسید احمد خاں اور جدت پسندی، ص ۱۲۸)

پروفیسر شان محمد

سرسید کی دور اندیشی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد انگلش حکومت کا خیر مقدم کیا کیونکہ ان حالات میں ان سے بہتر کوئی حاکم نہیں ہو سکتا تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ انگریز زیادہ عرصہ تک اس ملک میں حکومت نہ کر سکیں گے۔

(مقالات قومی سرسید سیمینار، ص ۵۹)

ہمارا تمہارا کچا چٹھا

سرسید کے نام غالب کا حالیہ مکتوب

انتخاب از پیروڈی: امجد علی شاکر

مولوی سرسید احمد خاں، کہو کیسے ہو!......

......ان دنوں تمہارے ایک محقق کا بہت شہرہ سنا ہے۔ نام ضیاء الدین ہے اور لاہوری نسبت رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین نیر یاد آتے ہیں، ان سے ملاقات کو ایک مدت گزر گئی۔ ضیاء الدین لاہوری سے ملاقات ہوئی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس مردِ خوش خصال نے تمہاری ایک ایک کتاب ہی نہیں، ایک ایک ورق سنبھال رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاک و ہند کے کسی اور کتب خانے کا تو کیا ذکر، خود تمہارے بنائے ہوئے دارالعلوم میں بھی یہ کتابیں یوں یکجا نہ مل سکیں گی۔ تمہاری ایک ایک کتاب کی متعدد اشاعتیں ان کے ہاں محفوظ ہیں۔ تمہارے رسائل میں شائع شدہ مضامین کی نقول، تمہارے بارے میں طبع ہونے والی کتب اور رسائل، تمہارے مخالفوں کے شور و شر کا ذخیرہ، تمہارے مداحوں کی مداحی کیا، بھٹی تک لفظ لفظ محفوظ۔ تمہاری کتب کی پہلی اشاعتیں بہم پہنچانا کیا جان جوکھوں کا کام تھا، سو یہ عزیز یہ خدمت بجالایا۔ تمہاری ہر کتاب کی پہلی اشاعت کے سرِ ورق کی نقل خصوصیت سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اب تمہارے بارے میں ایک کتاب نامہ مرتب کر رہا ہے۔ اس کتاب میں یہ نقول عام کی جائیں

گی۔ جو چاہے گا سو دیکھے گا کہ تمہاری کتب کے سر ورق کتنے بھدے۔ رانا ڑی ہاتھوں کے بنائے ہوئے تھے۔ ان دنوں کتابیں چھپتی ہیں تو مصوّر کے موئے قلم سے بنے سر ورق کتاب کی زینت ہوتے ہیں۔ ایسے سر ورق دیکھنے والی آنکھیں تمہاری کتابوں کے سر ورق دیکھیں گی تو تم پر نفرین بھیجیں گی۔

ضیاء الدین لاہوری عجیب مرد با کمال اور خوش خصال ہے۔ خاطر تواضع میں یوں دل کھول کر خرچ کرتا ہے کہ اس کی کشادہ دستی پر رشک آیا ہے۔ یہ نوجوان خندہ جبینی سے ملا اور کشادہ دلی سے تواضع کرتا رہا۔ اس کی کتب کا کمرہ دیکھا تو خستہ و درماندہ۔ جسے میں اس کی کشادہ دستی کا کرشمہ خیال کر رہا تھا، دراصل وہ اس کی کشادہ دلی کا نتیجہ ہے۔ تمہارے بارے میں اس کی کشادہ دلی دیکھ کر میں تو حیرت زدہ ہو رہا۔ اس کی باتیں سنا کیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ تمہارے بارے میں ہر بات جانتے ہیں، مگر اس کے سامنے تو سوائے خاموشی کے چارہ نہ رہا۔ اسے تمہاری ہر بات یاد کیا، نوک زبان تھی۔ ایسا عاشق کسی کو کب ملا ہوگا! ہاں، لیلیٰ کو مجنوں، شیریں کو فرہاد اور عذرا کو وامق ملا ہو تو الگ بات ہے۔ سنا ہے، یہاں پنجاب میں بھی ہیر رانجھے وغیرہ کے قصہ ہائے عشق خاصے معروف ہیں۔ ہوں گے، ہمیں تو ایران توران ہی یاد آتے ہیں۔ پنجاب سے ہمیں ایک مدت ہر بات پر ٹکا سا جواب ملتا رہا۔ سنا ہے کہ انیس ناگی نامی ایک باغی نوجوان نے ہماری درخواستوں اور ان پر صادر ہونے والے احکام، اہلکاروں کی آراء اور تمام کارروائیاں دفتر و دیوان سے نکال کر کتاب میں چھاپ دی ہیں۔ اس کا مذاق ٹھہرا، ہماری آبرو گئی۔ یوں تو ہمارے عہد میں بھی باغی نوجوان ہوتے تھے۔ ویسے ہم خود کچھ کم نہ تھے۔ لوگ ہمیں باغی نوجوان ہی کہتے تھے، مگر ہم یوں کسی کی آبرو کو نہیں آتے تھے۔ اگلے وقتوں کے اچھے لوگوں کی مدح میں بخل نہ کرتے تھے اور جو بے ونقہ کو اندوہ ربا کہتے تھے، انہیں کچھ نہ کہنے کو اپنا طریق ٹھہرایا تھا، مگر یہ انیس ناگی تو ہماری جان کو لاگو ہو گیا ہے۔ کیا کریں، دنیا میں تو ایسی حالت میں ہم یہ کہہ کر چپ ہو جاتے تھے:

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

جنت میں یہ بھی نہیں ہو پاتا۔

قصہ ضیاء الدین لاہوری کا ہو رہا تھا۔ اس نے تمہارے بارے میں سات کتابیں لکھ رکھی ہیں۔ ان میں ہر بات باحوالہ ہے، کوئی بات بھی ایسی نہیں کہ بے پر کی اڑائی گئی ہو۔ ہر بات ثقہ و معقول۔ ان دنوں یار لوگوں نے تمہیں مجاہدِ آزادی یعنی سرکار کا باغی مشہور کر رکھا ہے۔ تم جیسے سرکار کے نمک حلال اور نجیب شخص کے بارے میں کیا افتراء باندھا ہے۔ ہم تم سدا سرکار کی دولت اور اقبال کو دعائیں دیتے رہے۔ چاہا کہ جب تک زمین ساکن اور آسمان دائر ہے، تب تک سرکار انگلشیہ کا عہدِ ... نی قائم و سلامت رہے۔ ان لوگوں نے خواہ مخواہ کا طومار باندھ رکھا ہے کہ تم آزادی خواہوں کے سرخیل تھے۔ ہے ہے، خدانکردہ تم ایسا کیوں ہونے لگے؟ تلنگوں اور نمک حراموں میں تم کیونکر شامل ہو سکتے ہو۔ تم ٹھہرے شریف و نجیب، معزز و معتبر، سرکار کے وظیفہ خوار، دربار میں کرسی نشیں، وائسرائے کے حاشیہ نشیں، حضور گورنر صاحب بہادر سے میل جول، ملاقات، بلکہ دوستی، بڑے بڑے افسرانِ سرکار سے تمہارا تعلق، بڑے بڑے حاکمانِ یورپ تمہارے خیر خواہ، اس پر یہ اتہام کہ تم آزادی خواہوں میں شامل تھے، سرکار برطانیہ کو یہاں سے چلتا کرنا چاہتے تھے۔ لاحول ولاقوۃ! لوگ بھی کیا کیا تہمتیں تراشتے ہیں۔ اپنے اعمال کی تہمتیں کم ہیں کہ کچھ ان کی بھی سہی۔ شکر کرو، ضیاء الدین سا مرد جری پیدا ہوا جس نے تمہارا دامن ان دھبوں سے دھویا اور تمہیں خلق اور خالق کے سامنے سرخرو کیا۔ حاکموں میں عزت بچی، ہم چشموں میں آبرو رہی، دوستوں میں وقار رہا، کم اصلوں اور اجلافوں میں حرمت پامال نہ ہوئی۔ اسے دعائیں دو کہ یہ تمہارا محسن ہے۔ تمہیں کتنی تہمتوں سے بچایا اور تمہاری عزت کو لوٹایا۔ خدا اس کی آبرو محفوظ رکھے۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم محققین کے نام سے کان کو ہاتھ لگاتے تھے۔ ایک صاحب محقق نے یہ مضمون باندھا کہ اردو میں دو بڑے ٹرباز ہیں، میر اور غالب۔ میر کے ساتھ نام آنے پر یک گونہ خوشی بھی ہوتی ہے، لیکن مرنے پیچھے ٹرباز کہلانا کون شریف آدمی برداشت کرے گا۔ اپنی آبرو جانے کا دکھ تو ہر کسی کو ہوتا ہے، سو مجھے بھی ہوا، مگر میر کی بے وقاری بھی

دیکھی نہ گئی۔ خدا کا شکر بجا لایا کہ یہ سب کچھ دیکھنے کو دنیا میں زندہ نہ رہا تھا۔ تب سے اب تک محقق کا لفظ سنتے ہی ہاتھوں میں رعشہ آ جاتا ہے۔ ضیاء الدین لاہوری طرح جدید کے محقق ہیں۔ کسی کی آبرو کو لاگو نہیں ہوتے، بلکہ کھوئی آبرو بحال کرنے کا سروسامان کرتے ہیں۔ خدا انہیں ہیتار رکھے۔ بتاتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی دلّی میں ہونے والی دارو گیر کے پُر آشوب دنوں کا تذکرہ بھی لکھے بیٹھے ہیں۔ خدا انہیں نظرِ بد سے بچائے......

ڈور بیں نگاہوں کی صفات کا حامل

ڈور اندیش سرسید اپنی پیشین گوئیوں کی روشنی میں

☆ حکام انگریزی کی عملداری کبھی نہیں جائے گی۔ اگر فرض کرو کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو بھی حکام انگریزی کے سوا کوئی عملداری ہندوستان میں نہ کر سکے گا۔ (سرکشی ضلع بجنور، ص ۳۶)

☆ وہ علوم...... جن کو اِس زمانہ میں یورپ کی تقلید سے لڑکیوں کی تعلیم میں لوگ داخل کرنا چاہتے ہیں، یورپ کی اور امریکہ کی حالتِ معاشرت کے خیال سے شاید وہ علوم لڑکیوں کو سکھانے ضرور ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹرز اور ٹیلی گراف ماسٹرز یا پارلیمنٹ کی ممبر ہو سکیں لیکن ہندوستان میں نہ وہ زمانہ ہے، نہ سینکڑوں برس بعد بھی آنے والا ہے۔

(مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز سرسید، ص ۳۸۴)

کتابیات

بلحاظ حروف تہجی

کتاب ہٰذا کے معامین میں درج ذیل کتب اور جرائد و رسائل کے حوالے شامل ہیں:

آخری مضامین (سرسید؍ مرتبہ محمد امام الدین گجراتی) رفاہ عام پریس لاہور (۱۸۹۸ء)

اردو کی علمی ترقی میں سرسید اور ان کے رفقا کا حصہ (ڈاکٹر اے ایچ کوثر) لائبریری پروموشن بیورو کراچی (۱۹۸۴ء)

ارشادات جناح (مترجمہ: مفتی غلام جعفر) ادبستان لاہور (طبع سوم)

ازالہ اوہام (مرزا غلام احمد قادیانی) مطبع ریاض ہند امرت سر (۱۸۹۱ء)

اسباب بغاوت ہند (مرتبہ: فوق کریمی) یونیورسٹی پبلشرز علی گڑھ (۱۹۵۸ء)

......ایضاً...... انجمن ترقی اردو ہند دہلی (۱۹۸۵ء)

......ایضاً...... تہذیب الاخلاق ٹرسٹ لاہور (۱۹۹۱ء)

اسباب سرکشی ہندوستان کا جواب مضمون (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۹ء)

انتخاب آل احمد سرور (مرتبہ: فقیر احمد فیصل) لاہور اکیڈمی لاہور (ب۔ت)

ایڈریس اور اسپیچیں متعلق ایم اے او کالج (مرتبہ: نواب محسن الملک) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۹۸ء)

باقیات شبلی (مرتبہ: مشتاق حسین) مجلس ترقی ادب لاہور (۱۹۶۵ء)

براہین احمدیہ (مرزا غلام احمد قادیانی) مطبوعہ لاہور (۱۹۷۰ء)

پاکستان کا معمار اول (صفدر سلیمی) ادارہ طلوع اسلام لاہور (۱۹۶۷ء)

پاکستان کی طرف (مشیر محمد دی فیروز پوری) مطبوعہ لاہور (۱۹۴۷ء)

تاریخ دارالعلوم دیوبند (سید محبوب رضوی) جید پریس دہلی (۱۹۷۷ء)

تاریخ و تحریک پاکستان: مجلہ علم و آگہی، گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی (۸۴-۱۹۸۳ء)

تحریک پاکستان کا ایک باب (پروفیسر محمد سرور) سندھ ساگر اکادمی لاہور (۱۹۹۹ء)

تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان (ڈاکٹر ایچ بی خان) الحمد اکادمی کراچی (۱۹۹۸ء)

تحفہ قیصریہ (مرزا غلام احمد قادیانی) مطبع ضیاء الاسلام قادیاں (۱۸۹۷ء)

تذکرہ اہل دہلی (مرتبہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۶۵ء)

تذکرہ سرسید (محمد امین زبیری) پبلشرز یونائیٹڈ لاہور (۱۹۶۱ء)

تذکرہ محسن (محمد امین زبیری) نیشنل بک ہاؤس لاہور (۱۹۸۷ء)

تذکرہ وقار (محمد امین زبیری) عزیزی پریس آگرہ (۱۹۳۸ء)

تصفیۃ العقائد (محمد قاسم نانوتوی) دارالاشاعت کراچی (۱۹۷۶ء)

تفسیر القرآن (سرسید احمد خاں) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (جلد اول: ۱۸۸۰ء)، (جلد چہارم: ۱۸۸۸ء)

ایضاً (جلد اول تا ششم) دوست ایسوسی ایٹس لاہور (۱۹۹۴ء)

ایضاً (جلد اول تا ہفتم) دوست ایسوسی ایٹس لاہور (۱۹۹۸ء)

تنقیدی تحریریں (کریم الدین احمد) آئینہ ادب لاہور (۱۹۸۳ء)

تہذیب الاخلاق (جلد چہارم) الہ دین والے کی قومی دکان، لاہور (ب-ت)

تہذیب و فن (احمد ندیم قاسمی) پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز لاہور

جناح گاندھی گفت و شنید (پیش کار: نواب زادہ لیاقت علی خاں) آل انڈیا مسلم لیگ دہلی (۱۹۴۴ء)

جوہر تقویم (ضیاء الدین لاہوری) الجمعیہ پبلی کیشنز لاہور (۲۰۰۴ء)

حیات النذیر (سید افتخار احمد بلگرامی) شمسی پریس دہلی (۱۹۱۳ء)

حیات جاوید (الطاف حسین حالی) نامی پریس کانپور (۱۹۰۱ء)

حیات محمد علی جناح (رئیس احمد جعفری) تاج آفس بمبئی (۱۹۳۹ء)

خطبات احمدیہ (سرسید احمد خاں) مسلم پرنٹنگ پریس لاہور (ب-ت)

خطبات جناح۔ اردو بستان لاہور (۱۹۳۶ء)

خطباتِ رشید احمد صدیقی (مرتبہ: مہر الٰہی ندیم / لطیف الزماں خاں) مکتبہ اقبال کراچی (۱۹۹۱ء)
خطباتِ سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (جلد دوم ۱۹۷۳ء)
خطباتِ عبدالحق (مرتبہ: ڈاکٹر عبادت بریلوی) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۵۲ء)
خطباتِ قائدِ اعظم (مرتبہ: رئیس احمد جعفری) شعاعِ ادب لاہور (۱۹۶۱ء)
خطوطِ سرسید (مرتبہ: سید راس مسعود) نظامی پریس بدایوں ((۱۹۲۴ء)
خود نوشت افکارِ سرسید (مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری) الجمعیہ پبلی کیشنز لاہور (۲۰۰۴ء)
خود نوشت حیاتِ سرسید (مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری) الجمعیہ پبلی کیشنز لاہور (۲۰۰۵ء)
... ایضاً ... فضلی سنز کراچی (۱۹۹۸ء)
ذکرِ شبلی (محمد امین زبیری) کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ (۱۹۳۶ء)
زندگی کی گزرگاہوں میں (ملک نصر اللہ خاں عزیز) تسنیم پبلی کیشنز لاہور (۱۹۹۴ء)
روئدادِ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اجلاس نہم) مطبع مفید عام آگرہ (۱۸۹۵ء)
ریویو ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر (سرسید احمد خاں) ہنری ایس کنگ لندن (۱۸۷۲ء)
سرسید احمد خاں۔ ایک سیاسی مطالعہ (عتیق صدیقی) مکتبہ جامعہ نئی دہلی (۱۹۷۷ء)
سرسید احمد خاں۔ حالات و افکار (مولوی عبدالحق) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۷۵ء)
سرسید احمد خاں (عبدالسلام خورشید) قومی کتب خانہ لاہور (۱۹۶۳ء)
سرسید احمد خاں اور جدت پسندی (ڈاکٹر محمد علی صدیقی) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (۲۰۰۳ء)
سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک کے ناقدین کا تحقیقی جائزہ (ڈاکٹر سید محبوب شاہ) سرسید یونیورسٹی پریس
کراچی (۲۰۰۰ء)
سرسید پر ایک نظر (صلاح الدین احمد) اکادمی پنجاب لاہور (۱۹۶۰ء)
سرسید شناسی (مرتبہ: طاہر تونسوی) الفیصل لاہور (۲۰۰۲ء)
سرسید علیہ الرحمہ (مرتبہ: جلیل قدوائی) راس مسعود سوسائٹی کراچی (۱۹۸۵ء)
سرسید کا علمی کارنامہ (قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی) اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی (۱۹۶۴ء)
سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ (ڈاکٹر قدسیہ خاتون) کتابستان الٰہ آباد (۱۹۸۱ء)
سرسید کی صحافت (ڈاکٹر اصغر عباس) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۳ء)

سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے (خلیق احمد نظامی) انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی (۱۹۹۳ء)
سرسید کے سیاسی افکار (ڈاکٹر فوق کریمی) ایشیا بک سنٹر لاہور (۱۹۹۰ء)
سرکشی ضلع بجنور (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس آگرہ (۱۸۵۸ء)
ایضاً (مرتبہ: ڈاکٹر سید معین الحق) سلمان اکیڈمی کراچی (۱۹۶۱ء)
سفر نامہ پنجاب (مرتبہ: سید اقبال علی) انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ (۱۸۸۴ء)
شبلی ادیبوں کی نظر میں (محمد واصل عثمانی) صفیہ اکیڈمی کراچی (۱۹۶۸ء)
طیف نثر (ڈاکٹر سید عبداللہ / مرتبہ: ممتاز منگلوری) نذر سنز لاہور (۱۹۶۳ء)
عزیزان علی گڑھ (رشید احمد صدیقی) بیکن بکس ملتان (۱۹۹۰ء)
قائد اعظم کا تصور پاکستان (غلام احمد پرویز) ادارہ طلوع اسلام لاہور (ب۔ت)
کلیات نثر حالی (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (جلد دوم: ۱۹۶۸ء)
گفتگو (مرتبہ: مظہر جمیل) مکتبہ دانیال کراچی (۱۹۸۶ء)
لائل محمڈنز آف انڈیا (سرسید احمد خاں) مفصلائٹ پریس میرٹھ
(جلد اول: ۱۸۶۰ء) (جلد دوم: ۱۸۶۰) (جلد سوم: ۱۸۶۱ء)
لکچروں کا مجموعہ (ڈپٹی نذیر احمد / مرتبہ: مولوی بشیر الدین احمد) مفید عام اسٹیم پریس آگرہ
جلد اول / جلد دوم (۱۹۱۸ء)
مجموعہ لکچرز و اسپیچز (نواب محسن الملک) نول کشور پرنٹنگ ورکس پریس لاہور (۱۹۰۴ء)
مسلم لیگ کیوں؟ (ذاکر حسین فاروقی) مکتبہ سلطانی بمبئی (۱۹۴۷ء)
مطالعہ سرسید احمد خاں (عبدالحق و دیگر) الرائیں ٹریڈرز لاہور (ب۔ت)
مقالات حالی (جلد اول) انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی (۱۹۵۵ء)
ایضاً (جلد دوم) مطبوعہ دہلی (۱۹۳۶ء)
مقالات سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور: جلد اول / ہفتم / ہشتم (۱۹۶۲ء)
مقالات شبلی (جلد چہارم) مطبع معارف اعظم گڑھ (۱۹۳۱ء)
مقالات قومی سرسید سمینار (مرتبہ: ریاض الرحمن شروانی) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ (۲۰۰۰ء)
مقالات یوم شبلی (خان عبیداللہ خاں) اردو مرکز لاہور (۱۹۶۱ء)

مکاتیب سرسید احمد خاں (مرتبہ: مشتاق حسین) یونین پرنٹنگ پریس دہلی (۱۹۶۰ء)

مکتوبات سرسید (مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی) مجلس ترقی ادب لاہور (جلد اول: ۱۹۸۵ء)

مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز (سرسید، مرتبہ: محمد امام الدین گجراتی) مصطفائی پریس لاہور (۱۹۰۰ء)

موازنہ انیس و دبیر (شبلی نعمانی) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ (۱۹۹۲ء)

موج کوثر (شیخ محمد اکرام) مرکنٹائل پریس لاہور (۱۹۴۰ء)

ایضاً ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور (۱۹۷۹ء)

مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں (عبداللطیف اعظمی) شبلی اکادمی دہلی (۱۹۹۵ء)

میرے پچاس سال علی گڑھ میں (میر ولایت حسین) اور یئنٹ پبلشرز لاہور (۱۹۷۳ء)

نصرت الابرار (مرتبہ: مولوی محمد لدھیانوی) مطبع صحافی لاہور (۱۸۸۸ء)

ہماری آزادی کی کہانی (عشرت رحمانی) مکتبہ معین الادب لاہور (۱۹۵۸ء)

ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج (ڈاکٹر رفیق زکریا) ترقی اردو بیورو نئی دہلی (۱۹۸۵ء)

یادنامہ داؤدی (مرتبین: تحسین فراقی، جعفر بلوچ) دارالتذکیر لاہور (۲۰۰۳ء)

۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ (عشرت رحمانی) مکتبہ معین الادب لاہور (۱۹۵۸ء)

۱۸۵۷ء کے مسلمان مجاہد (عشرت رحمانی) مکتبہ معین الادب لاہور (۱۹۵۸ء)

۵۷ء کے ہیرو (سیدہ انیس فاطمہ بریلوی) اقبال بک ڈپو کراچی (۱۹۵۶ء)

Books in English

Reviews on Syed Ahmad Khan's Life and Work (Theodore Back) Aligarh Institute press. Aligarh. (1886)

The Life and Work of Sir Syed Ahmed Khan (G.F.I. Graham) Hedder & Stoughton. London.(1909)

The Present State of Indian Politics (Sir Syed Ahmad Khan): (Ed:Theodore Beck) Pioneers Press. Allahabad (1888)

Writings and Speeches of Sir Syed Ahmed Khan (Ed. Shan Muhammad) Na-Chiketa Publications. Bombay(1972)

جرائد و رسائل اور اخبارات

الحق اکوڑہ خٹک
الشریعہ گوجرانوالہ
امروز لاہور
اوصاف اسلام آباد
بازیافت لاہور
برگ گل کراچی
برہان دہلی
پاکستان لاہور
تہذیب کراچی
تہذیب الاخلاق علی گڑھ
تہذیب الاخلاق لاہور
ثقافت لاہور
جامعہ دہلی
جنگ لاہور
خبریں لاہور
خیال لاہور

دارالعلوم دیوبند
دن لاہور
ساحل کراچی
سیارہ لاہور
فکر و نظر علی گڑھ
کانفرنس گزٹ علی گڑھ
کریسنٹ لاہور
کنزالایمان لاہور
مشرق لاہور
منزل فیصل آباد
نقطہ نظر اسلام آباد
نقیب ختم نبوت ملتان
نقوش لاہور
نگار کراچی
نوائے وقت لاہور